ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

مرتبہ
سعید احمد اکبر آبادی

جلد ۷۴ || ماہ محرم الحرام ۱۳۹۵ھ مطابق جنوری ۱۹۷۵ء || شمارہ ۱

فہرست مضامین

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت - اسلام کا اقتصادی نظام - قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ -
تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام - سوشلزم کی بنیادی حقیقت -

۱۹۴۰ء غلامانِ اسلام - اخلاق و فلسفۂ اخلاق - فہمِ قرآن - تاریخِ ملت حصہ اول نبی عربی صلعم - صراطِ مستقیم (انگریزی)

۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول - وحی الٰہی - جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول -

۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم - اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات)
مسلمانوں کا عروج و زوال - تاریخِ ملت حصہ دوم خلافتِ راشدہ -

۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد اول - اسلام کا نظامِ حکومت - [illegible] - تاریخِ ملت حصہ سوم خلافتِ بنی امیہ

۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم - لغات القرآن جلد دوم - مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت (کامل)

۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم - قرآن اور تصوف - اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے)

۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اول - خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ - جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو -

۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظمِ مملکت - مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) - لغات القرآن جلد سوم - حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ -

۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم - تاریخِ ملت حصہ چہارم خلافتِ ہسپانیہ - تاریخِ ملت حصہ پنجم خلافتِ عباسیہ اول

۱۹۴۹ء قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات - حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے (کامل)
تاریخِ ملت حصہ ششم خلافتِ عباسیہ دوم - بصائر -

۱۹۵۰ء تاریخِ ملت حصہ ہفتم تاریخِ مصر و مغربِ اقصیٰ - تدوینِ قرآن - اسلام کا نظامِ مساجد -
اشاعتِ اسلام یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا -

۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم - عرب اور اسلام - تاریخِ ملت حصہ ہشتم خلافتِ عثمانیہ - [illegible]

۱۹۵۲ء تاریخِ اسلام پر ایک طائرانہ نظر - فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اول (جس کو
ازسرِنو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے) - کتابتِ حدیث -

۱۹۵۳ء تاریخِ مشائخِ چشت - قرآن اور تعمیرِ سیرت - مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ -

کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے، چناں چہ جب یہ مقالہ پڑھا گیا ہے تو ہال مردوں اور خواتین سے بھرا ہوا تھا اور جب یہ ختم ہوا تو پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ اس بنا پر "عہد نبوی میں غزوات" کی چھٹی قسط کو روک کر یہ مقالہ برہان کی اسی اشاعت میں ندر قارئین کرام کیا جا رہا ہے۔

حیدرآباد سے واپس پہونچتے ہی مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی اور جناب نور الدین صاحب بیرسٹر کے حادثۂ وفات کی خبر اچانک سُنی تو جی دھک سے ہو کر رہ گیا اور قلب و دماغ پر گویا بجلی گر پڑی، شاہ صاحب ندوۃ العلماء کے گل سر سبد، نہایت پختہ قلم مصنف، تاریخ اسلام کے وسیع النظر محقق، اردو زبان کے ادیب اور سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے صحیح جانشین اور ان کے قائم مقام تھے، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تقسیم ہند کے بعد سے اب تک انہوں نے دار المصنفین کے علمی وقار اور مرتبہ کو قائم و برقرار رکھا اور سنک کے نہایت سخت طوفانی دور میں بھی اس باغیچۂ علم و ادب کی جس طرح حفاظت اور دل و جان سے اس کی آبیاری کی وہ ان کی قبائے فضل کا تکمۂ زریں ہے علم و فضل اور تحقیق و تصنیف کے علاوہ اخلاق و عادات اور کردار و عمل کے اعتبار سے بھی وہ سلف صالحین کا نمونہ تھے، نہایت مخلص، بے لوث، عابد و زاہد، خندہ جبیں، شگفتہ طبع، ملنسار اور متواضع اور مرنجان مرنج، مؤخر الذکر ہندوستان کے نامی گرامی بیرسٹر تھے، سپریم کورٹ کے ممتاز قانون دانوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ قومی اور ملی کاموں میں پیش پیش رہتے تھے۔ طبیعت قلندرانہ پائی تھی۔ ایک برس دلی کے میئر (MAYOR) اور اس حیثیت سے بہت کامیاب رہے تھے، دوسرے برس انہوں نے میئر ہونے سے انکار کر دیا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی وائس چانسلر شپ کئی مرتبہ پیش کی گئی لیکن انہوں نے قبول نہیں کی، وہ اگر چاہتے تو مرکزی کابینہ میں شمولیت اور کسی ملک کی سفارت کا حصول ان کے لیے معمولی بات تھی، لیکن کبھی ان چیزوں کی طرف انہوں نے آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا، بیرسٹر بہت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

حکومت ہند نے اقبال صدی تقریبات منعقد کرنے کا جو وسیع اور مہتم بالشان پروگرام بنایا ہے اس کا آغاز حیدرآباد سے "فکر اقبال" پر ایک سیمینار سے ہوا، جو ۱۴ اور ۱۵ دسمبر کو باغ عامہ کے جوبلی ہال میں انعقاد پذیر ہوا۔ اس کا افتتاح مرکزی وزیر منصوبہ بندی جناب ڈی۔پی۔ ڈھر نے اپنے خطبہ سے کیا جو نہایت شگفتہ اور ادبی زبان اردو میں تھا۔ صدارت جناب این نروتم ریڈی وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی نے کی اور خطبۂ استقبالیہ وزیر محکمہ جنگلات حکومت آندھرا پردیش جناب محمد ابراہیم علی انصاری نے پڑھا جناب ڈی۔پی۔ ڈھر نے اپنے خطبہ میں کہا کہ اُن کے فکر کی تعمیر میں مہاتما گاندھی اور ڈاکٹر ٹیگور کے علاوہ ڈاکٹر اقبال کا بھی بڑا دخل ہے اور یہ بھی بتایا کہ ۱۹۷۵ء میں اقبال صدی کی تقریبات کشمیر میں ہوں گی اس کے بعد ۱۹۷۷ء میں یہ تقریبات نئی دہلی میں بین الاقوامی پیمانہ پر ہوں گی، اس سلسلہ میں موصوف نے پاکستان اور افغانستان کا نام خاص طور پر لیا کہ ان ملکوں کے نمائندہ حضرات اس میں شریک ہوں گے۔

سمینار میں ایک درجن کے قریب، اکثر اردو میں اور بعض انگریزی میں مقالات میں پڑھے گئے جو مسلمان، ہندو اور سکھ ارباب علم و ادب کے لکھے ہوئے تھے، راقم الحروف نے "علامہ اقبال کا نظریہ اجتہاد" پر مقالہ پڑھا۔ یہ عنوان خود اقبال صدی تقریبات کمیٹی کا تجویز کردہ تھا، اقبال کے نظریۂ اجتہاد سے متعلق بعض لوگوں نے بڑی غلط سلط باتیں لکھی ہیں جس کا شکوہ خود نذیر نیازی صاحب نے اقبال کے انگریزی خطبات کے اردو ترجمہ میں خطبہ ششم کے ضمن میں کیا ہے، علاوہ ازیں یہ موضوع یوں بھی آج کل بہت اہم اور وقت

علامہ اقبالؒ کا نظریہ اجتہاد

سعید احمد اکبر آبادی

علامہ اقبالؒ مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص زمانہ حال کے JURISPRUDENCE (اصول قانون) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرانیہ کی ہدایت کو ثابت کرے گا وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا۔ قریباً تمام ممالک میں اس وقت مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں یا قوانین اسلامیہ پر غور و فکر کر رہے ہیں۔ غرض یہ وقت عملی کام کا ہے، کیوں کہ میری ناقص رائے میں مذہب اسلام اس وقت گویا زمانہ کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔" (اقبال نامہ، جلد اول ص ۵۰)

اس اقتباس سے اندازہ ہوگا کہ علامہ کو تدوینِ فقہ جدید کی ضرورت و اہمیت کا احساس کس شدت سے تھا، سوال یہ ہے کہ یہ احساس کیوں تھا؟ اس کے جواب میں خود فرماتے ہیں:۔

"چوں کہ ذات الٰہیہ ہی فی الحقیقت روحانی اساس ہے زندگی کی۔ لہذا اللہ کی اطاعت فطرت صحیحہ کی اطاعت ہے، اسلام کے نزدیک حیات کی یہ روحانی اساس

اونچے درجے کے تھے، وہ بہت آسانی سے کروڑ پتی بن سکتے تھے، لیکن عمر بھر کرایہ کے مکان میں رہے، اور یوں بھی بہت سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے، اکثر کہتے تھے، "میں صرف اتنا کماتا ہوں، جس کی مجھے ضرورت ہوتی ہے، اس سے زیادہ کا غم میں نے کبھی نہیں پالا۔"

نہایت حق گو، جری اور بیباک تھے۔ صوم وصلوٰۃ اور تلاوت قرآن کے سختی سے پابند تھے، حج بھی کر آئے تھے، اس میں شبہ نہیں کہ ان دونوں بزرگوں کی وفات ایک عظیم قومی وملّی حادثہ ہے جس کی تلافی آسان نہیں ہے، لیکن شاہ صاحب اور نصرالدین صاحب دونوں ہمارے اُن نہایت عزیز اور مخلص دوستوں میں سے تھے جن کی معیت لطفِ حیات کا باعث ہوتی اور جدائی زندگی کو بے کیف و بے مزہ بنا دیتی ہے، اسی وجہ سے یہ دونوں دوست چلے گئے مگر ہمارا عالم جگرؔ کے الفاظ میں اب تک یہ ہے:۔

اب بھی ہے تیرے تصور سے وہی راز و نیاز
اپنی بچھڑی ہوئی آغوشِ محبت کی قسم

اللّٰھم ارحمھما واغفر لھما مغفرۃً عامۃ، شاملۃ، کاملۃ۔

قارئین کرام کو معلوم ہے کہ حالات سے مجبور ہو کر برہان کے صفحات کی تعداد کم کی گئی تھی، لیکن اس سے اور چند مشکلات پیدا ہو گئیں، مضامین میں قطع و برید کرنی پڑی اور تبصرے ناغہ ہونے لگے، اس بناء پر اب فیصلہ یہ کیا گیا ہے کہ برہان کے صفحات ۵۶ کے بجائے ۶۴ کر دیئے جائیں اور زرِ چندہ پندرہ روپیہ سالانہ کر دیا جائے، چناں چہ اس مہینے سے اس پر عمل شروع کر دیا گیا ہے، امید ہے کہ برہان کے قدر دان حضرات اس فیصلہ کو پسند کریں گے۔

اختتام تک نہیں پہونچا سکے۔ اس سلسلہ میں تھوڑا بہت جو کچھ لکھا تھا وہ یادداشتوں (NOTES) کی شکل میں تھا، ان کے ایک حصہ کا عکس اقبال اکاڈمی کراچی کے شکریہ کیساتھ چراغ راہ کراچی کے اسلامی قانون نمبر کی جلد اوّل کے شروع میں شایع کردیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ تدوینِ فقہ جدید کی عمارت اس وقت تک کھڑی نہیں ہوسکتی جب تک کہ پہلے اجتہاد کی اہمیت وضرورت اور اس کی اصل حقیقت کو ذہن نشین نہ کرلیا جائے علامہ اقبال فرماتے ہیں:۔

"سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کی ہیئتِ ترکیبی میں وہ کون سا عنصر ہے جو اس کے اندر حرکت اور تغیّر کو قایم رکھتا ہے۔ اس کا جواب ہے اجتہاد!

(تشکیل ص ۲۲۸)

اب آیئے دیکھیں کہ اجتہاد کے متعلق علامہ اقبال کا نقطۂ نظر (APPROACH) کیا ہے، اس کی تعریف کیا ہے اور وہ اس کے لئے طکنک یا طریقہ کار (METHOD) کیا تجویز کرتے ہیں۔

اجتہاد کے متعلق نقطۂ نظر

باخبر اصحاب کو معلوم ہے کہ انیسویں صدی کے آخر میں مغربی تہذیب وتمدن جو اپنے ساتھ علوم وفنونِ جدیدہ کا ایک عظیم کارواں رکھتا تھا اس کے فروغ، مغربی اقوام کے سیاسی استیلاء اور سائنس اور ٹکنالوجی کی غیر معمولی ترقی کے دوررس اور گہرے اثرات جب ایشیا اور اقوام مشرق پر پڑنے شروع ہوئے تو ترکی میں شیخ الاسلام اور مصر کے علماء جامعہ ازہر کے جمود فکر اور حالات زمانہ سے بے توجہی اور بے حسی کے باعث ترکی اور مصر میں چند انقلاب پسند نوجوانوں کی سرکردگی میں آزادی، مساوات اور جمہوریت کے نام سے ایسی تحریکیں پیدا ہوئیں جن کے دستور اور لائحہ عمل میں نہ صرف یہ کہ مذہب کو کوئی مقام حاصل نہیں تھا بلکہ بہت سے بنیادی امور میں وہ اسلام کے مخالف تھیں، ترکی میں PAN TURKISM

ایک قایم ودائم وجود ہے جسے ہم اختلاف اور تغیر میں جلوہ گر دیکھ سکتے ہیں۔ اب اگر کوئی معاشرہ حقیقت مطلقہ کے اس تصور پر مبنی ہے تو پھر یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ثبات اور تغیر دونوں خصوصیات کا لحاظ رکھے، اس کے پاس کچھ تو اس قسم کے دوامی اصول ہونے چاہئیں جو حیات اجتماعیہ میں نظم و انضباط قایم رکھیں، کیوں کہ مسلسل تغیر کی اس بدلتی ہوئی دنیا میں ہم اپنا قدم مضبوطی سے جما سکتے ہیں تو دوامی اصول کی ہی بدولت، لیکن دوامی اصولوں کا یہ مطلب تو ہے ہی نہیں کہ اس سے تغیر اور تبدیلی کے جملہ امکانات کی نفی ہو جائے، کیوں کہ تغیر وہ حقیقت ہے جسے قرآن پاک نے اللہ کی ایک بڑی آیت قرار دیا ہے، اس صورت میں تو ہم اس شئے کو جس کی فطرت ہی حرکت ہے، حرکت سے عاری کر دیں گے، اسی کا نتیجہ ہے کہ گذشتہ پانچ سو برس سے عالم اسلام پر جمود طاری ہے۔"

(تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ص ۲۲۸)

اس اہم منصوبہ کی تکمیل بلند پایہ اور وسیع النظر علماء کے ہاتھوں ہی ہو سکتی تھی اسی بناء پر علامہ نے ایک طرف مولانا سید سلیمان ندوی کو اس طرف متوجہ کیا جیسا کہ اقبال نامہ میں درج ان کے نام کے خطوط سے ظاہر ہے، دوسری جانب ۱۹۲۶ء میں جب مولانا محمد انور شاہ کشمیری دارالعلوم دیوبند کی صدارت تدریس سے مستعفی ہو گئے تو علامہ نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر مولانا کو لاہور بلانے کی کوشش کی تاکہ وہ اور مولانا دونوں مل جل کر تدوین فقہ جدید کا کام کریں (حیات انور مرتبہ سید ازہر شاہ قیصر کشمیری میں راقم الحروف کا مضمون) لیکن جب کہیں سے صدائے برنخاست کے باعث انہیں طبقۂ علماء کی طرف سے مایوسی ہو گئی تو انہوں نے اس موضوع پر انگریزی زبان میں خود ایک کتاب تصنیف کرنے کا ارادہ کر لیا، لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ان کی صحت خراب رہنے لگی اور کچھ اور مصروفیتیں بھی بڑھ گئی تھیں۔ اسی بناء پر وہ اس ارادہ کو

عرب نازد اگر ترکِ عرب کن　　　برنگ احمر و خون ورگ و پوست

اب نثر ملاحظہ کیجئے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"اس زمانے میں سب سے بڑا دشمنِ اسلام اسلامیوں کا نسلی امتیاز و ملکی قومیت کا خیال ہے، پندرہ برس ہوئے جب میں نے پہلے پہل اس کا احساس کیا۔ اس وقت میں یورپ میں تھا اور اس احساس نے میرے خیالات میں انقلابِ عظیم پیدا کر دیا، حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی آب و ہوا نے مجھے مسلمان کر دیا"

(انوار اقبال ص ۱۷۶)

ایک زمانے میں انہوں نے مولانا حسین احمد مدنی کی نسبت جو رباعی کہی تھی جس پر مولانا کی طرف سے وضاحت کے بعد انہوں نے اپنی معذرت بھی شایع کر دی تھی (انوار ص ۱۷۰) درحقیقت اس کا مبنی بھی علامہ کا یہی نظریہ تھا۔

اس بناء پر ظاہر ہے ترکی اور مصر میں ترک قومیت اور عرب قومیت کے زیر اثر اصلاح وتجدید کی جو تحریکیں پیدا ہو رہی تھیں اور جو اسلامی قوانین وضوابط میں بے جھجک قطع وبرید اور ترمیم و تنسیخ کی داعی تھیں علامہ انہیں کس طرح بنظر استحسان دیکھ سکتے اور انہیں اجتہاد کا نام دے سکتے تھے، علامہ کے خیال میں ان تحریکوں کا سرچشمہ اجتہاد نہیں تھا بلکہ وہ آزاد خیالی تھی جس میں تجدد کے دستِ شوق نے قدیم سے بالکل صرفِ نظر کر لی اور اس کی جڑیں کاٹ دی تھیں، اس آزاد خیالی کی انہوں نے ہر موقع پر کھل کر مذمت کی اور مسلمانوں کے حق میں اسے زہرِ ہلاہل قرار دیا ہے کہتے ہیں :۔

آزادیٔ افکار سے ہے ان کی تباہی　　　رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا طریقہ

ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار　　　انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

اس کے برعکس علامہ کے نہایت مقرب اور تربیت یافتہ نذیر نیازی لکھتے ہیں :۔

"اجتہاد سے مقصود ہے زندگی کو قرآن وسنت کے سانچے میں ڈھالنا حضرت علامہ کا موقف

اور عرب ممالک میں عرب قومیت کے تصورات نے ان اسلام دشمن عناصر کو اور زیادہ قوت دی، چناں چہ اس زمانہ میں ترکی اور مصر و شام میں جو وسیع لٹریچر شائع ہوا ہے، اس کے مطالعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ تحریکیں کھلم کھلا اسلام سے بغاوت کے مترادف تھیں اور ان کا مقصد ماضی سے یک قلم اپنا رشتہ منقطع کر کے مغربی طرز کی قومیت پر اپنے لیے ایک جدید عمارت تعمیر کر لینا تھا۔ مصر و شام میں اگرچہ ان تحریکوں کو سیاسی طور پر بڑی کامیابی نہیں ہوئی لیکن ترکی میں یہی تحریک تھی جو کمال اتاترک کی حکومت کے روپ میں منتہائے عروج کو پہونچی اور سیاسی اعتبار سے بہمہ وجوہ کامیاب ہوئی۔

علامہ اقبال جمود اور قدامت پرستی کے سخت مخالف اور حرکت اور شاہین وعقاب کی خوئے شکار افگنی کے اس درجہ مداح تھے کہ انہیں مسولینی اور ہٹلر کی ثنا خوانی میں بھی دریغ نہیں ہوا، لیکن اس کے باوجود اقبال اور اقبالیات کا ہر طالب علم جانتا ہے وہ فرنگی سیاست اور اس کے دو زائیدہ بُت قومیت اور وطنیت کے شدید مخالف اور نقاد تھے، ان کا کلام منثور و منظوم اس سے بھرا پڑا ہے، چنانچہ خود فرماتے ہیں:-

"میں نے اپنی عمر کا نصف حصہ اسلامی قومیت اور ملت کے اسلامی نقطہ نظر کی تشریح و توضیح میں گذارا ہے محض اس وجہ سے مجھ کو ایشیا کے لیے اور خصوصاً اسلام کے لیے فرنگی سیاست کا یہ نظریہ ایک خطرہ عظیم محسوس ہوتا تھا۔" (انوار اقبال۔ بشیر احمد ڈار ص ۱۶۸)

یہاں مثال کے طور پر اس سلسلہ میں نظم اور نثر کے دو نمونے پیش خدمت ہیں ایک رباعی میں کہتے ہیں:-

تو اے کودک منش خود را ادب کن مسلمان زادۂ، ترکِ نسب کن

پر ہے پھر حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث سے اس کا مطلب اور بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ متعین ہو جاتا ہے، یہ وہی حدیث ہے جو عام طور پر "حدیث معاذ" کے نام سے مشہور ہے۔

اجتہاد کی قسمیں تدوین فقہ اور مذاہب اربعہ کے قیام کی تاریخ پر ایک نظر ڈالنے کے بعد علامہ فرماتے ہیں: "ان مذاہب کے نزدیک اجتہاد کے تین درجہ ہیں، (۱) تشریح یا قانون سازی میں مکمل آزادی لیکن جس سے عملاً صرف موسسین مذہب ہی نے فائدہ اٹھایا (ب) محدود آزادی جو کسی مخصوص مذہبِ فقہ کے حدود کے اندر ہی استعمال کی جا سکتی ہے (ج) اور وہ مخصوص آزادی جس کا تعلق کسی ایسے مسئلہ میں جس کو موسسین مذہب نے جوں کا توں چھوڑ دیا ہو قانون کے اطلاق سے ہے مگر ہم اس خطبہ میں اپنا دائرۂ بحث اجتہاد کی پہلی قسم یعنی قانون سازی میں کامل آزادی تک محدود رکھیں گے، واضح رہنا چاہیے کہ علامہ نے یہاں اجتہاد کی جو پہلی قسم بیان کی ہے، اصول فقہ کی اصطلاح میں اسے اجتہاد مطلق کہتے ہیں اور یہی اس خطبہ کا موضوعِ بحث ہے۔

احکام اسلام کے مآخذ کامل آزادی کے الفاظ سے کسی شخص کو دھوکا نہیں ہونا چاہیے کیونکہ جمہور امت کی طرح علامہ کے نزدیک بھی اسلامی قانون کے مآخذ چار چیزیں ہیں یعنی قرآن، سنّت، اجماع اور قیاس۔

قرآن مجید قرآن مجید کی تعلیمات کی اسپرٹ اور روح پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔ "جب ہم ان اصولوں کا جائزہ لیتے ہیں جن پر قرآن مجید نے قانون کی بنا اٹھائی ہے تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان سے نہ تو فکر انسانی پر کوئی روک ٹوک قایم ہوتی ہے نہ وضع آئین و قوانین پر چناں چہ یہی اصول تھے جو فقہائے متقدمین کے پیش نظر تھے اور جن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے متعدد نظامات قایم کئے جن حضرات نے تاریخ اسلام کا مطالعہ کیا ہے، خوب جانتے ہیں کہ اسلام نے بہ لحاظ ایک نظام مدنیت و

بہرحال اس مسئلہ میں یہی تھا۔" (تشکیل ص اف)، اس معاملہ میں ان کے حزم و یقین اور خلوص کا یہ عالم تھا کہ ایک خط میں کمال جوش سے لکھتے ہیں:۔

"جن لوگوں کے عقائد و سُنّت کا ماخذ کتاب وسُنّت ہے اقبال ان کے قدموں میں ٹوپی کیا سر رکھنے کو تیار ہے اور ان کے ایک لحظہ کی صحبت کو دنیا کی تمام عزت و آبرو پر ترجیح دیتا ہے۔" (انوار اقبال ص ۱۸۶)

انہیں اسی پر اصرار ہے کہ کوئی نظریہ کیسا ہی پُر فریب اور خوشنما ہو بہرحال مسلمانوں کا فرض ہے کہ اُسے قبول کرنے سے پہلے یہ دیکھ لیں کہ وہ اسلام کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے کہ نہیں۔" (انوار اقبال ص ۱۶۷)

اب جب کہ اجتہاد سے متعلق علامہ کا نقطۂ نظر متعین ہو گیا ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ اجتہاد کی تعریف اور اس کی ٹکنک کیا ہے؟ اگرچہ متفرق طور پر اجتہاد سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار علامہ نے اپنے کلام منثور و منظوم میں مختلف مواقع پر کیا ہے لیکن انہیں جو کچھ کہنا تھا اس کو یکجائی طور پر اپنے خطبہ میں جمع کر دیا ہے جو "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" میں چھٹا خطبہ ہے جیساکہ نذیر نیازی صاحب نے مقدمہ میں لکھا ہے۔ اس خطبہ کا اصل عنوان تھا "اسلام کی ترکیب میں حرکت کا اصول"۔ لیکن جب خطبات کے اردو ترجمہ کی بات ہوئی تو اس کا عنوان "الاجتہاد فی الاسلام" کر دیا گیا لیکن خطبات کے اصل انگریزی ایڈیشن میں اصل عنوان یعنی THE PRINCIPLE OF MOVEMENT IN THE STRUCTURE OF ISLAM کو قائم رکھا گیا ہے۔ اب جو کچھ عرض کیا جائے گا اس خطبہ کی روشنی میں ہو گا۔

اجتہاد کی تعریف

اجتہاد کی تعریف کیا ہے؟ فرماتے ہیں: لغوی اعتبار سے اجتہاد کے معنی ہیں کوشش کرنا، لیکن فقہ اسلامی کی اصطلاح میں اس کا مطلب ہے وہ کوشش جو کسی قانونی مسئلہ میں آزادانہ رائے قائم کرنے کے لیے کی جائے، اور جس کی بنا جیساکہ میں سمجھتا ہوں قرآن مجید کی اس آیت الذین جاھدوا فینا لنھدینھم سُبُلنا

گہری نظر سے اور ان کا استعمال ہم یہ سمجھتے ہوئے کریں کہ وہ کیا روح تھی جس کے ماتحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احکام قرآنی کی تعبیر فرمائی تو اس سے ان قوانین کی حیاتی قدر وقیمت کے فہم میں اور بھی آسانی ہوگی جو قرآن پاک کے قانون کے متعلق قایم کئے ہیں۔" (تشکیل ص ۲۶۷)

اجماع

فرماتے ہیں: " فقہ اسلامی کا تیسرا ماخذ اجماع ہے اور میرے نزدیک اسلام کے قانونی تصورات میں سب سے زیادہ اہم لیکن عجیب بات ہے کہ صدر اسلام میں اس نہایت ہی اہم تصور پر نظری اعتبار سے خوب خوب بحثیں ہوتی رہیں لیکن عملاً اس کی حیثیت کبھی ایک خیال سے آگے نہیں بڑھی، ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ممالک اسلامیہ میں یہ تصور ایک ادارہ کی صورت اختیار کر لیتا۔ شاید اس لیے کہ خلافت راشدہ کے بعد جب اسلام میں مطلق العنان حکومت نے سر اٹھایا تو یہ بات اس کے مفاد کے خلاف تھی کہ اجماع کو ایک مستقل تشریعی ادارہ کی شکل دی جائے۔ اموی اور عباسی خلفاء کا فائدہ اسی میں تھا کہ اجتہاد کا حق بحیثیت افراد مجتہدین کے ہاتھ میں ہی رہے بجائے اس کے کہ اجتہاد کے لیے ایک مستقل مجلس قایم ہو جو بہت ممکن ہے انجام کار حکومت سے بھی زیادہ طاقت حاصل کر لیں" آگے چل کر فرماتے ہیں:۔ " لیکن اس سلسلہ میں دو سوال جواب طلب ہیں: ایک تو یہ کہ کیا اجماع قرآن مجید کا بھی ناسخ ہے؟ ایک اسلامی مجلس میں تو یہ سوال اٹھانا ہی غیر ضروری ہے لیکن ہم یہ سوال اٹھا رہے ہیں تو محض اس غلط بیانی کے پیش نظر جو ایک مغربی نقاد AGAMIDES نے اپنی تصنیف " اسلامی نظریہ ہائے مالیات " میں کی ہے جسے کولمبیا یونیورسٹی نے شایع کیا ہے۔ اس کتاب کے مصنّف نے کوئی سند پیش کئے بغیر یہ لکھدیا ہے کہ احناف اور معتزلہ کے نزدیک اجماع قرآن مجید کا بھی ناسخ ہے، حالاں کہ اسلامی فقہ میں اس قسم کی غلط بیانی کی تائید میں کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ مثال بھی نہیں پیش کی جا سکتی اور نہ احادیث میں اس قسم کا کوئی اشارہ ملتا ہے۔" پھر فرماتے ہیں:۔ " میرے خیال میں مصنّف کو جو غلط فہمی ہوئی وہ لفظ "نسخ" سے ہوئی جسے فقہائے متقدمین نے استعمال تو کیا ہے مگر جس کا مطلب جیسا کہ شاطبی نے

سیاست جو کامیابی حاصل کی ہے اس کا تقریباً نصف حصہ ہمارے فقہاء کی قانونی ذہانت و فطان
کا مرہونِ احسان ہے لیکن موجودہ زمانے میں اجتہاد کے لیے قرآن مجید سے کیا مدد مل سکتی ہے
اس کے جواب میں عبارت مذکورہ بالا کے بعد ہی فوراً علامہ فرماتے ہیں:۔

"لیکن اس ساری جامعیت اور ہمہ گیری کے باوجود ہمارے نظاماتِ فقہ بالآخر افراد کی
ہی ذاتی تعبیرات کا نتیجہ ہیں اور اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اُن پر قانون کے نشوونما کا خاتمہ
ہو چکا ہے۔" (تشکیل ص ۲۵۹) اسی سلسلے میں آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"اب کہ زمانہ بدل چکا ہے اور دنیائے اسلام ان نئی نئی قوتوں سے متاثر اور دوچار
ہو رہی ہے جو فکر انسانی کے ہر سمت میں نشوونما کے باعث پھیلی رہی ہیں، کیسے کہا جا سکتا ہے
کہ ہمیں مذاہب فقہ کی خاتمیت پر اصرار کرتے رہنا چاہیئے۔ ائمۂ مذاہب کا کیا یہی دعویٰ تھا
کہ ان کے استدلالات اور تعبیرات حرف آخر ہیں؟ ہرگز نہیں۔" (ص ۲۶۰)

علامہ فرماتے ہیں: "اسلامی قانون کا دوسرا بنیادی مآخذ احادیثِ رسول اللہ
حدیث | صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو ماضی اور حال ہر زمانہ میں بڑی شدید بحثوں کا موضوع رہی
ہیں۔۔۔ جہاں تک مسئلہ اجتہاد کا تعلق ہے ہمیں چاہیئے ان احادیث کو جن کی حیثیت سرتاسر
قانونی ہے ان احادیث سے الگ رکھیں جن کا قانون سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ پھر اول الذکر
احادیث کی بحث میں بھی ایک بڑا اہم سوال یہ ہوگا کہ ان احادیث میں عرب قبل اسلام کے
اس رسم و رواج کا جسے جوں کا توں چھوڑ دیا گیا یا جس میں حضور رسالت مآب نے تھوڑی بہت
ترمیم کر دی کسی قدر حصہ موجود ہے، لیکن یہ وہ حقیقت ہے جس کا انکشاف مشکل ہی سے ہو سکے
گا کیوں کہ علماء متقدمین شاذونادر اس رواج کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔" آگے چل کر
فرماتے ہیں:۔ "یاد رکھنا چاہیئے کہ سب سے بڑی خدمت جو محدثین نے شریعت اسلامیہ کی
انجام دی ہے انہوں نے مجرد غور و فکر کے رجحان کو روکا اور اس کے بجائے ہر مسئلہ کی الگ
تھلگ شکل اور اس کی انفرادی حیثیت پر زور دیا۔ لہٰذا احادیث کا مطالعہ اگر اور زیادہ

شریعت اسلامیہ کے لیے حرکت اور زندگی کا سرچشمہ بن گیا..... لہذا آگے چل کر مذہب حنفی میں وہ سب نتائج جو ان نتائج سے مرتب ہوئے جذب ہوتے چلے گئے، اس بناء پر یہ مذہب اپنی بنیاد اور اساسات میں کامل آزاد ہے اور یہی وجہ ہے کہ بمقابلہ دوسرے مذاہب فقہ اس میں کہیں زیادہ صلاحیت پائی جاتی ہے کہ جیسے جیسے حالات ہوں اپنی قوت تخلیق سے کام لیتے ہوئے ان کے ساتھ مطابقت پیدا کرے..... بہرحال اگر مذہب حنفی کے اس بنیادی اصول قانون یعنی قیاس کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر کام میں لایا جائے تو جیساکہ امام شافعی کا ارشاد ہے وہ اجتہاد کا ہی دوسرا نام ہے اور اس لئے نصوص قرانی کے اندر رہتے ہوئے ہمیں اس کے استعمال کی پوری آزادی ہونی چاہیئے پھر بحیثیت ایک اصول قانون اس کا اندازہ صرف اس بات سے ہو جاتا ہے کہ بقول قاضی شوکانی زیادہ تر فقہاء اس امر کے قائل تھے کہ حضور رسالت مآب کی حیات طیبہ میں بھی قیاس سے کام لینے کی اجازت تھی۔" (تشکیل ص ۲۷۳-۲۷۴)

خطبہ پر ایک تجرباتی اور تنقیدی نظر

یہاں تک علامہ نے اس خطبہ میں اجتہاد اور اس کے مآخذ کے بارے میں جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے ہم نے نذیر نیازی صاحب کے اردو ترجمہ سے مدد لے کر ان کو علامہ کے الفاظ میں درج کر دیا ہے۔ اب ہم اس پر اپنے معروضات پیش کرتے ہیں:۔

(۱) علامہ نے اجتہاد کی ضرورت و اہمیت اور اس کا دروازہ بند نہ ہونے کی جو بات کہی ہے حضرت شاہ ولی اللہ الدہلویؒ کا ارشاد بھی یہی ہے اپنی کتاب مسوی کے مقدمہ (ص ۱۲) میں فرماتے ہیں:۔

"وآں کہ گفتیم اجتہاد در ہر عصر فرض ست بجہت آنست کہ مسائل کثیرۃ الوقوع غیر محصور اند و معرفت احکام الٰہی در آں واجب و آنچہ مسطور و مدون شدہ است غیر کافی، و در آں اختلاف بسیار کہ بدون رجوع بادلہ حل اختلاف نتواں کرد و طرق

"الموافقات" میں تصریح کر دی ہے کہ اجماع صحابہ کے سلسلہ اس سے مراد ہے کسی حکم قرآنی کی توسیع یا تحدید۔

اس کے بعد ایک بہت ہی نازک مسئلہ پہ اظہار خیال کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں :۔

"لیکن فرض کیجئے، صحابہ کسی امر پر متفق ہیں، اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان کے فیصلہ کی پابندی ہمارے لیے بھی ضروری ہے؟ شوکانی نے اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی ہے اور مذاہب اربعہ نے اس مسئلہ میں جو کچھ کہا ہے اسے نقل کر دیا ہے، میری رائے میں اس مسئلے کا فیصلہ یوں ہونا چاہیئے کہ ہم ایک امر واقعی اور امر قانونی میں فرق کریں، مثلاً اس مسئلہ میں کہ آخری دو سورتیں یعنی معوذتین قرآن پاک کا جزو ہیں یا نہیں اور جن کے متعلق صحابہ کا اتفاق ہے کہ یہ سورتیں قرآن کا جزو ہیں، ہمارے لیے صحابہ کا اجماع حجت ہے کیوں کہ یہ صرف صحابہ تھے جو اس امر واقعی کو ٹھیک ٹھیک جان سکتے تھے۔ اب رہی دوسری صورت یعنی جو امر قانونی ہو! تو یہ مسئلہ تعبیر اور ترجمانی کا ہوگا، لہٰذا ہم کرخی کی سند پہ یہ کہنے کی جراءت کر سکتے ہیں کہ اس صورت میں صحابہ کا اجماع ہمارے لیے حجت نہیں ہوگا۔"

قیاس اس کے متعلق لکھتے ہیں: چوتھا ماخذ قیاس ہے یعنی قانون سازی میں مماثلتوں کی بناء پہ استدلال سے کام لینا۔ معلوم ہوتا ہے وہ سب ملک جو اسلام کے زیر نگیں آئے حنفی الخیال فقہاء نے ان کے زرعی اور اجتماعی حالات کو دیکھتے ہوئے محسوس کیا کہ احادیث سے اس سلسلہ میں جو نظائر ملتے ہیں ان سے بحیثیت مجموعی کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا لہٰذا انہیں اپنی تعبیرات میں قیاس سے رجوع کرنا پڑا اس کے برعکس فقہاء حجاز نے جو عربوں کے دل و دماغ کو خوب سمجھتے تھے، عراقی فقہاء کی متکلمانہ موشگافیوں کے خلاف شدت سے احتجاج کیا۔ . . . فقہائے متقدمین کی یہی تلخ بحثیں تھیں جن سے بالآخر قیاس کے حدود، اس کے شرائط اور صحت و عدم صحت کی تعریف میں نقد و جرح سے کام لیا گیا، لہٰذا یہی قیاس جو شروع شروع میں مجتہدین کی ذاتی رائے کا ایک دوسرا نام تھا، آخر کار

ایک طرف دین اور شریعت کے محرم اسرار تھے اور دوسری جانب ان کی فہم و فراست کی انگلی نبضِ دوراں پر تھی، اس جامعیت کے باعث جب کبھی ان کے سامنے کوئی نیا مسئلہ یا معاملہ آتا تھا تو وہ اس کی گرہ اپنی عقلِ مومن کے ناخن سے بآسانی کھول سکتے تھے۔" علامہ اقبال کو اپنے متعلق مجتہد ہونے کا دعویٰ کبھی نہیں ہوا اور غالباً ان کو اصولِ فقہ اور اصولِ حدیث کا بحیثیت فن کے مطالعہ کرنے کی بھی فرصت نہیں ملی۔ البتہ وہ اسلام کے ایک عظیم مفکر تھے اس بناء پر اجتہاد اور اس کے متعلقہ مسائل کی نسبت انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ فنی نہیں بلکہ مفکرانہ ہے اگرچہ ان کے فکر کا کمال یہ ہے کہ ان کے فکر کے قامتِ موزوں پر فن کا جامۂ زیبا بڑی حد تک راست آتا ہے اب ہم ان کے افکار متعلقہ کا جائزہ اسی حیثیت سے لیں گے۔

(۳) علامہ نے اسلامی قانون کے ماخذ چار بتائے ہیں، لیکن یہ چار ماخذ وہ نہیں جو اصولی ہیں۔ ان کے علاوہ چند فروعی ماخذ بھی ہیں مثلاً استحسان، استصحابِ حال، مصالح مرسلہ، عرف، عادات و رسوم یا لاضرر و الاضرار، الاصل فی الاشیاء الاباحۃ، الحدود تندرئ بالشبہات وغیرہ، طوفی نے اپنے رسالہ میں ان کو اسقدر وسعت دی ہے کہ ان کی تعداد پینتالیس تک پہونچادی ہے لیکن یہ مستقل بالذات ماخذ نہیں ہیں، ان کی روشنی میں جو حکم مستنبط ہوگا وہ اسی وقت قابل قبول ہوگا جب کہ وہ قرآن و سنت کے کسی منطوق، منصوص یا مفہوم حکم کے خلاف نہو، اس بناء پر بات الٹ پلٹ کر کتاب و سنت کی ہی طرف آجاتی ہے، خود علامہ اس نظریہ کے بڑی سختی اور شدت کے ساتھ حامل ہیں اور جو نظریہ ان کو قرآن یا سنت سے ٹکراتا نظر آتا ہے اسے بے تکلف رد کر دیتے ہیں، چنانچہ شیخ محی الدین ابن عربی کے متعلق ایک خط میں صاف لکھتے ہیں: اس وقت میرا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت کی تعلیمات تعلیم قرآن کے مطابق نہیں ہیں اور نہ کسی تاویل و تشریح سے اس کے مطابق ہو سکتی ہیں۔" (انوار اقبال ص ۱۷۸)

ایک خط میں فناء کی نسبت لکھتے ہیں: " ہندی اور ایرانی صوفیاء میں سے اکثر نے مسئلہ فناء کی تفسیر فلسفۂ ویدانت اور بدھ مت کے زیر اثر کی ہے، میرے عقیدے میں یہ تفسیر بغداد کی تباہی

آں تا مجتہدین غالباً منقطع، پس بغیر عرض بر قواعد اجتہاد راست نیاید۔"

اسی بات کو مولانا عبد العلی بحر العلوم شرح مسلم الثبوت میں زیادہ صراحت سے کہا ہے، لکھتے ہیں:۔

"واما الاجتهاد المطلق فقالوا: اختتم بالائمة الاربعة حتى اوجبوا التقليد هؤلاء على الامة وهذا كله هوس من هوساتهم لم يأتوا بدليل ولا يعبأ بكلامهم۔"	رہا اجتہاد مطلق، تو بعض لوگ کہتے ہیں یہ چار اماموں پر ختم ہو گیا، چناں چہ امت پر ان کی تقلید لازم ہے لیکن یہ ان کی من مانی بات ہے، ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے اور ان کا کلام قابلِ اعتبار نہیں ہے۔

اور یہ اقوال تو عہد سلف کے ہیں آج پورا عالم اسلام اجتہاد کی ضرورت اور اہمیت کے نعروں سے گونج رہا ہے اور گذشتہ چند برسوں میں مصر، شام، بیروت اور مراکو اور عالم اسلام کے دوسرے گوشوں میں اجتہاد اور اس کے متعلقہ مسائل پر بڑی اچھی اچھی کتابوں کا انبار لگ گیا ہے اقبال کی چشم تصوّر نے اس دور کو پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ اور اس لیے انہوں نے بجا طور پر کہا تھا ۔

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

(۲) لیکن مجتہد کے لیے کن اوصاف و کمالات کا حامل ہونا ضروری ہے؟ علامہ نے اس خطبہ میں اس پر روشنی نہیں ڈالی ہے صرف ایک مقام پر اس قدر کہا ہے کہ "آج جو مسئلہ ترکوں میں درپیش ہے کل دوسرے بلاد اسلامیہ کو پیش آنے والا ہے اور اس لئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا فی الواقع اسلامی قانون میں نشوونما اور مزید ارتقاء کی گنجائش ہے؟ لیکن اس سوال کے جواب میں ہمیں بڑی زبردست کاوش اور محنت سے کام لینا پڑے گا، گو ذاتی طور پر مجھے یقین ہے کہ اس سوال کا جواب اثبات میں ہی دیا جا سکتا ہے۔" (تشکیل ص ۲۵۱) اسی سلسلہ میں آگے چل کر انہوں نے کہا ہے کہ اجتہاد صحیح معنی میں وہی شخص کر سکتا ہے جس میں حضرت عمرؓ کی اسپرٹ موجود ہو اس سے مراد یہ ہے کہ حضرت عمرؓ

اسی طرح ترکی شاعر کا مطالبہ تھا کہ نماز، اذان اور قرآن کی تلاوت سب بجائے عربی کے ترکی زبان میں ہوں، علامہ اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ بے شک کسی مذہب کے روحانیت خیز افکار کا مادری زبان میں مطالعہ جس قدر موثر ہوتا ہے اتنا غیر مادری زبان میں نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے بعد فرماتے ہیں: "بایں ہمہ باعتبار ان وجوہ کے جن کا ذکر آگے آئے گا۔ شاعر کا یہ اجتہاد سخت قابل اعتراض ہے۔"

(۴) سطور بالا میں آپ نے دیکھا کہ قرآن مجید کی حقانیت و صداقت اور اس کی ابدیت پر علامہ اقبال کے ایمان اور اس پر جزم و یقین کا کیا عالم ہے اس کے نصوص اور اس کی اسپرٹ کے خلاف کسی نظریہ اور کسی فکر کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں یہاں تک کہ انہوں نے ببانگ دہل کہہ ہی دیا کہ:

نیست ممکن جز بقرآں زیستن

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایسا ہے تو پھر قرآن کی بنیاد پر اجتہاد کے ذریعہ موجودہ مسائل و معاملات کا حل کیوں کر پیش کیا جا سکتا ہے اور ایک ہر آن تغیر پذیر دنیا میں قرآن سے کس طرح ہدایت اور رہنمائی مل سکتی ہے جس کا اقبال نے بڑے شد و مد سے بار بار ادعا کیا ہے، اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے اصول فقہ پر ایک نظر ڈالنی ہوگی، قرآن مجید میں جو آیات متشابہات ہیں ان کا ذکر نہیں کیوں کہ ان کی نسبت تو خود قرآن میں جتا دیا گیا ہے کہ "لا یعلم تاویلہ الا اللہ"، اللہ کے سوا کوئی ان کا صحیح مصداق نہیں جانتا، لیکن جو آیات محکمات ہیں اور جن پر اسلامی قانون کی پوری عمارت کھڑی ہے ان کی تشریح اور تفسیر میں بھی فقہاء اور مفسرین کے درمیان ایسے اختلافات ہیں کہ ایک ہی آیت سے ہر فقیہ نے کسی مسئلہ میں اپنے فیصلہ کے لیے اس سے استدلال کیا ہے، اس اختلاف کی اساس کبھی قرآن ہی کی کوئی دوسری آیت ہے کبھی کوئی حدیث اور کوئی اثر ہے، کبھی اہل مدینہ کا تعامل ہے، کبھی صرف و نحو کا کوئی قاعدہ ہے، کبھی علم معانی اور بلاغت کا کوئی

سے زیادہ خطرناک تھی اور ایک معنی میں میری تمام تحریریں اس تفسیر کے خلاف ایک قسم کی بغاوت ہیں۔"
(انوار اقبال ص ۲۱۸) اسی بنیاد پر انہوں نے انوار اقبال کے بعض خطوط میں وحدت الوجود کے
عقیدہ اور عجمی تصوّف کی مخالفت کی ہے اگرچہ خالص اسلامی تصوّف اور اس کے علمبردار
صوفیائے کرام کے وہ بیحد مداح اور عقیدت مند ہیں۔"

خطبۂ پیشِ نظر میں علامہ نے ترکوں کی تحریک آزادی اور ترکی کے ایک شاعر ضیاء کی بڑی
تعریف کی ہے اور اس کے انقلابی اشعار نقل کیے ہیں لیکن اس کے باوجود ضیاء نے سماجی اصلاح
کے سلسلہ میں جو باتیں قرآن اور اسلام کے خلاف کہی ہیں علامہ نے بڑی شدت سے ان کا
رد کیا ہے۔ مثلاً ترکی شاعر نے تین چیزوں میں مردوں اور عورتوں کی برابری کا مطالبہ کیا
تھا۔ ایک طلاق، دوسرے حق علیحدگی اور تیسرے وراثت۔ علامہ اس کے رد میں لکھتے ہیں:۔

"رہا ترکی شاعر کا مطالبہ، میں سمجھتا ہوں وہ اسلام کے عائلی قانون سے واقف نہیں
تھا، وہ نہیں سمجھتا کہ قرآن مجید نے وراثت کے بارے میں جو قاعدہ نافذ کیا ہے اس کی معاشی
قدر و قیمت کیا ہے۔ شریعت اسلامی میں نکاح کی حیثیت ایک عقد اجتماعی کی ہے اور بیوی کو یہ حق
حاصل ہے کہ بوقت نکاح شوہر کا حق طلاق بعض شرائط کی بناء پر خود اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اس طرح
عورت اور مرد میں طلاق کے معاملہ میں تو برابری ہو جاتی ہے لیکن وراثت میں دونوں میں برابری
کا مطالبہ غلط فہمی پر مبنی ہے، اس پر کافی بحث کرنے کے بعد فرماتے ہیں: "دراصل قرآن مجید کا
قانونِ وراثت جو بقول فان کریمر شریعت اسلامیہ کی ایک نہایت ہی اچھوتی شاخ ہے، اس
کی تہہ میں جو اصول کام کر رہے ہیں ان پر مسلمان ماہرین قانون نے ابھی تک کماحقہ توجہ نہیں کی۔"
آخر اس بحث کو ان جملوں پر ختم کرتے ہیں:۔ "میرا خیال ہے کہ جہاں ہم نے اپنی شریعت کا مطالعہ
اس انقلاب کے پیش نظر کیا جو معاشیات کی دنیا میں ناگزیر ہے ہمیں شریعت کے بنیادی اصولوں
میں ایسے پہلو نظر آجائیں گے جو آج تک ہم پر منکشف نہیں ہوئے پھر اگر ایمان و یقین سے کام لیا
گیا تو ان میں جو حکمت پوشیدہ ہے ہم اس سے اور زیادہ فائدہ اٹھا سکیں گے۔" (تشکیل ص ۲۶۲، ۲۶۳)

امام صاحب کے نزدیک حرام اور امام شافعی کے نزدیک حلال۔

(د) کیا ضرورت سے زیادہ چیزیں رکھنی جائز ہیں؟ اس کے متعلق حضرت ابوذر غفاری کی صاف رائے تھی کہ ناجائز ہے اور ان کا استدلال قرآن مجید کی اس آیت سے تھا:۔ یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ اسی طرح ان کی رائے تھی کہ گھر میں سونا چاندی جمع رکھنا حرام ہے اور ان کا استدلال اس آیت سے تھا جس میں فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ سونا چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں قیامت کے دن ان کی پیشانیوں اور ان کے پہلوؤں کو اسی سے داغا جائے گا، لیکن جمہور امت نے حضرت ابوذر غفاری کی رائے سے اتفاق نہیں کیا پہلی آیت کے متعلق انہوں نے کہا کہ یہ حکم ایک خاص وقت کے لیے تھا جب کہ مسلمان دشمنوں سے برسر جنگ تھے اور ان کو روپیہ کی ضرورت تھی اور دوسری آیت ان لوگوں کے حق میں ہے جو مال کی پوجا کرتے ہیں اور اس سے اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق ادا نہیں کرتے۔

یہ چند مثالیں بطور نمونہ نقل کی گئی ہیں ورنہ فقہ اور اصول فقہ کی کتابیں ان سے بھری ہوئی ہیں ان سے اندازہ ہوگا کہ آیات محکمات کی تاویل و تفسیر کا میدان کتنا وسیع ہے اور اس میں جو اختلافات پیدا ہوئے ہیں اور جن وجوہ و اسباب سے پیدا ہوئے ہیں ان کے باعث اسلامی قانون میں کس قدر وسعت اور لچک پیدا ہو گئی ہے اسلامی قانون کی یہی وہ صفت ہے جس کے باعث وہ ان تمام سماجی اور معاشی مشکلات اور مسائل و معاملات کو کامیابی سے حل کر سکا جو پہلی اور دوسری صدی میں برق رفتار فتوحات کے باعث مختلف اقوام و ملل کے ساتھ اختلاط و ارتباط کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے۔

علامہ اقبال ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پورے قرآن کی ایک روح ہے جسے دین فطرت یا فطرۃ اللہ کہتے ہیں یہ ازلی اور ابدی ہے، یہ جس طرح ماضی کے ایک مخصوص پیکر میں جلوہ آرا تھی، اسی طرح وہ حال اور مستقبل کے پیکر میں جلوہ ریز ہو کر عظمت انسان کا نقش ثبت کر سکتی ہے۔

سکتہ ہے اور کبھی قیاس ہے، چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے:-

(الف) مطلقہ عورتوں کی عدت کیا ہے؟ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تین ایام ماہواری ہیں اور امام شافعی کے نزدیک تین طہر، دونوں کا استدلال قرآن مجید کی آیت "والمطلقات یتربصن بانفسھن ثلاثة قروء" سے ہے۔ امام صاحب کا استدلال یہ ہے کہ چوں کہ طلاق وسنت طہر میں طلاق دینا ہے، اس بناء پر پورے تین قروء اسی وقت ہوتے ہیں جب کہ ان سے مراد ایام ماہواری لئے جائیں ورنہ وہ تین سے کم ہوں گے یا اس سے زیادہ امام شافعی کا استدلال یہ ہے کہ ثلاثہ کا لفظ اسم عدد مونث ہے اس بناء پر نحو کے مشہور قاعدہ کے مطابق اس کا ممیز یعنی معدود مذکور ہونا چاہیئے اور وہ طہر ہی ہے۔

(ب) روزہ کب افطار کرنا چاہیئے؟ احناف کے نزدیک سورج ڈوبتے ہی اور شوافع کے نزدیک کچھ دیر کے بعد جب اندھیرا ہوجائے اور دونوں کا استدلال آیت "واتموالصیام الی اللیل" سے ہے کیوں کہ ایک کے نزدیک غایت داخل ہوتی ہے اور دوسرے کے نزدیک داخل نہیں ہوتی، رہیں احادیث اور آثار وہ بھی اس بارے میں مختلف ہیں۔

(ج) جس جانور کے ذبح کرتے وقت تسمیہ یعنی خدا کا نام نہ لیا گیا ہو کیا وہ حلال ہے؟ امام ابوحنیفہ کے نزدیک حلال نہیں ہے اور امام شافعی کے نزدیک حلال ہے، دونوں کا استدلال قرآن مجید کی آیت "ولا تاکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ" سے ہے، امام صاحب کا استدلال تو صاف ظاہر ہے کیوں کہ آیت کا منطوق یہی ہے لیکن امام شافعی فرماتے ہیں کہ آیت کا مطلب ہے کہ جس جانور پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو اس کا کھانا حرام ہے اور دلیل یہ ہے کہ اس حکم کو وانہ لفسق سے مقید کیا گیا ہے اور قرآن میں ہی اس کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ کسی جانور پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو، اس بناء پر ذبیحہ تین قسم کا ہوتا ہے ایک وہ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو، یہ بالاتفاق حلال ہے، دوسرا وہ جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو، یہ سب کے نزدیک حرام ہے، تیسرا وہ جس پر نہ اللہ کا اور نہ غیر اللہ کا کسی کا نام نہیں لیا گیا، یہ مختلف فیہ ہے،

پر مشتمل ہے وہ قرآن کی روح اور اس کی تعلیمات کی تعبیر اور تشریح کا ایک عملی پیکر ہے، چناں چہ حضرت عائشہؓ نے حضورؐ کے متعلق جو فرمایا: 'وکان خلقه القرآن' اس کا مطلب بھی یہی ہے، پھر چوں کہ قانون تشریع کے مطابق ہر پیغمبر کی شریعت ایک آئینہ ہوتی ہے جس میں اس قوم کے عادات وخصائل ورسم ورواج اور طور وطریق کی صورت نظر آسکتی ہے اس بناء پر جس کو ہم سنت کہتے ہیں اس کا سب سے بڑا تشریعی اور قانونی فائدہ یہ ہے کہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے اصول اور اس کی تعلیمات کو اس زمانے کے حالات رجحانات وخیالات اور رسوم وعوائد پر منطبق کر کے ان چیزوں کا حک وفک ترمیم وتنسیخ اور اثبات ونفی کا عمل جاری کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بحیثیت شارع کے یہ عمل اصلاح وہدایت کے سلسلہ میں کسی ایک خاص نقطۂ نظر اور مطمعِ نگاہ کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی وہ بنیادی نقطۂ نظر تھا جس کی رعایت سے ایک ہی معاملہ میں کبھی آپ نے ایک شخص کو ایک حکم دیا اور دوسرے شخص کو دوسرا حکم دیا، اور کبھی ایک ہی شخص کو کسی معاملے میں ایک وقت ایک حکم دیا اور دوسرے وقت اسے دوسرا حکم دیا جس طرح ہمیشہ روشنی ایک ہی ہوتی ہے لیکن بلب کی شکل وصورت اور اس کا رنگ بدلنے کے باعث روشنی کا ظہور مختلف مظاہر میں ہوتا ہے اسی طرح حضور کا بنیادی نقطۂ نظر ہر جگہ اور ہر مقام پر ایک ہے لیکن حسب ضرورت ومصلحت احکام کے تنوع کے شکل میں اس کا ظہور وبروز ہوتا رہتا ہے۔ اقبال کے نزدیک یہی روح محمدیؐ ہے جو آپ کے تمام اقوال وافعال میں یکساں طور پر رواں دواں ہے' اقبال کہتے ہیں کہ دیدۂ بینا اور دلِ روشن کے ساتھ سنت کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد ہمیں اس روح محمدی کی معرفت اور اس سے آشنائی پیدا کرنی چاہیئے، بس یہی روح قرآنی اور روحِ محمدیؐ ہے جو ابدی ہے عالم گیر اور ہمہ گیر ہے اور اسی کے ذریعہ ایک تغیر پذیر دنیا میں ہم ثبات اور

اس روح قرآنی کا مرتبہ و مقام لفظی، نحوی و صرفی اور منطقی بحث و تحیص اور استدلال و استشہاد سے بہت بلند اور برتر ہے اور یہ وہی روح ہے جو حضرت عمرؓ کے اجتہادات میں جاری و ساری تھی، اس سلسلہ میں دو مثالیں سنیے ان سے مطلب اور واضح ہوگا۔

ایک مرتبہ اسپین کے عبدالرحمٰن الداخل الاموی نے رمضان المبارک کے روزہ کی حالت میں ایک جاریہ سے مقاربت کرلی اور پھر علماء سے مسئلہ پوچھا تو انہوں نے کفارہ صوم کو کفارۂ ظہار پر قیاس کرتے ہوئے بتایا کہ اس کا کفارہ ہے علی الترتیب ایک غلام آزاد کرنا، ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا اور ساٹھ روزے رکھنا، ایک مالکی المذہب عالم غالباً حضرت ابواللیث بھی اس مجمع میں تشریف رکھتے تھے، انہوں نے علماء سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ کفارہ کا مقصد سزا دینا ہے تاکہ اس حرکت کا اعادہ نہ ہو اور ایک بادشاہ کے حق میں ساٹھ روزے رکھنا ہی سزا ہو سکتا ہے نہ کہ غلام آزاد کرنا اور ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا، سب علماء حضرت ابواللیث کے تفقہ پر حیران رہ گئے اور اس سے اتفاق کیا، دوسرا واقعہ حافظ ابن تیمیہ کا ہے، کہ گرمی کا موسم تھا اور اسلامی فوج جنگ کی تیاری کر رہی تھی اتنے میں رمضان آگیا تو حافظ ابن تیمیہ نے فرمایا: مسافر اور بیمار کے لیے روزہ کی قضا رخصت بربنائے مشقت ہے اور یہ مشقت اور وہ بھی ایک نہایت ضروری اور اہم خدمتِ ملک و ملت کے لیے یہاں بھی پائی جاتی ہے، اس لیے قضائے صوم کی اجازت یہاں بھی ہونی چاہیئے غرض کہ یہی وہ روح قرانی ہے جس کی اساس پر علامہ کے نزدیک کتاب اللہ کو اجتہاد کا ماخذ اول ہونا چاہیئے۔

(۵) علامہ اقبال نے جو خیال قرآن کے متعلق ظاہر کیا ہے کم و بیش وہی حدیث کی نسبت ہے، فقہی اور فنی طور پر احادیث پر جو بحثیں ہوئی ہیں ان سے مجلات بھری پڑی ہیں لیکن علامہ احادیث کو ایک اور ہی نقطہ نظر سے دیکھنے کی سفارش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک سنت جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال یا خاموش رضامندی

غور کیا ہے اور اپنی رائے ظاہر کی ہے لیکن ان کی بالغ نظری اور سلامت طبع کی داد دینی چاہیے کہ آج ان میں کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس میں سب نہیں تو بعض بلند پایہ عالم ان کے ہم نوا نہ ہوں، ہم ذیل میں اس کی چند مثالیں تحریر کرتے ہیں۔

زمین کی ملکیت مطلقہ

خواجہ عبدالرحیم بار ایٹ لا کو ان کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں: "اسلام کے نزدیک زمین وغیرہ ایک امانت ہے، ملکیت مطلقہ جس کو قدیم وجدید قانون داں تسلیم کرتے ہیں، میری ناقص رائے میں اسلام میں نہیں ہے، فقہاء میں بہت سا اختلاف ہے (انوار اقبال ص ۲۴۵)

اس رائے پر بہت سے اصحاب کو تعجب ہوگا لیکن اس سلسلہ میں امام ابویوسف کی کتاب الخراج اور ماوردی کی کتاب الاحوال میں جو کچھ ہے اس سے قطع نظر، ایک زمانے میں معارف اعظم گڑھ میں مولانا سید مناظر احسن گیلانی اور مولانا ظفر احمد تھانوی کے درمیان اسی موضوع پر بحث چلی تھی اور دونوں طرف سے متعدد مقالات شائع ہوئے تھے، مولانا گیلانی زمین کی ملکیت مطلقہ کے منکر تھے اور دوسری دلیلوں کے ساتھ ان کا استدلال قرآن مجید کی آیت " والارض وضعھا للانام" سے تھا کہ اس میں لام انتفاع کا ہے، مولانا ظفر احمد اس رائے کے مخالف تھے۔

اسلام اور سوشلزم

اس رائے سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ سوشلزم کے حامی تھے، چناں چہ خواجہ غلام السیدین کو ایک خط میں لکھتے ہیں: "کارل مارکس پہلا شخص ہے جس نے (مذہب کے لیے) افیون کا لفظ استعمال کیا ہے، میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان ہی مروں گا، میری رائے میں تاریخ انسانیت کی مادی تشریح غلط ہے، میں روحانی اقدار میں یقین رکھتا ہوں مگر قرآنی مفہوم میں، میں نے ہمیشہ ان روحانی اقدار پر تنقید کی ہے جو افیون کا سا کام کرتی ہیں، رہا سوشلزم: تو اسلام خود ایک سوشلزم کی شکل ہے جس سے اب تک مسلمانوں نے بہت کم فائدہ اٹھایا ہے (اقبال نامہ ج ا ص ۳۱۹)

قرار حاصل کر سکتے ہیں اور امامت اقوام کا فرض انجام دے سکتے ہیں۔

اسی مضمون کو دوسرے لفظوں میں اس طرح بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ساری دنیا اور رہتی دنیا تک کے لیے مرسل من اللہ تھے اس بنا پر ہم فرض کر سکتے ہیں کہ آپ آج بھی دنیا میں موجود ہیں اور آپ کا قیام یورپ کے کسی مقام میں ہے۔ اب سوچیے کہ اگر واقعی ایسا ہوتا تو تمدن جدید کی کن چیزوں کو آپ بعینہٖ اختیار کر لیتے کن چیزوں کو بالکل ختم کر دیتے اور جن چیزوں میں خیر و شر دونوں مخلوط ہوتے، ان میں کس طرح ترمیم و تنسیخ کرتے کہ خیر کا حصّہ غالب اور شر کا حصّہ مغلوب ہو جاتا کتب سیر و تاریخ سے ثابت ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دشمنوں سے جنگ کرنے پر مجبور ہو گئے تو آپ نے عرب کے مشہور ہتھیار دبابہ وغیرہ کا استعمال اور ان کی ساخت کی ٹریننگ حاصل کرنے کے لیے دو شخصوں کو یمن کے جرش نامی ایک مقام پر بھیجا۔ پس آپ آج ہوتے تو کیا سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم کا اعلیٰ اہتمام و انتظام نہ فرماتے؟ اسی طرح عبادات سے قطع نظر موجودہ سماجیات اور معاشیات میں آپ جو اصلاح فرماتے اس کی شکل کیا ہوتی اور اس زمانے میں اسلام کو الحق یعلو ولا یعلی کا مصداق کیوں کر بناتے! درحقیقت علامہ اقبال کی سب تحریروں کو سامنے رکھئے تو معلوم ہو گا کہ اجتہاد کے سلسلہ میں ان کے غور و فکر کی لائن یہی ہے۔ اسی عالم جذب و شوق میں للکار کر مسلمانوں سے کہتے ہیں:۔

معمار حرم! باز بتعمیر جہاں خیز　　از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز

(۶) جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے، علامہ مجتہد نہیں تھے اور نہ انہیں اس کا دعوے تھا بلکہ ان کی احتیاط کا عالم تو یہ تھا کہ ایک مرتبہ انہوں نے اجتہاد پر ایک مضمون سپرد قلم کیا لیکن چوں کہ خود ان کو اپنے بہت سے نکات پر اعتماد نہیں تھا اس بنا پر اسے شایع نہیں کیا۔ (اقبال نامہ ج ۱ ص ۱۴۳)

تاہم ایک مفکر اور مبصّر کی حیثیت سے انہوں نے بعض اسلامی احکام و مسائل پر

خوش ہو کر کہا ہوگا:۔

جو تیری خو تھی وہی میرا مدعا ہوا

مہدی اور نزول مسیح کا عقیدہ

ضیاء الدین صاحب برنی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:" مہدی و مسیح کے متعلق جو احادیث ہیں ان پر علامہ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں مفصل بحث کی ہے ان کی رائے میں یہ تمام احادیث کمزور ہیں جہاں تک اصول فن تنقید احادیث کا تعلق ہے میں بھی ان کا ہمنوا ہوں مگر اس بات کا قائل ہوں کہ مسلمانوں میں کسی بڑی شخصیت کا ظہور ہوگا، احادیث کی بنا پر نہیں، بلکہ اور بنا پر میرا عقیدہ یہی ہے۔"
(انوار اقبال ص ۱۴۴)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمانوں کی عظیم اکثریت کا عقیدہ مہدی اور حضرت عیسیٰ کے نزول کا ہی ہے لیکن اقبال اس میں بھی منفرد نہیں ہیں جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے، ابن خلدون تو اس کے قائل تھے ہی نہیں، ان کے علاوہ عہد حاضر کے عظیم مفکر و محقق اسلام سابق شیخ جامعۂ ازہر قاہرہ شیخ محمود شلتوت بھی اس کے قائل نہیں تھے، چنانچہ ان کے فتاویٰ کا ضخیم مجموعہ جو قاہرہ کے مطبع دار القلم سے شایع ہوا ہے اس میں ص ۵۹ سے ص ۸۲ تک آیات احادیث اور اجماع کی روشنی میں انہوں نے اس پر مفصل اور مبسوط کلام کر کے اس عام خیال کی جو عقیدہ کی حیثیت رکھتا ہے تردید کی ہے۔ ان مثالوں سے یہ واضح ہو گیا ہوگا کہ علامہ پر آزاد خیالی FREE THINKING کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا، ان کی بعض آرا مسلمانوں کی اکثریت کی کیسی ہی خلاف ہو مگر اس میں بھی وہ تنہا نہیں ہیں، بلکہ مستند علماء ان کے ہم خیال ہیں، تعبیر و تشریح اور تاویل و تفسیر کا فرق ہو سکتا ہے لیکن انہوں نے جو کچھ کہا ہے قرآن و سنت کے دائرہ کے اندر رہتے ہوئے کہا ہے۔

اجماع اور قیاس

اب رہے احکام کے باقی دو ماخذ یعنی اجماع اور قیاس! تو اگرچہ یہ کہنے کو دو ہیں لیکن در حقیقت ایک ہی ہیں، اجتہاد اگر انفرادی اور شخصی ہو تو قیاس

علامہ کی یہ رائے ممکن ہے اس زمانے میں عجیب معلوم ہو لیکن آج عالم اسلام میں ہر جگہ اس کا چرچا ہے اور مصر و شام میں اس موضوع پر بہت سی کتابیں شایع ہو چکی ہیں اور بعض مسلمان حکومتوں نے اسے اپنے دستور میں شامل کر لیا ہے۔

ارتداد سے نکاح فسخ نہیں ہوتا

فقہ حنفی کی عام کتابوں میں یہ ہے کہ ارتداد سے نکاح فسخ ہو جاتا ہے چناں چہ ہدایہ میں بھی یہی ہے، علامہ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں: "ہدایہ میں قانونِ ارتداد کو جو شکل دی گئی ہے وہ کیا صحیح ہے اس ملک میں ہمارے دینی مصالح کے لیے کافی ہے۔ مسلمانان ہند چوں کہ غیر معمولی طور پر قدامت پسند ہیں اس لیے ہندوستانی عدالتیں مجبور ہیں کہ فقہ اسلامی کی مستند کتابوں سے سر مو انحراف نہ کریں اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ تو بدل رہے لیکن یہ مسلک جہاں تھا وہیں کھڑا ہے" تشکیل ص ۲۶۱۔

اس سلسلہ میں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جن دنوں میں علامہ نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا اس کے چند برسوں بعد ہی ہندوستان میں مردوں کے سخت ظلم و ستم اور فقہ کی تنگ دامانی کے باعث مسلمان عورتوں پر جو قیامت گزر رہی تھی آخر کار اس نے علماء کو بھی ادھر متوجہ کیا۔ چناں چہ مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی نے اس زمانے کے اکابر و مشاہیر علما کے مشورہ اور تائید سے عورتوں کے ان مسائل و معاملات کے بارے میں ایک طویل مگر نہایت مدلل تحریر بصورت فتویٰ مرتب کی جس میں تفویض طلاق اور عورتوں کے حق تفریق کے علاوہ ارتداد کے باعث فسخ نکاح کے مسئلہ پر بھی سیر حاصل گفتگو کر کے ہدایہ کے مندرجات کا رد کیا گیا تھا اور احناف کے مسئلہ کے خلاف دوسرے ائمہ کے مذہب پر فتویٰ دیا گیا تھا۔ ہند اور بیرون ہند کے اجلہ علماء کی نہایت پُر زور تصدیقات و تصویبات کے ساتھ جب یہ ضخیم رسالہ "الحیلۃ الناجزۃ للحلیلۃ العاجزۃ" کے نام سے خانقاہ تھانہ بھون سے شایع ہوا ہے تو پورے ملک میں اس کی دھوم مچ گئی اور لاکھوں ستم رسیدہ و بے کس عورتوں کو حرماں نصیبی و مایوسی کی تاریکیوں میں امید کی ایک کرن نظر آئی، علامہ اقبال کی نظر سے غالباً یہ رسالہ ضرور گزرا ہوگا اور انھوں نے

تو آخر اس کو پڑھنے پڑھانے والے علماء ہی ہوں گے اور غالباً مجالس مقننہ کی ممبری کے لیے اس نصاب فقہ کو پڑھنے کی شرط مناسب نہ ہوگی البتہ اس سلسلہ میں علامہ اقبال نے اپنے ۳۲ء کے مشہور خطبہ صدارت میں جو تجویز پیش کی تھی وہ زیادہ قابل عمل اور لائق غور ہے، وہ فرماتے ہیں:۔

"میرا خیال ہے کہ علماء کی ایک اسمبلی تشکیل دی جائے جس میں وہ مسلم قانون داں بھی شامل ہوں جنہوں نے علم جدید حاصل کیا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کے بنیادی اصولوں کی روح کے عین مطابق موجودہ حالات کی روشنی میں اسلامی قانون کا تحفظ کیا جائے اس کو وسعت دی جائے اور اگر ضروری محسوس ہو تو نئی تاویل کی جائے تاکہ کوئی بھی قانون جو مسلم پرسنل لاء کی تعریف میں آتا ہے۔ اس جماعت کی منظوری سے پہلے قانون سازی کے لیے پیش نہ کیا جا سکے۔" اس سے غالباً علامہ کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہمارے ملک میں پارلیمنٹ کے ساتھ ایک راجیہ سبھا یا اسٹیٹ اسمبلی کے ساتھ ایک کونسل ہوتی ہے، اسی طرح اسلامی ممالک میں مجلس مقننہ کے ساتھ علماء کی ایک اسمبلی ہونی چاہیئے۔

خطبہ کے آخر میں فرماتے ہیں:۔

"میرا خیال ہے کہ اجتہاد کی اس مختصر بحث سے آپ بخوبی سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ ہمارے اصول فقہ ہوں یا نظامات فقہ، ان میں آج بھی کوئی بات ایسی نہیں ہے جس کے پیش نظر ہم اپنے موجودہ طرز عمل (یعنی فکری جمود اور اجتہاد سے اجتناب) کو حق بجانب ٹھہرائیں، اس کے برعکس اگر ہمارے افکار میں وسعت اور دقّتِ نظر موجود ہے اور ہم نئے نئے احوال اور تجربات سے فائدہ بھی اٹھا رہے ہیں تو ہمیں چاہیئے کہ فقہ اسلامی کی تشکیل میں جرأت سے کام لیں۔

اس موقع پر علامہ ایک نہایت اہم تنبیہ کرتے ہیں اور معاً اس کے بعد فرماتے ہیں: "لیکن یہ کام اس زمانے کے ظروف اور احوال سے محض مطابقت پیدا کرنے کا نہیں

ہے اور اگر اجتماعی ہو تو اسے اجماع کہتے ہیں، جو مذہب دنیا کے تمام انسانوں کو ہر زمانہ میں ان کے تمام دینی اور دنیوی معاملات و مسائل میں رہنمائی عطا کرنے کا مدعی ہو وہ تاریخ کے ہر دور اور وقت کے ہر نئے موڑ میں اس وقت تک فعال اور متحرک رہ ہی نہیں سکتا جب تک اس کے ہاں قیاس اور اجماع کے ادارے نہ ہوں لیکن افسوس ہے کہ تاریخ اسلام کے مختلف ادوار میں قیاس سے تو کام لیا جاتا رہا مگر اجماع سے کام نہیں لیا گیا، بہرحال اجتہاد کا قیام ان کے بغیر نہیں ہو سکتا۔

علامہ اقبال کی رائے میں موجودہ زمانے میں مسلمان حکومتوں کی پارلیمنٹ یا مجالس مقننہ یہ کام کر سکتی ہیں، چناں چہ اس خطبہ میں انہوں نے اس رائے کا اظہار کیا ہے لیکن اس میں جو اشکال ہے علامہ اس سے بے خبر نہیں ہیں۔ چناں چہ فرماتے ہیں:

"سوال یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں تو جہاں کہیں مسلمانوں کی کوئی قانون ساز مجلس قائم ہوگی اس کے ارکان زیادہ تر وہی لوگ ہوں گے جو فقہ اسلامی کی نزاکتوں سے ناواقف ہیں، اس لیے اس کا طریقہ کار کیا ہوگا؟ کیوں کہ اس قسم کی مجالس شریعت کی تعبیر میں بڑی بڑی شدید غلطیاں کر سکتی ہیں۔ ان غلطیوں کا ازالہ یا ان کے کم سے کم امکانِ وقوع کی صورت کیا ہوگی؟"

آگے چل کر وہ خطرہ کے سدّباب کے سلسلہ میں فرماتے ہیں۔

"شریعت اسلامی کی غلط تعبیرات کا سدباب ہو سکتا ہے تو صرف اس طرح کہ بحالت موجودہ بلاد اسلامیہ میں فقہ کی تعلیم جس نہج پر ہو رہی ہے اس کی اصلاح کی جائے، فقہ کا نصاب مزید توسیع کا محتاج ہے لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ جدید فقہ کا مطالعہ بھی باحتیاط اور سوچ سمجھ کر کیا جائے" (تشکیل ص ۲۷۱)

لیکن ہمارے خیال میں اس تجویز سے اصل اشکال کا حل پیدا نہیں ہوتا کیوں کہ فقہ کا کوئی ایسا وسیع اور جامع نصاب اگر تیار ہو بھی گیا جیسا کہ ہو گیا ہے اور عرب ممالک میں رائج ہے

طبقۂ صحابہؓ میں

فقیہات ومفتیات اور محدثات

(۱)

(از مولانا قاضی اطہر مبارک پوری، ایڈیٹر البلاغ بمبئی)

اسلام اور مسلمانوں کے امتیازات میں سے یہ امتیازی شان ہر دور میں نمایاں رہی ہے کہ اسلامی اور دینی علوم میں مردوں کی طرح عورتوں نے پورا حصہ لیا ہے، اور ان کی تعلیم و تدریس اور نشر و اشاعت میں ان کے دوش بدوش خدمات انجام دی ہیں، خاص طور سے حدیث و فقہ میں عورتیں پیش پیش رہی ہیں، صحابیات، تابعیات اور ان کے بعد کی بنات اسلام نے احادیث کی تدوین و ترتیب اور روایت میں نمایاں کام کیے ہیں، اسی طرح فقہ و فتویٰ میں ان کی شاندار خدمات ہیں، اور بہت سے حفاظِ حدیث اور ائمہ فقہ نے اپنی جلالتِ شان کے باوجود ان محدثات و فقیہات سے استفادہ کیا جو علم و فضل، روایت و درایت، تفقہ اور زہد و تقویٰ میں مشہورِ زمانہ رہی ہیں۔

فقہ و فتویٰ کی باقاعدہ تدوین سے پہلے خاص خاص فقہاء و فقیہات اس میں مہارت و شہرت رکھتے تھے، عہدِ رسالت میں خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ کی ذات اقدس جملہ دینی علوم و امور کا مرکز تھی، ہر قسم کے معاملات و مسائل آپ کے سامنے پیش کیے جاتے تھے، اور آپ ان میں رہنمائی فرماتے تھے، نیز اس زمانہ میں حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم فتویٰ دیا کرتے تھے، بعض روایات میں ہے کہ عہدِ رسالت میں صرف حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر فتویٰ دیا کرتے تھے[1]، اسی طرح بعض صحابہ جو مختلف مقامات کے لیے امیر و معلم بنا کر روانہ

[1] طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۳۳۵ طبع بیروت

ہے بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ اہم ہے۔" آگے چل کر کہتے ہیں:۔

"یقین کیجئے یورپ سے بڑھ کر آج انسان کے اخلاقی ارتقاء میں بڑی رکاوٹ کوئی اور نہیں ہے اس کے برعکس مسلمانوں کے نزدیک ان بنیادی تصورات کی اساس جوں کہ وحی و تنزیل پر ہے جس کا صدور ہی زندگی کی انتہائی گہرائیوں سے ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اپنی ظاہری خارجیت کو ایک اندرونی حقیقت میں بدل دیتی ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ اس خطبہ میں خصوصاً اور دوسرے خطبات میں عموماً علامہ اقبال نے اسلامی قانون کا ایک ایسا دقیق اور غامض فلسفہ بیان کیا ہے کہ اگر وہ اجتہاد کے ذریعے متشکل اور متشخص ہو جاتا اور اس کی عملی تشکیل بھی ہو جاتی ہے تو وہ دنیا میں ایک عظیم انقلاب برپا کر دیتا لیکن صد حیف وہ جس نے خود اپنے متعلق کہا تھا۔

از تب و تابم نصیب خود بگیر

بعد ازیں ناید چو من مرد فقیر

وہ صرف ایک شاعر، ایک آرٹسٹ اور ایک فلسفی ہو کر رہ گیا اور جو تب و تاب اس کی ہستیٔ بے قرار کا جوہر تھا، اس پر کسی کی نگاہ نہ گئی۔ آج جب کہ برصغیر ہندو پاک میں اقبال صدی تقریبات بڑے اہتمام اور شان و شوکت سے منائی جا رہی ہیں کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ اقبال کے فکر کے اس اہم پہلو پر بھی توجہ کی جائے، اور ایک ادارہ صرف اسی مقصد کے لیے قایم کیا جائے کہ پہلے اقبال کے فلسفۂ قانون اسلامی کا وسیع اور عمیق مطالعہ ان کے پورے مجموعہ نثر و نظم کی روشنی میں کرے اور پھر اس کی بنیاد پر تدوین فقہ جدید کا کام کرے۔ یہ نہایت وسیع اور کٹھن ہے لیکن ضروری ہے اور اقبال کے ساتھ عقیدت و ارادت کا حق صحیح اسی وقت ادا ہو سکتا ہے ۔۔۔

حضرت ام حبیبہ، اُم المومنین حضرت جویریہ، ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہن کے علاوہ حضرت فاطمۃ الزہرار، حضرت ام عطیہ، حضرت اسمار بنت ابوبکر، حضرت ام شریک، حضرت ام الدردار، حضرت عاتکہ بنت زید، حضرت فاطمہ بنت قیس، حضرت لیلیٰ بنت قائف، حضرت حولار بنت تویت، حضرت سہلہ بنت سہیل، حضرت ام سلمہ، حضرت زینب بنت ام سلمہ، حضرت ام ایمن، حضرت ام یوسف، حضرت غامدیہ رضی اللہ عنہن شامل ہیں، جن میں بعض تابعیات میں سے ہیں، [۱]

اس تصریح کی رو سے ایک سو تیس (۱۳۰) فقہائے صحابہ میں سے بائیس (۲۲) فقیہات ومفتیات ہیں جن میں سے ایک کے فقہی مسائل اور فتاویٰ ضخیم جلدوں، متوسط کتابوں اور مختصر اجزار میں مرتب ہوسکتے ہیں اور جن کے تفقہ اور فقہی آرار کی مقبولیت وشہرت صحابہ وتابعین کے زمانہ میں عام تھی، اس مضمون میں ان ہی فقیہات ومفتیات کا مختصر تعارف مقصود ہے، جس میں ان کی فقہی حیثیت کو نمایاں طور پر بیان کیا گیا ہے، ان فقیہات اسلام اور مفتیات امت میں ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا نام سرفہرست ہوتا اگر وہ قدیمۃ الوفات نہ ہوتیں، ہم بطور تبرک ان کا مختصر حال لکھتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ ابتدار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کو ان سے جس قدر تقویت پہونچی کسی سے نہیں پہونچی، اور وہ مکّی دور کے اسلامی احکام کی عالمہ وفاضلہ تھیں

ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رض

ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ بنت خُویلد رضی اللہ عنہا ابتدار میں عتیق بن عائذ کے نکاح میں تھیں، پھر ابوہالہ نباش بن زرارہ اُسیدی کے نکاح میں آئیں، ان سے ھند بن ابوہالہ پیدا ہوئے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ربیب یعنی پروردہ تھے، اس کے بعد حضرت خدیجہ کی تیسری شادی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی، عام روایت کے مطابق اس وقت حضرت خدیجہ رض کی عمر چالیس سال کی تھی جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف پچیس سال کے تھے، حضرت

---

[۱] اعلام الموقعین ج ۱ ص ۹، ۱۰، ۱۱،

کیے جاتے تھے، کتاب وسنّت کی روشنی میں افتار کا کام کرتے تھے، بعض احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص خاص صحابہ کے علمی کمالات کو بیان فرما کر مسلمانوں کو ان سے استفادہ کی تلقین فرمائی ہے، دوسری صدی کے نصف اول تک فقہ و فتویٰ کا یہی حال رہا حتی کہ ۱۴۰ھ اور ۱۵۰ھ کے درمیان پورے عالم اسلام میں فقہی ترتیب و تبویب پر باقاعدہ احادیث کی تدوین ہوئی اور علمائے اسلام نے اس انداز پر کتابیں لکھیں، اس دور سے پہلے احادیث و فقہ کے حاملین اپنے اپنے طور پر تحدیث وافتار کی خدمت انجام دیتے تھے جن میں مردوں کی طرح عورتیں بھی شامل تھیں۔

چنانچہ امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اعلام الموقعین میں لکھا ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم کے جن صحابۂ کرام سے فقہی مسائل و فتاوے منقول و محفوظ کیے گئے ہیں، ان کی تعداد ایک سو تیس ۱۳۰ سے زائد ہے، ان میں مرد اور عورتیں سب ہی شامل ہیں، پھر ان کے حسب ذیل تین طبقات قائم کر کے ہر طبقہ کے فقہار و مفتیین کی طرح فقیہات و مفتیات کے نام درج کیے ہیں۔

طبقۂ مکثرین میں سات اجلۂ صحابہ ہیں جن کے فتاوے اگر مدوّن و مرتّب کیے جائیں تو ہر ایک صحابی کی ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے، چنانچہ خلیفہ مامون کے پرپوتے ابوبکر محمد بن موسیٰ بن یعقوب بن امیر المومنین مامون نے ان میں سے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے فتاوے بیس جلدوں میں مرتّب کیے تھے۔ اس طبقۂ علیا میں فقیہۂ امت ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی شامل ہیں۔

طبقۂ وسطیٰ میں تیرہ فقہائے صحابہ ہیں جن میں سے ہر ایک کے فتاوے مختصر کتاب میں آسکتے ہیں، ان میں ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بھی ہیں۔

طبقۂ سفلیٰ میں باقی حضرات ہیں، ان میں سے ہر ایک کے فتاوے ایک ایک جزء میں جمع کیے جا سکتے ہیں، ان میں ام المومنین حضرت صفیہؓ، ام المومنین حضرت حفصہؓ ام المومنین

کرتے تھے، ابوسلمہ عبدالرحمٰن کا قول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث وسنن، فقہی آراء، آیت کی شانِ نزول اور فریضہ کے بارے میں اگر سوالات ومعلومات کی ضرورت پڑی ہے تو میں نے حضرت عائشہ سے بڑا عالم نہیں دیکھا، عطاء بن ابی رباح نے شہادت دی ہے کہ حضرت عائشہ رض افقہ الناس، احسن الناس اور عام باتوں میں اعلم الناس تھیں، محمود ں لبید نے بیان کیا ہے۔

کان ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم یحفظن من حدیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم کثیراً، ولا مثلاً لعائشۃ وام سلمۃ، وکانت عائشۃ تفتی فی عہد عمر وعثمان الی ان ماتت یرحمہا اللہ وکان الاکابر من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمر وعثمان بعدہ یرسلان الیہا فیسأ لانہا عن السنن

عام طور سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات آپ کی حدیثوں کو بہت زیادہ یاد رکھتی تھیں مگر حضرت عائشہ اور حضرت ام سلمہ اس بارے میں سب سے آگے تھیں، اور حضرت عائشہ حضرت عمر اور عثمان کے دور خلافت میں فتویٰ دیا کرتی تھیں حتیٰ کہ وصال تک فتویٰ دیتی رہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اکابر صحابہ حضرت عمر اور حضرت عثمان ان کی خدمت میں آدمی بھیج کر ان سے احادیث وسنن کے متعلق سوالات کیا کرتے تھے،

اسی کو امام زہری نے مختصر طور سے یوں بیان کیا ہے۔

لو جمع علم عائشۃ الی علم جمیع ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم وعلم جمیع النساءِ لکان علم عائشۃ افضل،

اگر تمام ازواج مطہرات کا علم بلکہ تمام مسلمان عورتوں کا علم جمع کیا جائے اور اس کے مقابلہ میں حضرت عائشہ کا علم جمع کیا جائے تو ان کا علم سب سے اعلیٰ وافضل ہوگا۔

ہشام بن عروہ کا قول ہے کہ فقہ، طب اور شعر میں حضرت عائشہ سے بڑا عالم میں نے نہیں دیکھا، ہشام کے والد حضرت عروہ بن زبیر بات بات پر اشعار پڑھنے کے عادی تھے

ابراہیم بن ماریہ قبطیہ کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام اولاد حضرت خدیجہ کے بطن سے تھی، یعنی حضرت قاسمؓ حضرت طاہرؓ، حضرت طیبؓ، حضرت فاطمہؓ حضرت زینبؓ حضرت رقیہؓ اور حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہم وعنہنّ یہ سب حضرت خدیجہ سے ہیں، وہ مکہ مکرمہ کی مالدار ترین عورت تھیں، تجارتی کاروبار بہت اونچے پیمانہ پر کرتی کراتی تھیں، زمانہ جاہلیت میں اعلیٰ کردار کی وجہ سے طاہرہ کے لقب سے مشہور تھیں، نہایت عاقلہ فاضلہ اور معززہ و محترمہ خاتون تھیں، وہ پہلی مسلمان ہیں جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاکر اپنا سب کچھ اسلام پر وقف کردیا، اور چوبیس سال چھ ماہ تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفیقۂ حیات رہیں اور اپنی دولت، اثر ورسوخ اور فہم وفراست سے کام لے کر مکی دور میں ہر نازک موقع پر اسلام کے لیے سپر بنی رہیں، قدیمۃ الوفاۃ ہونے کی بنا پر وہ فقیہات ومفتیات کے طبقہ میں شمار نہ ہوسکیں مگر واقعہ یہ ہے کہ ان کی ذات اس طبقہ کے لیے سرنامہ وعنوان ہے اور بناتِ اسلام کے دینی اور علمی کارناموں کی حسین داستان میں وہ زیب عنوان ہیں،

(۱) ام المومنین حضرت عائشہؓ

ام المومنین حضرت عائشہ بنت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہا "فقیہہ امت" کے لقب سے مشہور رہیں، فقہ، حدیث فرائض، احکام، حلال وحرام، اخبار واشعار، طب وحکمت غرض کہ بہت سے علوم کی جامع اور اپنے زمانہ میں ان علوم میں سب سے آگے تھیں، ان کی فقاہت اور جامعیت اجلہ صحابہ میں مسلم تھی، اور سب ہی حضرات ان کے علم وفضل، اصابت رائے، اور دینی علم میں تبحّر کے قائل تھے، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کا بیان ہے کہ صحابہ جس بات میں شک وشبہ کرکے حضرت عائشہ کی طرف رجوع کرتے اس کے بارے میں ان کے پاس صحیح علم پاتے تھے، امام زہریؒ کا بیان ہے کہ حضرت عائشہ اعلم الناس یعنی سب لوگوں سے زیادہ علم رکھتی تھیں اور اکابرِ صحابہ ان سے علمی اور دینی باتیں دریافت کیا کرتے تھے، امام مسروقؒ نے کہا ہے کہ خدا کی قسم میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے مشائخ اور اکابر کو دیکھا ہے کہ وہ حضرت عائشہ سے فرائض کے بارے میں سوال

بھتیجے قاسم بن محمد بن ابوبکرؓ اور عبداللہ بن محمد بن ابوبکرؓ دونوں بھتیجی حفصہ بنت عبدالرحمٰن ابن ابوبکر اور اسماء بنت عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ دونوں بھانجے عروہ بن زبیر بن عوامؓ اور عبداللہ بن زبیر بن عوامؓ (یہ دونوں حضرات اسماء بنت ابوبکر کے صاحبزادے ہیں) بھانجی عائشہ بنت طلحہؓ، عبداللہ بن ابوعتیق محمد بن عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ عباد بن حبیب بن عبداللہ ابن زبیرؓ عباد بن حمزہ بن عبداللہ بن زبیرؓ موالی یعنی غلام ابو یونسؓ ذکوانؓ ابوعمرو ابن فروخ۔

اور صحابہ میں سے عمرو بن عاصؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ، زید بن خالد جُہنیؓ، ابوہریرہؓ عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عباسؓ، ربیعہ بن عمرو جرشیؓ، سائب بن یزیدؓ، حارث بن عبداللہ بن نوفلؓ وغیرہ، اور اکابر تابعین میں سے سعید بن مسیّبؓ، عبداللہ بن عامر بن ربیعہ، صفیہ بنت شیبہؓ، علقمہ بن قیس، عمرو بن میمون، مطرف بن عبداللہ بن شخّیر، ہمام ابن حارث، ابوعطیہ وادعی، ابوعبیدہ بن عبداللہ بن مسعود، مسروق بن اجدع، عبداللہ ابن عکیم، عبداللہ بن شدّاد بن ہاد، عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام، ان کے دونوں صاحبزادے ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارث اور محمد بن عبدالرحمٰن بن حارث، ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوف، اسود بن یزید نخعی، ایمن مکی، ثمامہ بن حزن قشیری، حارث بن عبداللہ بن ربیعہ، حمزہ بن عبداللہ بن عمرؓ، خبّاب صاحبِ مقصورہ، سالم بن سبلان، سعد بن ہشام بن عامر، سلیمان بن یسار، ابووائل، شریح بن ہانی، زر بن جبیش ابوصالح السمّان، عابس بن ربیعہ، عامر بن سعد بن ابی وقّاص، طلحہ بن عبداللہ بن عثمان، طاوس، ابوالولید عبداللہ بن حارث بصری، عبداللہ بن شقیق عقیلی، عبداللہ بن شہاب خولانی، ابن ابی ملیکہ، عبداللہ البہیّ، عبدالرحمٰن بن شماسہ، عبیداللہ بن عمیر لیثی، عراک بن مالک، عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ، عطاء بن ابی رباح، عطاء بن یسار، عکرمہ، علقمہ بن وقاص، علی بن حسین علی، عمران بن حطّان مجاہد بن جبر، کُریب، مالک بن ابوعامر اصبحی، فروہ بن نوفل اشجعی، محمد بن قیس بن مخرمہ،

لوگوں نے ایک مرتبہ از راہ تعجب ان سے کہا کہ آپ کو کس قدر زیادہ اشعار یاد ہیں تو انہوں نے بتایا کہ میری اشعار کی روایت حضرت عائشہ کی روایت کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے، ان کے سامنے جب بھی کوئی بات ہوتی تو وہ اس کے مناسب اور حسبِ حال شعر پڑھ دیا کرتی تھیں حضرت عروہ بن زبیر حضرت عائشہ کے بھانجے تھے۔ [1]

ابن قیم نے لکھا ہے کہ حضرت عائشہ کے تلامذہ واصحاب میں ان کے بھتیجے قاسم بن محمد بن ابوبکر اور بھانجے عروہ بن زبیر ان کے فقہی مسائل و آراء سے تجاوز نہیں کرتے تھے، بلکہ ان ہی کے فقہی مسلک پر عمل کرتے تھے۔ [2]

حضرت عائشہؓ نے براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سی احادیث کی روایت کی ہے، نیز اپنے والد حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت حمزہ بن عمرو اسلمی، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت جدامہ بنت وہب اسدیہ، اور حضرت فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہم سے روایت کی ہے، امام ابن حزم نے طبقہ مکثرین بالروایۃ میں گیارہ صحابہ کا ذکر کر کے ان کی مرویات کی تعداد بیان کی ہے، جن میں حضرت عائشہؓ کی احادیث کی تعداد ۲۲۱۰ بتائی ہے

امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے۔

من اکبر فقهاء الصحابة و كان فقهاء اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم يرجعون اليها تفقه بها جماعة۔ [3]	حضرت عائشہ بڑے فقہاء صحابہ میں سے تھیں اور فقہائے صحابہ دینی مسائل میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے، ایک جماعت نے ان سے فقہ حاصل کی ہے

ام المومنین حضرت عائشہ سے احادیث رسول اور ان کے فقہی آراء وفتاویٰ کی روایت کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جن میں خاص ان کے رشتہ داروں اور اہل خاندان کے نام یہ ہیں، بہن ام کلثوم بنت ابوبکر صدیق، رضاعی بھائی عوف بن حارث بن طفیل، دونوں

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۳۷۴ و ص ۳۷۵، اور استیعاب ج ۲ ص ۷۶۶۔ [2] اعلام الموقعین ج ۲ ص ۱۷۔ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۶۔

اور حضرت فاطمہؓ سے روایت کی ہے، اور ان سے حدیث کی روایت کرنے والوں میں ان کے یہ متعلقین ہیں، صاحبزادے عمر بن ابوسلمہ، صاحبزادی زینب بنت ابوسلمہ، بھائی عامر بن ابوامیہ بھتیجے مصعب بن عبداللہ بن ابوامیہ، موالی نبہان، عبداللہ بن رافع، نافع، سفینہ، ابوکثیر، ابن سفینہ وغیرہ ہیں۔

ان حضرات کے علاوہ سلیمان بن یسار، اسامہ بن زید بن حارثہ، ہند بنت حارث فراسیہ صفیہ بنت شیبہ، ابوعثمان نہدی، حمید بن عبدالرحمٰن بن عوف، ان کے بھائی ابواسامہ بن عبدالرحمٰن بن عوف، سعید بن مسیّب، ابووائل، صفیہ بنت محصن شعبی، عبدالرحمن بن ابوبکر صدیق عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام، ان کے دونوں بیٹے عکرمہ بن عبدالرحمٰن بن حارث اور ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارث، قبیصہ بن ذویب، نافع مولیٰ ابن عمر، لیلیٰ بن مملک اور دوسرے علما و فقہاء نے حضرت ام سلمہ سے روایت کی ہے[1]

(۳) ام المومنین حضرت حفصہؓ

ام المومنین حضرت حفصہ بنت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہا پہلے خنیس ابن عبداللہ بن حذافہ سہمی کے نکاح میں تھیں، ان کے انتقال کے بعد ۲ھ یا ۳ھ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حقیقی بہن ہیں۔ نہایت بزرگ اور صوّامہ قوّامہ اور صالحہ خاتون تھیں قتال مرتدین کے سلسلہ میں جنگ یمامہ کے بعد حضرت عمر کی رائے سے جو مصحف لکھا گیا وہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے بعد حضرت حفصہ ہی کے پاس رکھا گیا تھا اور انہوں نے اس اہم دینی امانت کی کما حقہ نگہداشت کی۔

انہوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور اپنے والد حضرت عمر سے حدیث کی روایت کی ہے اور ان سے روایت کرنے والوں میں یہ حضرات قابل ذکر ہیں، بھائی عبداللہ بن عمر، بھتیجے حمزہ بن عبداللہ بن عمر، صفیہ بنت ابوعبید زوجہ عبداللہ بن عمر، ام بشر انصاریہ، مطلب بن

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۴۵۶۔

محمد بن منتشر، نافع بن جبیر بن مطعم، یحیٰ بن یعمر، نافع مولیٰ ابن عمر، ابو بردہ بن ابو موسیٰ اشعری، ابو الجوزاء ربعی، ابو الزبیر مکی، خیرہ والدۂ حسن بصری، صفیہ بنت ابو عبید، عمرہ بنت عبد الرحمٰن، معاذہ عدویہ۔[1]

حافظ ابن حجر نے حضرت عائشہ کے اصحاب و تلامذہ کی یہ فہرست لکھ کر "وخلق کثیر" لکھا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ اور بہت سے علماء و فضلاء نے ان سے روایت کی ہے، ۵۷ھ یا ۵۸ھ میں فوت ہوئیں۔

(۲) ام المومنین حضرت ام سلمہ رضؓ

ام المومنین حضرت ام سلمہ بنت ابو امیہ یا سہیل کا نام ہند ہے، پہلے ابو سلمہ بن عبد الاسد کے نکاح میں تھیں، ان سے ایک لڑکی زینب اور ایک لڑکے عمر پیدا ہوئے، عمر کی پرورش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی، ۴ھ میں حضرت ام سلمہ بیوگی کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں، حدیث و فقہ میں حضرت عائشہ کے بعد حضرت ام سلمہ ہی تمام عورتوں سے زیادہ علم رکھتی تھیں، محمود بن لبید کا قول گزر چکا ہے کہ

کان ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم یحفظن من حدیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم کثیرًا، ولا مثلًا لعائشۃ وام سلمۃ[2]	ازواج مطہرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بہت زیادہ یاد رکھتی تھیں، مگر حضرت عائشہ اور حضرت ام سلمہ سب سے آگے تھیں۔

ان کے غلام (مولیٰ) شیبہ بن نصاح بن سرجس بن یعقوب اپنے زمانہ کے اہل مدینہ کے امام القراء تھے، حضرت نافع مولیٰ ابن عمر تجوید و قراءت میں ان کے شاگرد ہیں، اور ان کی باندی (مولاۃ) خیرہ امام حسن بصری کی والدہ ہیں۔[3]

حضرت ام سلمہ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اپنے پہلے شوہر ابو سلمہ بن عبد الاسد رضؓ

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵۔

[2] طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۳۷۵ [3] معارف ابن قتیبہ ص ۶۰

(۵) امّ المومنین حضرت میمونہ رضہ

ام المومنین حضرت میمونہ بنت حارث رضی اللہ عنہا پہلے ابوسبرہ بن ابورہم کے نکاح میں تھیں، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقام سَرف میں ان سے نکاح فرمایا، اور اسی مقام پر ۳۸ھ میں ان کا انتقال ہوا، ان کے موالی اور غلام یسار تھے، جن کے لڑکے عطار بن یسار، سلیمان بن یسار، مسلم بن یسار اور عبدالملک بن یسار تھے، یہ چاروں بھائی فقہائے اسلام میں سے تھے، ایک موقع پر حضرت عائشہ نے ان کے بارے میں شہادت دی کہ

اِنہا کانت من اتقانا للہ و اوصلنا للرحم۔ وہ ہم سب ازواج نبی میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والی اور صلہ رحمی کرنے والی تھیں۔

ایک مرتبہ حضرتِ میمونہ نے انار کا ایک دانہ زمین پر گرا ہوا دیکھا تو اٹھا لیا اور کہا اِنَّ اللہَ لایحب الفساد۔

انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے اور ان سے اِن حضرات نے روایت کی ہے، چاروں بھانجے عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن شداد بن ہاد، عبدالرحمٰن بن سائب، یزید بن اصم، ربیب بن عبداللہ خولانی، باندی ندبہ، موالی عطار بن یسار اور سلیمان بن یسار، ابراہیم بن عتبہ عبداللہ بن معبد بن عباس، کریب مولی ابن عباس، عبید ہ بن سباق، عبیداللہ بن عبداللہ ابن عتبہ، عالیہ بنت سبیع وغیرہ [1]

(۶) ام المومنین حضرت جویریہ رضہ

ام المومنین حضرت جُویریہ بنت حارث بن ابوضرار رضی اللہ عنہا پہلے مسافع بن صفوان کے نکاح میں تھیں، بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں آئیں، وہ ایک غزوہ میں قیدیوں کے ساتھ آئی تھیں، جب صحابۂ کرام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے نکاح کی خبر ہوئی تو آپس میں کہنے لگے کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار قیدی اور غلام بنائے جائیں گے؟ اس کے

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۸ ص ۱۳۹، معارف ابن قتیبہ ص ۶۱، تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۴۵۳۔

ابو وداعہ، حارث بن وہب، شتیر بن شکل، عبداللہ بن صفوان بن امیہ، سعر اعخزاعی۔ عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام، مسیب بن رافع، ابو مجلز، ان حضرات کے علاوہ رواۃ کی ایک جماعت نے ان سے روایت کی ہے، ۶۱ھ یا ۶۲ھ میں انتقال فرمایا۔[۱]

(۴) ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ — ام المومنین حضرت ام حبیبہ کا نام رملہ بنت ابو سفیان صخر بن حرب ہے، ابتدائی دور میں اسلام لائیں اور اپنے شوہر کے ساتھ ہجرت حبشہ میں شریک رہیں پہلے عبیداللہ بن جحش اسدی کے نکاح میں تھیں جن کا انتقال حبشہ میں ہوا، بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں۔

۴۴ھ میں انتقال کیا، انہوں نے آخری وقت میں حضرت عائشہ کو بلا کر کہا کہ ہمارے اور ہماری سوکنوں کے درمیان جو کچھ ہوا ہے، اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ ہم سب کو معاف فرمائے حضرت عائشہ نے اس کے جواب میں کہا کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو معاف کرے اور درگذر فرمائے۔ حضرت حفصہ نے حضرت ام حبیبہ سے کہا کہ اس گفتگو سے آپ نے مجھے خوش کر دیا اللہ تعالیٰ آپ کو بھی خوش کرے، پھر حضرت ام حبیبہ نے حضرت ام سلمہ کو بلا کر یہی بات کہی اور انہوں نے اس کے بعد میں بھی اسی قسم کی عفو و درگذر کی بات کی۔[۲]

حضرت ام حبیبہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور زینب بنت جحشؓ سے روایت کی ہے اور ان سے مندرجہ ذیل حضرات نے روایت کی ہے، صاحبزادی حبیبہ بنت عبیداللہ بن جحش اسدی، دونوں بھائی معاویہ بن ابو سفیان اور عنبسہ بن ابو سفیان، بھتیجے عبداللہ بن عتبہ ابن ابو سفیان، بھانجے ابو سفیان بن سعید بن مغیرہ بن اخنس بن شریق، دونوں موالی سالم ابن سوّار، اور ابو الجراح، ان کے علاوہ ابو صالح السمان، عُروہ بن زبیر، زینب بنت ام سلمہ، صفیہ بنت شیبہ، شہر بن حوشب وغیرہ نے ان سے روایت کی ہے۔[۳]

۱؎ معارف ابن قتیبہ ص۵۹، و تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص۴۱۱، ۲؎ طبقات ابن سعد ج ۸ ص۱۰۰ — ۳؎ تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص۴۱۹۔

فاطمہؓ اور مردوں میں حضرت علیؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب تھے، حضرت فاطمہ کے بڑے فضائل و مناقب ہیں۔ وصال نبوی کے چھ ماہ کے بعد ان کا وصال ہوا۔

انھوں نے اپنے والد ماجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی اور ان سے دونوں صاحبزادے حضرت حسن اور حضرت حسین نے براہ راست اور پوتی حضرت فاطمہ بنت حسین بن علی نے مرسل روایت کی، نیز حضرت عائشہؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت انس بن مالکؓ اور حضرت سلمیٰ ام رافع نے ان سے روایت کی ہے [1]

(۸) حضرت اسماء بنت ابوبکر صدیق رضؓ

حضرت اسماء بنت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہا کا لقب ذات النطاقین ہے۔ مکہ مکرمہ میں سترہ آدمیوں کے بعد اسلام لائیں۔ بڑی عاقلہ، فاضلہ، اور نبیہہ خاتون تھیں۔ ساتھ ہی سخاوت اور حق گوئی میں مشہور تھیں۔ ان کے صاحبزادے عبداللہ بن زبیر بن عوام نے یزید کے دور میں مکہ مکرمہ میں اپنی خلافت قائم کی تھی، حضرت اسماء سو سال کی عمر میں ۷۳ھ میں فوت ہوئیں۔ اس وقت بھی ان کی نظر اور عقل میں فتور نہیں آیا تھا، احادیث میں ان کے بھی بڑے مناقب و فضائل آئے ہیں۔

حضرت اسماء نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے اور ان سے ان حضرات نے روایت کی ہے۔ دونوں صاحبزادے عبداللہ بن زبیرؓ اور عروۃ بن زبیرؓ بھتیجے عبداللہ بن عروہ بن زبیر، بھتیجی فاطمہ بنت منذر بن زبیرؓ عباد بن حمزہ بن عبداللہ ابن زبیرؓ، عباد بن عبداللہ بن زبیرؓ، مولیٰ عبداللہ بن کیسان، صفیہ بنت شیبہ، عبداللہ بن عباس، مسلم مصری، ابونوفل بن ابوعقرب، عبداللہ بن ابی ملیکہ، وہب بن کیسان وغیرہ [2]

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۴۴۱۔ [2] تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۳۹۷۔

بعد بنو مصطلق کے تمام قیدی آزاد کر دیئے گئے، چنانچہ اس نکاح کی برکت سے ایک سو خاندان کو آزادی مل گئی۔

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز کے بعد دن چڑھے گھر میں تشریف لے گئے اور دیکھا کہ حضرت جویریہ اب تک اپنے مصلیٰ پر نماز پڑھ رہی ہیں آپ نے ان کو یہ دعا پڑھنے کی تلقین فرمائی۔ سبحان اللہِ عَدَدَ ما خَلَقَ، سبحان اللہ رضا نفسہ سبحان اللہِ زنۃ عرشہٖ، سبحان اللہ مداد کلماتہٖ۔[۱]

حضرت جویریہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے، اور ان سے ان حضرات نے روایت کی ہے، عبداللہ بن عباس، عبید بن سباق، ابو ایوب مراغی، مجاہد بن جبیر کُریب مولی ابن عباس، کلثوم بن مصطلق، عبداللہ بن شداد بن ہاد ۵۰ھ یا ۵۶ھ میں انتقال کیا۔[۲]

مذکورہ بالا امہات المومنین فقہ و فتویٰ میں خصوصی شہرت اور بصیرت رکھتی تھیں، دیگر امہات المومنین حضرت سودہ بنت زمعہ، حضرت زینب بنت جحش، حضرت زینب بنت خزیمہ حضرت ریحانہ بنت زید رضی اللہ عنہن اہل بیت رسول کی افراد اور کاشانۂ نبوت کی رہنے والی تھیں اور وہ بھی دینی علوم سے حصہ وافر رکھتی تھیں، ان سے بھی احادیث مروی ہیں، چنانچہ حدیث کی کتابوں میں ان کی مرویات اور واقعات موجود ہیں، البتہ مذکورہ چھ امہات المومنین فقہ و فتویٰ اور حدیث میں نمایاں مقام رکھتی تھیں۔

(۷) حضرت فاطمۃ الزہرا رضؓ

حضرت فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہجرت کے ایک سال بعد ہوا، ان کی اولاد میں حضرت حسن، حضرت حسین، حضرت محسن، حضرت ام کلثوم کبریٰ حضرت زینب کبریٰ رضی اللہ عنہم ہیں، حضرت عائشہ کی شہادت کے مطابق عورتوں میں حضرت

---

[۱] طبقات ابن سعد ۸ ص ۱۱۸۔ [۲] تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۴۰۷۔

ی ہے لہ

۱۱) حضرت فاطمہ بنت قیس رضہ

حضرت فاطمہ بنت قیس قرشیہ فہریہ رضی اللہ عنہا حضرت ضحاک بن قیس رضہ کی بڑی بہن ہیں،
قدیمۃ الاسلام ہیں اور انھوں نے ہجرت کے آغاز میں مدینہ منورہ کی طرف کی ہے ۔
ان کے ظاہری اور باطنی حسن وکمال اور دینی علوم میں فہم وبصیرت کے بارے میں امام ابن
عبدالبر نے تصریح کی ہے ۔

وکانت ذات جمال وعقل وکمال	وہ حسن وجمال کے ساتھ عقل وکمال رکھتی تھیں
وفی بیتھا اجتمع اصحاب الشوریٰ	حضرت عمر کی شہادت کے بعد ان کے مکان میں اصحاب
عند قتل عمر بن الخطاب رضوان اللہ عنہم	شوریٰ جمع ہوئے تھے ۔

حضرت زبیر بن عوام نے ان کو امرأۃ نجود یعنی باہمت وحوصلہ خاتون کے
لقب سے یاد فرمایا ہے ٢ہ
حضرت فاطمہ بنت قیس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے اور
ان سے قاسم بن محمد بن ابوبکر صدیق، ابوبکر بن ابوجہم ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن، سعید بن مسیب
عروہ بن زبیر بن عوام، عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن عبید بن مسعود، اسود بن یزید سلیمان
بن یسار، عبداللہ البہی، محمد بن عبدالرحمٰن بن ثوبان، عامر شعبی، عبدالرحمٰن بن عاصم بن
ثابت، اور ان کے مولیٰ تمیم نے روایت کی ہے ٣ہ

۱۲) حضرت عاتکہ بنت زید رضہ

حضرت عاتکہ بنت زید بن عمرو بن نفیل قرشیہ عدویہ رضی اللہ عنہا حضرت سعید بن زید کی بہن
ہیں، مہاجرات میں سے ہیں حسن وجمال میں مشہور اور اخلاق کی بلندی میں یکتا تھیں ۔
ان کی پہلی شادی حضرت ابوبکر صدیق کے صاحبزادے عبداللہ سے ہوئی جوان کے حسن

۱ہ تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۴۴۳، ٢ہ استیعاب ج ۲ ص ۷۷۴، ٣ہ تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۴۴۴

(۹) حضرت امّ عطیہ انصاریہ رضؓ

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا کا نام نسیبہ بنت کعب یا حارث انصاریہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوات میں شریک ہوکر زخمیوں اور مریضوں کا علاج کرتی تھیں، ان کے بارے میں ابن عبدالبر نے لکھا ہے۔

کانت من کبار نساء الصحابۃ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔	وہ صحابیات میں بڑے مقام و مرتبہ کی مالک تھیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک صاحبزادی کے انتقال پر ان کے غسل میں شریک تھیں، بعد میں غسلِ میّت میں ان کی حدیث معتبر مانی جاتی تھی اور بصرہ کے علماء و فقہاء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ صحابہ اور تابعین ان سے غسل میّت کا طریقہ سیکھتے تھے، ابن عبدالبر نے لکھا ہے:۔

حدیثہا اصل فی غسل المیت وکان جماعۃ من الصحابۃ وعلماء التابعین بالبصرۃ یاخذون عنہا غسل المیت،	ان کی حدیث میت کے غسل کے احکام میں بنیاد ہے، بصرہ کے صحابہ اور علمائے تابعین ان سے غسلِ میت کا طریقہ سیکھتے تھے۔

انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عمر سے روایت کی ہے اور ان سے حضرت انس بن مالک، محمد بن سیرین، حفصہ بنت سیرین، عبدالملک بن عمیر، اسمٰعیل بن عبدالرحمٰن ابن عطیہ، علی بن اقمر، ام شراحیل نے روایت کی ہے۔ [۱]

(۱۰) حضرت امّ شریک انصاریہ رضؓ۔

حضرت ام شریک کا نام غزیہ یا غزیلہ بنت دودان انصاریہ دوسیہ ہے، ان کے حالات میں اختلافات پائے جاتے ہیں، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے اور ان سے حضرت جابر بن عبداللہ، سعید بن مسیب، عروہ بن زبیر، شہر بن خوشب نے روایت

[۱] استیعاب ج ۲ ص۸۰۲، تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص۴۵۵۔

لا یضربها ولا یمنعها من	بھیجا تو انھوں نے شرط لگائی کہ وہ ان کو نہ
الحق، ولا من الصلوٰۃ فی	ماریں گے اور حق بات کہنے اور مسجد نبوی میں جانے
المسجد النبوی، ثم شرطت	سے نہ روکیں گے، پھر یہی شرط حضرت زبیر سے نکاح
ذالک علی الزبیر فتحیّن علیها	کے وقت لگائی، انھوں نے ایک بار یہ ترکیب
ان کمن لها لما خرجت الی	کی کہ عاتکہ نماز عشاء کے لیے نکلنے والی تھیں کہ
صلوٰۃ العشاء فلما مرت به	راستہ میں چھپ گئے اور وہ سامنے سے گزرنے
ضرب علی عجیزتها فلما	لگیں تو ان کے جسم پر ہاتھ مار دیا جب واپس
رجعت قالت انا للّٰه	ہوئیں تو انا للّٰہ پڑھ کر کہا کہ لوگ بگڑ گئے اس
فسد الناس فلم تخرج	واقعہ کے بعد پھر نماز کے لیے مسجد نبوی میں جانا
بعد[1]	بند کر دیا۔

ان تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عاتکہ اکابر صحابہ میں اپنے علم وفضل، ۔۔ت واحترام اور شان وشوکت میں اہم مقام و مرتبہ رکھتی تھیں۔

۱۲) حضرت امّ ایمن رضہ

حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا کا نام برکہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باندی ہیں، انھوں ۔۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش میں بڑی محبت وشفقت سے کام لیا ہے، ۔۔ب ان کو ماں کہہ کر پکارتے تھے، اور فرماتے تھے کہ ھذہٖ بقیۃ اھل بیتی، آپ نے ۔۔کو آزاد کر دیا تو حضرت عبید بن زید رضہ سے نکاح کر لیا اور غزوہ حنین میں ان کی شہادت ۔۔ بعد حضرت زید بن حارثہ رضہ سے نکاح کیا جن سے حضرت اسامہ بن زید رضہ پیدا ہوئے، ۔۔وہ اُحد اور غزوہ خیبر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں شریک ہو کر زخمیوں ۔۔ مرہم پٹی اور مجاہدین کو پانی پلانے کی خدمت انجام دی ہے۔

---

[1] الاصابہ ج ۸ ص ۱۳۷۔

وجمال پر فریفتہ رہا کرتے تھے، غزوۂ طائف میں ان کی شہادت کے بعد حضرت زید بن
خطاب سے شادی ہوئی، جنگ یمامہ میں ان کی شہادت کے بعد حضرت عمر بن خطاب
نے ان سے شادی کی، حضرت عمرؓ نے اس میں ولیمہ کا خاص اہتمام کیا تھا، ان کی شہا
کے بعد حضرت زبیر بن عوام نے عاتکہ سے نکاح کیا اور ان کی شہادت کے بعد حضرت علی
نے ان کو نکاح کا پیغام دیا تو انھوں نے کہلا بھیجا کہ اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
بھائی میں آپ کو قتل سے بچانا چاہتی ہوں۔ زبیر بن عوام کی شہادت کے بعد میراث
بارے میں بات چیت ہوئی تو عاتکہ نے کہا کہ آپ لوگ جو کچھ دیدیں گے بلاچون وچرا قبو
کرلوں گی، چنانچہ ان کو اسی ہزار درہم دیئے گئے جن کو قبول کر کے صلح کرلی۔ [۱]

ان کی خواہش پر حضرت عمرؓ نے ان کو مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کی اجازت دی
تھی، چنانچہ جس وقت حضرت عمرؓ مسجد نبوی میں زخمی کیے گئے۔ عاتکہ وہاں موجود تھیں
— انھوں نے حضرت عمرؓ سے نکاح کے موقع پر یہ شرط لگادی تھی کہ وہ ان کو مسجد
میں جانے اور حق بات کہنے سے نہیں روکیں گے، چنانچہ حضرت عمر نے ناپسندیدگی کے
باوجود ان کو اس کی اجازت دی تھی، بعد میں زبیر بن عوام سے یہی شرط کی اور انھوں
نے بھی مسجد نبوی میں جانے کی اجازت دی، جب عاتکہ عشاء کی نماز کے لیے مسجد میں
جاتی تھیں تو زبیر بن عوام پر بہت شاق گزرتا تھا۔ آخر رہا نہیں گیا اور ایک دن
عاتکہ سے پہلے نکل کر راستہ میں چھپ کر بیٹھ گئے جب عاتکہ راستہ سے گزریں تو ان کے جسم
پر اپنا ہاتھ مارا، اس واقعہ کے بعد انھوں نے مسجد میں جانا بند کر دیا [۳]

حافظ ابن حجر نے اصابہ میں امام ابن عبدالبر کی التمہید کے حوالہ سے ان واقعات کو
اختصار کے ساتھ یوں نقل کیا ہے۔

ان عمر لما خطبها شرطت عليه ان جب حضرت عمرؓ نے حضرت عاتکہ کو شادی کا پیغام

---

[۱] استیعاب ج ۲ ص ۷۶۹ و ۷۷۰، [۲] طبقات ابن سعد ج ۸ ص ۲۶۵ [۳] اسد الغابہ ج ۵ ص ۴۹۸ و ۴۹۹

تذکرہ "اشاراتِ بینش"

(۱)

ڈاکٹر شریف حسین قاسمی، دہلی یونیورسٹی

ہندوستان میں فارسی کے بے شمار تذکرے لکھے گئے ہیں۔ لیکن مقابلتاً دیکھا جائے تو ۱۲۲۰ھ/۱۸۰۶ء سے ۱۲۷۵ھ/۱۸۵۷ء کے تقریباً ستاون سال کے عرصے میں جتنے تذکرے فارسی زبان میں لکھے گئے ہیں، تذکروں کی اتنی بڑی تعداد، گزشتہ زمانے میں اتنے قلیل عرصہ میں شاید کبھی معرضِ وجود میں نہیں آئی۔ ڈاکٹر علی رضا نقوی نے اپنی کتاب "تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان"[۱] میں اس عرصہ میں لکھے جانے والے سترہ، فارسی کے اُن تذکروں کا ذکر کیا ہے جن میں صرف فارسی شعرا کا حال بیان کیا گیا ہے۔ یہ تعداد ان تذکروں کی ہے جن کے متعلق معلومات آسانی سے دستیاب ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس فہرست میں وہ تذکرے شامل نہیں جو اردو شعرائے کے بارے میں ہیں، لیکن فارسی زبان میں لکھے گئے ہیں۔

"اشاراتِ بینش" اسی انیسویں صدی عیسوی کے نصف اوّل کے اکثر[۲] شعرا کا مختصر تذکرہ ہے جسے سید مرتضیٰ متخلص بہ بینش نے تالیف کیا ہے۔ اس تذکرہ میں فارسی کے وہ بیشتر شعرا شامل ہیں جو دربار کرناٹک (جنوبی ہند) سے وابستہ تھے۔

مصنّف کے حالاتِ زندگی

اشاراتِ بینش کے مؤلف، سید مرتضیٰ بینش، اپنے زمانے کے ایک باحیثیت فارسی شاعر اور نثر نگار

۱۔ چاپ تہران۔ ۱۹۶۴ء ۲۔ ایوانف نے یہ تعداد ۶۹ (انہتر) بتائی ہے جو درست نہیں۔ ایشیاٹک سوسائٹی کیٹلاگ، ایوانف ج ۲، ص ۶۸

حضرت ام ایمن وصال نبوی پر بہت زیادہ روئی تھیں، لوگوں نے روکا تو کہا کہ مجھے معلوم تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوگا۔ میں اس لیے رو رہی ہوں کہ اب آسمان سے وحی الٰہی کا سلسلہ بند ہوگیا اور ہم نزول وحی سے محروم ہوگئے [۱] حضرت ابوبکرؓ اپنے دور خلافت میں حضرت عمرؓ سے کہا کرتے تھے کہ آؤ ام ایمن کی زیارت کو چلیں جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے یہاں تشریف لے جایا کرتے تھے۔

انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے اور ان سے حضرت انس ابن مالک، حنش بن عبداللہ صنعانی، ابویزید مدنی وغیرہ نے روایت کی ہے، خلافت عثمانی کی ابتداء میں انتقال کیا۔ [۲]

(۱۴) حضرت حولاء بنت تویت رضؓ

حضرت حولاء بنت تویت بن حبیب بن اسد قرشیہ اسدیہ رضی اللہ عنہا نے اسلام لانے کے بعد ہجرت کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت بھی کی [۳] عہد رسالت میں زہد و عبادت میں اپنی مثال آپ تھیں ابن حزم نے تصریح کی ہے۔

الحولاء بنت تویت المنقطعۃ فی الزھد ایام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم [۴] حولاء بنت تویت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں زہد و تقویٰ میں بے مثال تھیں۔

وہ رات بھر جاگتی اور عبادت کرتی تھیں، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر لگی تو آپ نے فرمایا کہ جب تک تم لوگ عبادت اور دعا کرنے سے نہیں اکتاتے ہو اللہ تعالیٰ اجر و ثواب دینے اور دعا قبول کرنے سے نہیں گھبراتا ہے اسی قدر عمل کے مکلف جس کی طاقت رکھتے ہو، وہ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ کے پاس سے گزریں اتفاق سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی موجود تھے، حضرت عائشہ نے کہا کہ یہ حولاء بنت تویت ہیں جن کے متعلق مشہور ہے کہ رات بھر جاگتی اور عبادت کرتی ہیں، اس پر آپ نے فرمایا کہ تم لوگ جس قدر عمل کر سکتے ہو اسی قدر کیا کرو [۵]

(باقی)

---

[۱] طبقات ابن سعد ج ۸ ص ۲۲۳، [۲] تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۴۵۹، [۳] طبقات ابن سعد ج ۸ ص ۱۴۴
[۴] جمہرۃ انساب العرب ابن حزم ص ۱۱۸، [۵] اسد الغابہ ج ۵ ص ۴۳۲، اصابہ ج ۸ ص ۵۶۔

جب نواب محمد علی خاں نے امام علی موسیٰ رضا کے روضہ کی زیارت کا عزم کیا تو موصوف نے "یا علی موسیٰ رضا" (۱۲۳۸ھ) سے تاریخ نکالی اور اس مادۂ تاریخ کو چاندی کی ایک تختی پر کندہ کرا کر نواب کی خدمت میں پیش کیا۔

بینش کے بڑے بھائی میر مہدی الحسینی متخلص بہ ثاقب کا شمار بھی اس دور کے علماء و شعراء میں ہوتا تھا۔ ثاقب، بینش سے تین سال بڑے تھے[1] اور نواب غلام محمد غوث خاں اعظم نواب والا جاہ پنجم کے دربار سے وابستہ تھے۔ نواب اعظم نے جب ایک "مجلس مشاعرہ[2]" کا اہتمام کیا تو ثاقب اس میں برابر شرکت کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ثاقب کا مدراس میں ایک مدرسہ بھی تھا جہاں یہ درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے[3]۔

بینش نے بارہ برس تک اپنے والد سے فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد عربی میں "شرح ملا جامی" تک اور فارسی کی مروّج کتابیں اس دور کے دوسرے اساتذہ سے پڑھیں[4]۔ بینش نے اپنے تین اساتذہ کا نام اپنے تذکرہ "اشارات بینش" میں لکھا ہے۔ ایک مولوی محمد حسن علی ماہلی ہیں، جن سے انہوں نے وقائع گولکنڈہ[5] کے چند سبق پڑھے[6]۔ دوسرے مولوی میران محی الدین قادری واقف ہیں، جنہوں نے مظہر جان جاناں (متوفی: ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۰ء) کے دیوان کے کچھ حصّے اور بیدل کے چند رقعات انہیں پڑھائے[7]۔ تیسرے محمد قادر علی ناطقی بیہوش تھے، جن کی خدمت میں مؤلف تذکرۂ اشارات بینش نے ابیات مغلقہ اساتذہ پڑھے[8]۔

شعرگوئی میں، بینش نے ابتدا میں اپنے والد اور بڑے بھائی ثاقب سے استفادہ کیا

---

[1] اشارات بینش، ص ۱۶ [2] ایضاً: مقدمہ نواب اعظم نے یہ مجلس مشاعرہ ۱۲۶۲/۴۶-۱۸۴۵ میں تشکیل دی۔ [3] ایضاً ص ۱۶؛ نتائج الافکار: ص ۱۳۸۔ [4] ایضاً: ترجمۂ بینش

[5] اس کے دوسرے نام وقائع حیدرآباد اور وقایع نعمت خان عالی ہیں۔ [6] اشارات بینش ص ۱۸

[7] ایضاً: ص ۴۴۔ [8] ایضاً: ترجمۂ بیہوش۔

تھے، مؤلف کے حالاتِ زندگی خود ان کے تذکرہ، اشاراتِ بینش، کے سوا، دیگر ہم عصر اور بعد کی تالیفات سے دستیاب ہو جاتے ہیں۔

بینش[1] کے والد کا نام میر صادق الرضوی الحسینی المدراسی (متوفی: ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷-۸ء) اور تخلص صادق تھا۔ بینش "چیناپٹن" کے مقام پر ۱۲۲۶ھ/۱۸۱۱ء میں پیدا ہوئے۔ مادۂ تاریخ ولادت، 'آفتاب سپہر سیادت'[2]، ہے۔ چند واسطوں سے ان کا خاندانی سلسلہ امام حسین سے ملتا ہے[3]۔ بینش کا آبائی وطن مشہد ہے، جہاں سے ان کے بزرگ گلبرگہ آکر قیام پذیر ہوئے۔ ان بزرگوں میں حضرت شاہ ابراہیم مصطفوی الحسینی[4] خواجہ بندہ نواز سید محمد گیسو دراز (۷۲۱ھ/۱۳۲۱ء — ۸۲۵ھ/۱۴۲۱ء) کے ماموں تھے۔ شاہ ابراہیم کی اولاد میں، شاہ نور اللہ حسینی، نواب سعادت اللہ خاں (متوفی: ۱۱۴۶ھ/۱۷۳۳-۳۴ء) کے دورِ حکومت میں کرناٹک (جنوبی ہندوستان)، پہنچے اور محمد پور (آرکاٹ)، میں مستقل قیام اختیار کیا۔ فرانسیسیوں کے فتنہ و فساد میں، نور اللہ حسینی، جیت پیٹھ، کے مقام پر قتل کر دیئے گئے۔ ان کے لڑکے شاہ ابراہیم حسینی، نواب والاجاہ محمد علی خان بہادر (۱۱۶۲-۶۳ھ/۱۷۴۹ء — ۱۲۰۹-۱۰ھ/۱۷۹۵ء) کے عہدِ حکومت میں 'چیناپٹن' منتقل ہو گئے اور نواب مذکور کی "سادات نوازی" نے انہیں یہاں مستقل قیام پر مجبور کر دیا۔ شاہ ابراہیم حسینی، مؤلفِ تذکرۂ ہٰذا کے حقیقی دادا ہوتے ہیں[5]۔

بینش، کے والد نواب عظیم الدولہ بہادر رحمت مآب نواب کرناٹک (۱۲۲۴ھ/۱۸۰۹ء — ۱۲۳۴-۳۵ھ/۱۸۱۹ء) کے دربار میں ملازم تھے۔ یہ تاریخ گوئی میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔

---

[1] مؤلف کے بیشتر حالاتِ زندگی "اشارات بینش" سے ماخوذ ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے حالاتِ زندگی کے لیے رجوع کریں: نتائج الافکار: ص ۱۲۲-۱۲۴؛ صبح وطن: ص ۳۸-۳۹؛ گلزار اعظم: ص ۱۱۹-۱۲۰؛ صبح گلشن: ص ۷۵؛ سخنوران بلند فکر: ص ۱۵۰-۱۵۸؛ محبوب الزمن: ص ۳۰۵۔ —— [2] اشاراتِ بینش (قلمی) ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری —— شمارہ: ۶۰۔ —— [3] صبح گلشن: ص ۷۵۔ [4] صبح گلشن: ص ۷۵؛ اور محبوب الزمن: ص ۳۰۵ میں مصطفوی کے بجائے مصطفیٰ لکھا گیا ہے۔ [5] اشاراتِ بینش: ص ۱۶؛ نتائج الافکار: ص ۱۳۸۔

بینش ایک مرتبہ ۱۲۶۴ھ/ ۴۸-۱۸۴۷ء میں روزگار کی تلاش میں آرکاٹ بھی گئے۔[۱] اسٹوری نے بینش کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ ۷۶-۱۲۷۵ھ/ ۱۸۵۹ء میں ایک مدرسے میں درس دیتے تھے۔ بگمان غالب یہ وہی مدرسہ ہے جو بینش کے بھائی ثاقب کے زیر نگرانی تھا۔ اسٹوری نے دوسری بات جو بینش کے بارے میں لکھی ہے، اس سے بینش کی شہرت، علمیت اور ادبی مقام کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسٹوری کے بقول، عظیم جاہ محمد علی خاں سراج الامراء بہادر نائب نواب کرناٹک (۱۲۴۱-۱۲۵۹ھ/ ۱۸۲۵-۱۸۴۳ء)، ہندوستان کی عام تاریخ مرتب کرانا چاہتے تھے جس کا نام "عظیم التواریخ" تجویز ہوا۔ یہ تاریخ مولوی صبغت اللہ مخاطب بہ عظیم نواز خاں بہادر معتمد جنگ کی نگرانی میں لکھی جا رہی تھی۔ کام چونکہ طویل تھا، ایک شخص کے بس کی بات نہ تھی، اس لئے اس کی ذمہ داری مختلف دانشوروں کو سونپ دی گئی، ان علماء میں رضا صاحب معروف بہ حکیم باقر حسین خان بہادر سب سے زیادہ قابلِ ذکر ہیں۔ رضا صاحب نے عظیم التواریخ کی تکمیل کے لیے نواب سعد اللہ خاں (متوفی: ۱۱۴۵ھ/ ۴۳-۱۷۴۲ء) سے اپنے دور تک کی تاریخ لکھنے کی ذمہ داری قبول کی۔ بدقسمتی سے رضا صاحب اپنا کام ختم کیے بغیر اس دنیا سے رخصت ہوئے اور ان کی جگہ بینش کا انتخاب کیا گیا۔ بینش نے سیاسی تاریخ فراہم کرنے کا ذمہ لیا۔ لیکن نواب موصوف کی ناگہانی موت کی وجہ سے یہ تاریخ مکمل نہ ہو سکی۔[۲]

جس زمانہ میں بینش "مجلس مشاعرہ" کے رکن تھے، اسی دوران ۱۲۶۵ھ/ ۴۹-۱۸۴۸ء میں انہیں "عتباتِ عالیہ" کی زیارت کا شوق پیدا ہوا۔ اپنے مربی "نواب غوث خان اعظم" سے تین سال کی رخصت حاصل کی اور اہل و عیال کے ہمراہ نجف اشرف کے لیے روانہ ہو گئے۔[۳] انہیں سفر میں بڑی زحمت اٹھانا پڑی، بہرکیف کسی طرح کربلا پہنچے اور یہیں داعی اجل کو لبیک کہا۔ بینش کو روضۂ [امام] کے صحن میں سپرد خاک کر دیا گیا اور اس طرح ان کی برسوں پرانی دلی آرزو پوری ہوئی جس کا اظہار انہوں نے اس شعر سے ہوتا ہے:

---

[۱] بینش نے نواب اعظم سے اجازت حاصل کرنے کے لیے ان (باقی حاشیہ صفحہ ۵۴ پر)

اور اس کے بعد، واقف نے ان کی راہ نمائی کی[1]

بینش نے اپنی شاعری کی ابتداء، ایک تاریخی قطعہ سے کی۔ بینش تیرہ سال کے تھے کہ نواب غلام محمد غوث خان اعظم کی ولادت ہوئی اور بینش نے مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ کہا۔[2]

شدہ طالع چو نیّرِ اعظم ماحیِ ظلمت از جہاں آمد

سالِ مولودش از فلک جستم گفت "خورشید لازوال آمد"

اس طرح بینش کی شاعری اور ان کے مربی، نواب غلام محمد غوث خان اعظم ہم عمر ہوئے

اس قطعہ کے علاوہ بینش کے اور دوسرے متعدد تاریخی قطعات، اشاراتِ بینش میں موجود ہیں۔ نتائج الافکار کی تکمیل کی تاریخ بھی بینش نے کہی تھی جو مطبوعہ "نتائج الافکار" کے آخر میں موجود ہے۔ ان تاریخی قطعات سے پتہ چلتا ہے کہ بینش کو تاریخ گوئی میں اپنے والد کی طرح ملکہ حاصل تھا۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد، مؤلف کی مصروفیات کے بارے میں تفصیل سے اطلاعات نہیں مل سکیں۔ اشاراتِ بینش کے مقدمہ میں مؤلف نے اتنا لکھا کہ نواب محمد غوث خان کی تخت نشینی (۱۲۶۲ھ/۴۶-۱۸۴۵ء) تک وہ ایسے ناسازگار حالات سے دوچار تھے کہ شعر گوئی کی طرف مائل نہ ہو سکے، چوں کہ خود مؤلف کے بقول شعر گوئی کے لیے، فرصت شائستہ اور خاطر جمعی کا ہونا لازمی ہے۔[3]

مؤلف کے ایک دوسرے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے بھائی کے مدرسے میں ان کے ساتھ درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔[4] اس کے علاوہ، نواب محمد غوث خان اعظم نے اپنی تخت نشینی کے بعد ایک "مجلس مشاعرہ" کی تنظیم کی۔ اس وقت بینش سیر و سیاحت کی غرض سے حیدرآباد میں تھے۔ نواب نے انہیں مجلس مشاعرہ میں حاضر ہونے کا حکم بھیجا اور بینش حیدرآباد سے لوٹ آئے اور مجلس میں شریک ہو گئے۔[5] حیدرآباد میں بینش کا یہ قیام دو ماہ سے زیادہ طویل نہ تھا۔[6]

---

[1] گلزارِ اعظم، ص ۱۱۹ [2] اشاراتِ بینش، ترجمہ بینش [3] ایضاً، ص ۲۳ [4] اشاراتِ بینش، مقدمہ؛ اس کے برخلاف نواب اعظم نے لکھا ہے کہ جب مجلس مشاعرہ کا انعقاد عمل میں آیا، اسوقت بینش حیدرآباد میں تھے اور محض اس مجلس کی خبر سن کر وہ فوراً لوٹ آئے۔ گلزارِ اعظم، ص ۱۱۹ [5] ایضاً، ص،

مرزا غالب کی فارسی دانی

جناب پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر ایم اے، پی ایچ ڈی۔ صدر شعبۂ فارسی و اردو سینٹ زیویرس کالج بمبئی

(۲)

(دسمبر ۱۹۸۲ء کے برہان میں گنجائش نہ رہنے کی وجہ سے دو صفحات مجبوراً روک دینا پڑے تھے، جن کو معذرت کے ساتھ اس بار شریکِ اشاعت کیا جا رہا ہے۔ (برہان)

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ غالب کی شہرت کا باعث صحیح معنوں میں ان کی اردو شاعری اور ان کے اردو خطوط ہیں لیکن اپنی فارسی دانی کے زعم میں وہ اپنے لئے باعث ننگ تصور کرتے تھے۔

فارسی بین تا بہ بینی نقش ھای رنگ رنگ　بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ منست

نیست نقصان یک دو جزاست از سواد ریختہ　کان وزم برگی ز نخلستان فرہنگ من است

اپنی عربی کے بارے میں لکھتے ہیں: "میں عربی کا عالم نہیں مگر نرا جاہل بھی نہیں بس اتنی سی بات کہ اس زبان کے لغت کا محقق نہیں ہوں۔ فارسی کے قواعد و ضوابط میرے ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں جس طرح فولاد میں جوہر" بقول سید غلام علی وحشت: "اگر یہ شخص (غالب) عربی کی طرف متوجہ ہوتا تو عربی شعر میں دوسرا متنبی یا ابوتمام ہوتا اور انگریزی زبان کی تکمیل کرتا تو انگلستان کے مشہور شاعروں کا مقابلہ کرتا۔"

غالب کو علم نجوم میں بھی کافی دستگاہ حاصل تھی اور اگرچہ "طبیب نہیں تجربہ کار ضرور ہوں" سے یہ ثابت ہے کہ وہ علم طب بھی جانتے تھے۔ اپنی تحصیلات سے متعلق فرماتے ہیں ؎

ہمچو من شاعر و صوفی و نجومی و حکیم　نیست در دہر قلم مدعی و نکتہ گو است

غالب کو جہاں چوسر اور شطرنج کھیلنے کی عادت تھی وہاں کتب بینی کا بھی شوق تھا۔ لیکن یہ مشہور ہے کہ جامی کی طرح غالب بھی کتابیں دوسروں سے مستعار لیتے اور بعد میں لوٹا دیتے۔ بقول غالب "میں تو کتاب کو دیکھ لیتا ہوں، مول نہیں لیتا۔"

بینش بہ کربلاست، بیاد تو یاحسین — پابند گرچہ ہست بہ ہندوستاں ہنوز[ل۵]

بینش ایک پختہ کار شاعر تھے، نواب اعظم کی "مجلس مشاعرہ" میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔

قدرت اللہ قدرت، مؤلف نتائج الافکار، بینش سے ملے تھے، قدرت ان کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"جوانیست خوش خلق و فہمیدہ و نکتہ فہم و سنجیدہ، طبع موزوں و فکر رسا دارد"[ل۶]

بینش کے محسن نواب محمد غوث خان اعظم نے ان کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:۔

"در خوش تقریری و حاضر جوابی ہمت گماشت ... باضافۂ مشاعرہ کامیاب گردید

بر کلام ہم طرحان خود، اعتراضہا می ساخت و در جواب سوالہا می عالیشان ہم میسر واخت"[ل۷]

مزید براں، "اشارات بینش" میں، مؤلف کے بیانات سے ان کی خداداد صلاحیتوں کا علم ہوتا ہے

میر مبارک اللہ راغب کا شمار اس دور کے اساتذہ میں ہوتا تھا، بینش کے ابتدائی دور کا کلام جب کبھی راغب

کی نظر سے گذرتا، وہ بہت تعریف کرتے اور کہتے: "ایں کودک شدنی است"[ل۸]۔ مؤلف کی شاعرانہ مہارت کا اندازہ

اس امر سے بھی ہوتا ہے کہ ایک بار مؤلف موصوف نے نوشتر کی ایک غزل اپنے شاگرد علیم اللہ خاں علیم کے اصرار پر آدھے گھنٹے

میں کہی[ل۹]۔ اس غزل کے دو شعر اشارات بینش میں موجود ہیں جو ہمارے شاعر کی پختگی خیال و فکر کے شاہد ہیں۔

منکہ چوں دام بخود می پیچم — فکر تسخیر شکاری دارم

بینش از تنگی گورم غم نیست — در غمش بسکہ فشاری دارم

بینش نے اپنے شاگردوں کی فہرست نہیں دی ہے لیکن تذکرہ میں جا بجا ان کے مندرجہ ذیل شاگردوں کا ذکر۔

۱۔ خواجہ سید امیر اللہ متخلص بہ امیر۔ ۲۔ محمد عزیز الدین گہتا دیدہ۔ ۳۔ محمد حبیب اللہ نائطی ذکا۔ ۴۔ علی دوست

ذہین۔ ۵۔ محمد رحمت اللہ نائطی رسا۔ ۶۔ محمد علیم اللہ خاں علیم۔ ۷۔ محمد صبغت اللہ نائطی فرحت۔

کے دربار میں ایک بیت کا معذرت نامہ پڑھا تھا جو موصوف نے اپنے تذکرہ "گلزار اعظم" (ص: ۱۲۰-۱۲۱) میں نقل کیا

[ل۴] گلزار اعظم (ص ۱۲۰-۱۲۲)، لیکن تذکرہ محبوب الزمن میں لکھا ہے کہ "بینش ۱۲۶۵ھ میں مکہ معظمہ گئے، حج و زیارت سے مشرف

ہوئے، ایک سال بعد مدراس لوٹے اور وطن ہی میں انتقال کیا"، اس کے برعکس سخنوران بلند فکر (ص ۱۵۰) میں اس بیان کی تردید

کی گئی ہے اور گلزار اعظم کے بیان کی تائید میں لکھا ہے کہ بینش نہ حرمین شریفین گئے نہ وہاں سے واپس آئے بلکہ صحیح واقعہ یہ ہے

کہ وہ عراق گئے تھے اور کربلا میں وفات پا گئے۔

(حاشیہ صفحہ ۵۵) — [ل۵] یہ شعر گلزار اعظم میں موجود ہے ص ۱۲۲ [ل۶] نتائج الافکار: ص ۱۲۲ [ل۷] گلزار اعظم ص ۱۲۱ [ل۸] اشارات بینش: ترجمہ راغب [ل۹] ایضاً: ص ۲۵

مقصود ماز دیر و حرم جز حبیب نیست ہر جا کنیم سجدہ بداں آستاں رسد

اجمالاً غالبؔ کا کلام شعر و ادب کا سدا بہار باغ بھی ہے اور غور و فکر کی پر تمکنت ضیافت بھی، ان کے کلام میں حزن و ملال کا اظہار بھی ہے اور سکون و قرار کا پیغام بھی اور ان کی شاعری مغلیہ دور کا مرثیہ بھی ہے اور ایک نئے دور کی نوید بھی۔

مرنے سے چند روز پہلے غالبؔ اس شعر کا ورد کرتے رہے ؎

دم واپسیں بر سر راہ ہے عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے۔

غالب کھانے پینے کے بڑے شوقین تھے۔ اپنے دسترخوان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ برتنوں کے لحاظ سے یزید کا ہے لیکن مقدار کے لحاظ سے بایزید کا آم اور شراب سے بلا کی رغبت تھی۔

غالب من و خدا کہ سر انجام برشگاں — غیر از شراب و انبہ و برف آب زقند نیست

غالب از می پرستی بگذرم — غوطہ در گرداب طوفان می زنم

یہاں اس امر کا ذکر غیر از دلچسپی نہ ہوگا کہ غالب کے ایک یارِ عزیز نے لکھا کہ اب آپ بوڑھے ہوگئے ہیں شراب سے اجتناب کیجئے اور حافظ شیرازی کا یہ شعر بطور حوالہ کے لکھ دیا۔

چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیرون شد — رندو سیہ مستی در عہد شباب اولیٰ

غالب جواب میں لکھتے ہیں کہ اب وہ مکتب نشیں طفل سے گذر کر پیر ہفتاد سالہ کے واعظ بنے تم نے کئی فاقوں میں سے ایک شعر حافظ کا حفظ کیا ہے اور پھر پڑھتے اس کے سامنے ہو جس کی نظم کا دفتر حافظ کے دیوان سے دو چند سہ چند ہے اور مجموعۂ نثر جداگانہ اور یہ لحاظ بھی نہیں کرتے کہ ایک شعر حافظ کا یہ ہے اور ہزار شعر اس کے مخالف ہیں۔

صوفی بیا کہ آئینہ صاف است جام را — تا بنگری صفائی مئی لعل فام را

ساقی نگر وظیفۂ حافظ زیادہ دار — کاشفتہ گشت طرۂ دستارِ مولوی

شراب ناب خورو روی مہ جبیناں بین — خلاف مذہب آناں جمال اینان را

غالب دین اسلام کے متصوفانہ ڈھانچہ سے دور نہیں تھے۔ خدا کی ذات کو نورِ محض گردانتے ہیں اور کائنات کی ہر شے کو اس نور کا پرتو سمجھتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ مذہبی تصنع اور ریاکاری کے سخت مخالف ہیں۔

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار — ساقی و مغنی و شرابی و سرودی

زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند — حق را بسجودی و نبی را بہ درودی

حکیم سنائی کے مطابق مختلف مذاہب مختلف راہیں لیکن منزل ایک ہوتی ہے۔ غالب کا تفکر بھی اسی نظریہ کا حامل نظر آتا ہے۔

حُسنِ ازل کی جھلک، تیرا جلال و جمال
تیری زمیں جاوداں، تیرا فلک لازوال
تو ہے آپ اپنا جواب، تو ہے آپ اپنی مثال
اے حرمِ قرطبہ!
اے حرمِ قرطبہ!

(۴) بوئے وفا آج بھی، تیری ہواؤں میں ہے
حُسنِ حجاز و یمن، تیری فضاؤں میں ہے
قافلۂ حق کا سوز، تیری نواؤں میں ہے
اے حرمِ قرطبہ!
اے حرمِ قرطبہ!

(۵) ہو گئی پھر یک بہ یک، تیری زمیں آسماں
پھر ترے نقش و نگار، بن گئے عظمت نشاں
جھک گئے قدموں میں پھر حسنِ زمان مکاں
اے حرمِ قرطبہ!
اے حرمِ قرطبہ!

(۶) رہ گئی حق کی صدا، مٹ گیا باطل کا نام
بن گئی تیری غلام، کشمکش صبح و شام
عشق سے تیرا جمال، عشق سے تیرا دوام
اے حرمِ قرطبہ!
اے حرمِ قرطبہ!

(۷) چھا گیا ہر نقش پر، نورِ دلِ جبرئیل
تیری خاکِ فرش پھر، بن گئی کشتِ نخیل
آ گیا پھر لوٹ کر، عہدِ ذبیح و خلیل
اے حرمِ قرطبہ!
اے حرمِ قرطبہ!

(۸) پھر ہوئے حق آشنا، تیرے نشان حدود
پھر فضاؤں میں تری، گونجے اذانِ درود
پھر تری محراب نے دیکھے قیام و قعود
اے حرمِ قرطبہ!
اے حرمِ قرطبہ!

(۹) تیرے افق پر عیاں، ہو گیا پھر آفتاب
بن گیا تعبیرِ صدق، شاعرِ مشرق کا خواب
"روحِ امم کی حیات، کشمکشِ انقلاب
اے حرمِ قرطبہ!
اے حرمِ قرطبہ!

ادبیات

مسجد قرطبہ کی واپسی

جناب شارق میرٹھی۔ ھمیرپور

مسلمانوں نے کم وبیش آٹھ سو سال تک ہسپانیہ پر حکومت کر کے اس ملک کو اسلامی علوم وفنون کا مرکز بنایا تھا۔ یہیں سے تمام مغربی ممالک میں علم کی روشنی پھیلی مسلمانوں نے اپنے بعد یہاں فن تعمیر میں اسلامی آرٹ اور فن کے کئی نادر نمونے چھوڑے۔ مسجد قرطبہ اسلامی فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہے، جب مسلمانوں کا اخراج ہوا تو ۱۲۳۶ء میں مسجد قرطبہ کو ایک گرجا گھر میں تبدیل کر دیا گیا۔ اب آٹھ سو سال بعد اسلامی سکریٹریٹ کی تحریک پر حکومت ہسپانیہ نے اسے پھر مسلمانوں کے سپرد کر دیا ہے، آٹھ سو سال بعد ۱۱ اکتوبر ۱۹۷۴ء کو مسلمانوں نے یہاں پہلی بار نماز جمعہ ادا کی اور اذان کی آواز پھر فضائے ہسپانیہ میں گونج اٹھی۔

اس موضوع پر اقبال کی نظم شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ اقبال نے جو خواب پچاس سال پہلے دیکھا تھا، اس کی تعبیر اب نکلی ہے۔

اخبار الجمعیۃ اور دعوت میں، جب یہ خبر نظر سے گذری تو بے ساختہ یہ چند اشعار زبان پر آگئے اس نظم کی بنیاد اقبال کے اس مصرع پر قائم ہے ؎

"روح اُمم کی حیات، کشمکشِ انقلاب"

اب آپ نظم ملاحظہ فرمائیں:۔

(۱)

کہکشاں و مہر و ماہ، گنبد و دیوار و در
دیکھئے جس نقش کو، ہے وہی نا معتبر
ہاں مگر تو ہے کہ ہے، عشق سے پائندہ تر
اے حرمِ قرطبہ!
اے حرمِ قرطبہ!

(۲)

دن ترا مہرِ جمال، شب تری بدرِ منیر
نور ہے تیرا ضمیر، نور ہے تیرا خمیر
لائے کہاں سے کوئی ڈھونڈ کے تیری نظیر
اے حرمِ قرطبہ!
اے حرمِ قرطبہ!

زندگی بھی ایک وقیع اور موقر دینی ماہنامہ ہے، ایک برس سے زیادہ ہوا احمد آباد میں
یہاں کے اسلامک ریسرچ سینٹر کے زیر اہتمام ایک روزہ سیمینار اس پر ہوا تھا کہ جو تین طلاقیں
ایک ہی جملہ میں ایک ساتھ دی جائیں ان کا حکم کیا ہے؟ سیمینار کی صدارت مولانا مفتی عتیق الرحمن
عثمانی نے کی تھی اور اس میں اڈیٹر برہان کے علاوہ جن حضرات نے مقالات پڑھے تھے
ان کے نام یہ ہیں: مولانا محفوظ الرحمن، مولانا عروج قادری، شمس پیرزادہ، مولانا مختار احمد
مولانا عبد الرحمن، اور مولانا حامد علی، یہ سب مقالات بڑے سنجیدہ، علمی اور تحقیقی تھے، ان مقالات
کی اساس پر مجلس نے فیصلہ یہ کیا کہ اگر کوئی شوہر بیوی پر بیک وقت تین طلاق واقع کرتا ہے
مگر ساتھ ہی کہتا ہے کہ اُس کا مقصد تین طلاقیں دینا نہیں تھا، بلکہ ایک ہی طلاق کو موکد
کرنا تھا، یا غصہ میں یا لاعلمی میں لفظ طلاق کی تکرار ہو گئی اور وہ اس پر حلف بھی اُٹھاتا ہے
تو ان سب صورتوں میں طلاق مغلظہ بائنہ نہ ہوگی، زندگی کے اس خاص نمبر میں ایک دو
مقالات کو مستثنیٰ کر کے جن کی نقل دستیاب نہ ہو سکی، یہ سب مقالات اور سیمینار کی پوری
کارروائی یکجا کر دی گئی ہے، اب اگرچہ احمد آباد سے بھی یہ سب کچھ دیدہ زیب کتابی شکل
میں چھپ کر آگیا ہے، امید ہے کہ ارباب علم اور اصحابِ فکر و نظر اس کی قدر کریں گے۔

ماہنامہ منادی کا بابا فرید نمبر: مرتبہ جناب خواجہ حسن ثانی نظامی ضخامت ۳۰۴ صفحات
کتابت وطباعت بہتر قیمت دس روپیہ پتہ: درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء نئی دہلی۔
منادی ایک قدیم اصلاحی ماہنامہ ہے جس کے اکثر و بیشتر مضامین تصوف اور بزرگانِ
دین کے حالات و سوانح پر ہوتے ہیں۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ خاص نمبر حضرت بابا
فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب ہے، قارئین کو معلوم ہوگا کہ ہمارے سکھ بھائیوں
کے زیر اہتمام سے پنجاب میں بابا فرید میموریل سوسائٹی قایم کی ہے، جس کا صدر دفتر پٹیالہ
پنجابی یونیورسٹی ہے۔ اس سوسائٹی کی طرف سے نومبر ۱۹۷۳ء میں ایک بین الاقوامی سیمینار
نئی دہلی میں ہوا تھا اور حد یہ ہے کہ اسی مناسبت سے پنجابی یونیورسٹی میں اسلامی تصوف

تبصرے

رسالوں کے خاص نمبر

الفرقان لکھنؤ کی اشاعت خاص: مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی ضخامت ۲۳۸ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت پانچ روپیہ، پتہ: کچہری روڈ، لکھنؤ

الفرقان ایک بلند پایہ دینی اور اصلاحی ماہنامہ ہے جو چالیس برس سے مسلسل بڑی پابندی اور باقاعدگی سے نکل رہا ہے، اس مدت میں اس میں بڑے اہم اور مفید مضامین اس کثرت سے شائع ہوئے ہیں کہ اگر ان سب کو یکجا کر دیا جائے تو دینیات کی ایک انسائیکلو پیڈیا بن جائے۔ اس اشاعت خاص میں گذشتہ فائلوں کے منتخب مضامین یکجا کر دئے گئے ہیں جو چھ ابواب: ایمان و اعتقاد، مسلمانوں کی کم نگہی، قادیانیت، شرک و بدعت، عبرت کی باتیں، اور دعوت تجدید و اصلاح پر منقسم ہیں، اسی طرح یہ مضامین تعداد میں ۳۶ ہیں، ان میں زیادہ تعداد تو خود فاضل مدیر کے قلم سے ہیں باقی مقالہ نگاروں میں مولانا سید مناظر احسن گیلانی۔ مولانا عبد الماجد دریابادی، مولانا ابو الحسن علی ندوی، مولانا نسیم احمد فریدی اور سعید احمد اکبر آبادی وغیرہم شامل ہیں، اگرچہ یہ مضامین پرانے ہو گئے، لیکن مسلمانوں کے عام حالات کے باعث یہ اپنی افادیت کے اعتبار سے آج بھی اتنے ہی اہم ہیں جتنے کہ پہلے تھے خدا مسلمانوں کو توفیق دے کہ وہ اس مجموعہ سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھائیں۔

زندگی کا تطلیقات ثلاثہ نمبر: مرتبہ مولانا سید احمد عروج قادری، پتہ: دفتر زندگی رام پور

کا اندازہ ہوگیا ہوگا - پھر ہر باب کئی کئی مقالات پر مشتمل ہے - یہ سب مقالات بڑے بصیرت افروز اور معلومات افزا ہیں اور اُن کی حقیقی قدر و قیمت کا اندازہ پڑھنے کے بعد ہی ہوسکتا ہے - نظم کا حصہ بھی بہت خوب ہے، شروع کے آٹھ صفحات میں قلم کاروں کے فوٹو بھی شامل ہیں اور آخر میں قومی یکجہتی کا ایک منشور بھی ہے جو سولہ دفعات پر شامل ہے اور اس پر ہر مذہب و ملت کے ایک ہزار تین سو ستر دانشوروں اور دوسرے مشہور حضرات کے دستخطوں کے عکس ہیں - غرض کہ یہ نمبر قومی یکجہتی کے موضوع پر ایک نمبر نہیں، بلکہ ایک انسائیکلوپیڈیا ہے، اور جس محنت و کاوش، دل کی لگن اور دیدہ وری کے ساتھ یہ مرتب کیا گیا ہے وہ ایک اعجاز سے کم نہیں، ضرورت ہے کہ حکومت اور پبلک دونوں اس کی قدر کریں اور اس کی صورت یہ ہے کہ اس خاص نمبر کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہو اور ملک کی مختلف زبانوں میں اس کے سب نہیں تو خاص خاص مضامین کا ترجمہ شائع کیا جائے - اس میں ایک مضمون اڈیٹر برہان کے قلم سے بھی ہے -

تحریر کا سید مسعود حسن رضوی ادیب نمبر: ضخامت ۲۳۸ صفحات کتابت وطباعت بہتر، قیمت -/10 پتہ :- علمی مجلس نمبر 1429 چھتہ نواب صاحب، فراش خانہ دہلی ۶

تحریر اُردو کا مشہور تحقیقی اور علمی و ادبی تماہی رسالہ ہے یہ اشاعت سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب کے تذکرہ کے لئے مخصوص ہے، سید صاحب اُردو زبان کے نامور محقق، ادیب اور مصنف ہیں، لکھنؤ کی پرانی تہذیب اور اُس کی تاریخ و ثقافت آپ کی تحقیق اور تصنیفی کاوشوں کا موضوعِ خاص ہیں - آپ بے شبہ اس کے مستحق تھے کہ ایک خاص نمبر آپ کے نام سے نکالا جائے، شروع میں خود سید صاحب کے قلم سے اِن کی مختصر سوانح حیات ہے، اس کے بعد سات مقالات ہیں جن میں موصوف کے حالات و واقعات زندگی، علم و ادب سے شغف، تصنیفات و تالیفات اور مقالات و مضامین اخلاق و عادات اور اُن کی شخصیت سے متعلق ذاتی مشاہدات و تاثرات شگفتہ و دلچسپ زبان

کی ایک کرسی (Chair) مستقل طور پر قائم کردی گئی ہے :

یوں عبادت ہو تو زاہد ہیں عبادت کے مزے :

منادی کا یہ نمبر پنجاب کی ہی ایک صدائے بازگشت ہے، اس میں مسلمان اور سکھ ارباب علم و قلم کے لکھے ہوئے اچھے اچھے مضامین ہیں جن میں حضرت بابا فرید کے سوانح حیات، علمی و عملی کمالات، روحانی سلسلہ، طریقت و معرفت، شعر و شاعری، بابا گرو نانک، اُن پر اور گرنتھ صاحب پر حضرت بابا فرید کے اثرات۔ پھر اسی مناسبت سے بزرگان دین کے مجموعہ ہائے ملفوظات پر ایک علمی بحث، غرض کہ ان سب پر روشنی ڈالی گئی ہے، نظمیں بھی بہت خوب ہیں۔ اس نمبر کا مطالعہ مسلم اور غیر مسلم ہر شخص کے لئے ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق ہوگا

شاعر کا قومی یکجہتی نمبر : مرتبہ جناب اعجاز صدیقی۔ ضخامت ۵۸۴ صفحات، کتابت و طباعت بہتر قیمت -/15 پتہ : قصر الادب ممبئی - 400008

شاعر اُردو زبان کا کہن سال اور معیاری ادبی ماہنامہ ہے، اس کے خاص نمبر جس موضوع پر بھی ہوتے ہیں، جامعیت اور مقالات کی نوعیت کے اعتبار سے اُس کا حق ادا کردیتے ہیں، چنانچہ یہ خاص نمبر بھی جس کا غلغلہ بہت دنوں سے بپا تھا ایسا ہی ہے، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کا خاص موضوع قومی یکجہتی ہے جو ہمارے ملک کی بہت اہم اور اشد ضرورت ہے، لیکن اب تک اس کے حصول میں کامیابی نہیں ہو سکی ہے، اس نمبر میں اس مسئلہ کے ہر پہلو اور گوشہ پر ملک کے مشہور و بلند پایہ دانشوروں نے اس درجہ سیر حاصل گفتگو کی ہے کہ کوئی پہلو تشنہ نہیں رہ گیا ہے۔ پورا نمبر مندرجۂ ذیل ابواب پر تقسیم ہے : (۱) قومی یکجہتی تاریخ اور ثقافت کے پس منظر میں (۲) قومی یکجہتی کا سماجی (۳) مذہبی پس منظر (۴) قومی یکجہتی میں زبانوں کا کردار (۵) اس میں ادب اور آرٹ کا حصہ (۶) سیکولرزم اور قومی یکجہتی کا مسئلہ (۷) فنون لطیفہ اور قومی یکجہتی (۸) قومی یکجہتی کے چند اور مسائل۔ (۹) نغمات یکجہتی جو نظم کے لئے مخصوص ہے۔ قارئین کو ان ابواب اور اُن کے عنوانات سے ہی اس کی جامعیت

۱۹۵۴ء حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ۔ العلم والعلماء ۔ اسلام کا نظام عفت و عصمت ۔
تاریخ صقلیہ ، تاریخ ملت جلد نہم

۱۹۵۵ء اسلام کا زرعی نظام ، تاریخ ادبیات ایران ، تاریخ علم فقہ ، تاریخ ملت حصہ دہم سلاطین ہند اول
تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی

۱۹۵۶ء ترجمان السنہ جلد ثالث ۔ اسلام کا نظام حکومت طبع جدید دلپذیر ترتیب ، جدید بین الاقوامی
سیاسی معلومات جلد دوم خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات

۱۹۵۷ء لغات القرآن جلد پنجم صدیق اکبر ، تاریخ ملت حصہ یازدہم سلاطین ہند دوم انقلاب روس اور روس انقلاب کے بعد

۱۹۵۸ء لغات القرآن جلد ششم سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ۔ تاریخ گجرات جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد سوم

۱۹۵۹ء حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط ، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء مصائب اور کونین ۔

۱۹۶۰ء تفسیر مظہری اُردو پارہ ۲۹ ۔ ۳۰ ۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سرکاری خطوط
امام غزالی کا فلسفۂ مذہب و اخلاق ۔ عروج و زوال کا الٰہی نظام ۔

۱۹۶۱ء تفسیر مظہری اردو جلد اوّل مرزا مظہر جانِ جاناں کے خطوط ۔ اسلامی کتب خانے عرب دنیا ۔
تاریخ مسند مرنجی روشنی

۱۹۶۲ء تفسیر مظہری اُردو جلد دوم ۔ اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں معارف الآثار ۔
نیل سے فرات تک ۔

۱۹۶۳ء تفسیر مظہری اُردو جلد سوم ۔ تاریخ ردہ ، سرکشی ضلع بجنور ۔ علماء ہند کا شاندار ماضی اوّل

۱۹۶۴ء تفسیر مظہری اُردو جلد چہارم حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط عرب و ہند عہد رسالت میں ۔
ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں ۔

۱۹۶۵ء ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اول ۔ تاریخی مقالات
لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر ایشیا میں آخری نو آبادیات

۱۹۶۶ء تفسیر مظہری اُردو جلد پنجم ۔ رموز عشق ۔ خواجہ بندہ نواز کا تصوّف و سلوک ۔
ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں ۔

۱۹۶۷ء ترجمان السنہ جلد چہارم تفسیر مظہری اُردو جلد ششم حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کی فقہ

۱۹۶۸ء تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم ۔ بین تذکرے ۔ شاہ ولی اللہؒ کے سیاسی مکتوبات
اسلامی ہند کی عظمت رفتہ ۔

۱۹۶۹ء تفسیر مظہری اُردو جلد ہشتم ۔ تاریخ الفخری حیات ذاکر حسین ۔ دین الٰہی اور اس کا پس منظر

۱۹۷۰ء حیات عبدالحی تفسیر مظہری اُردو جلد نہم ۔ مآثر و معارف ، احکام شرعیہ میں حالات زمانہ کی رعایت

۱۹۷۱ء تفسیر مظہری اُردو جلد دہم بیماری اور اس کا روحانی علاج ۔ خلافت راشدہ اور ہندوستان

۱۹۷۲ء فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر ۔ انتخاب الترغیب والترہیب ۔ اخبار التنزیل
عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان

میں بیان کئے گئے ہیں، جناب مالک رام صاحب لائق مبارک باد ہیں کہ تذکرہ ٹگا
کے ختم ہوجانے سے اردو ادبیات میں جو خلا پیدا ہوگیا تھا وہ اسے "تحریر" کے عا
نمبروں اور خصوصاً اس کے خاص نمبروں کے ذریعہ پر کر رہے ہیں۔

نذرِ سجاد، مرتبہ پروفیسر عبدالقوی دسنوی تقطیع متوسط ضخامت چار سو صفحات، کتا
وطباعت بہتر، قیمت درج نہیں۔ پتہ: شعبۂ اردو سیفیہ کالج، بھوپال۔

بھوپال کا سیفیہ کالج اعلیٰ تعلیم اور علمی وادبی سرگرمیوں کے باعث مدھیہ پردیش
ایک مثالی کالج ہے۔ خصوصاً اس کا شعبۂ اردو بڑا متحرک اور فعال ہے، اس کی اد
سرگرمیوں کی خبریں آئے دن اخبارات میں آتی رہتی ہیں۔ ملا سجاد حسین مرحوم جو ذاتاً
بوہرہ اور نہایت متمول تھے اس کالج کے بانی تھے۔ ان کو اس کالج سے عشق تھا اور وہ ہر
اس کی ترقی کی دھن میں لگے رہتے تھے۔ یہ خاص نمبر مرحوم کی یادگار میں ہی شائع کیا گیا
اور شعبۂ اردو کے دوسرے تصنیفی کارناموں کی طرح اس نمبر کی ترتیب وتہذیب او
مضامین کی ادبی قدر وقیمت میں بھی فاضل مرتب کا حسنِ ذوق، خوش سلیقگی اور جذ
کارکردگی نمایاں ہے اس میں زیادہ تر مضامین تو ملا صاحب کے حالات وسوانح۔ اخا
وعادات اور ان کی شخصیت سے متعلق تاثرات پر ہیں جو معلومات افزا بھی ہیں اور سبق آ
بھی، علاوہ ازیں دوسرے مقالات جو بھوپال کی بعض نامور شخصیتوں۔ اس کے علمی واد
کارناموں اور خود کالج اور اس کے مختلف شعبوں کی تاریخ اور ان کی کارگزاریوں پر ہیں
وہ بھی بہت مفید اور لائق مطالعہ ہیں۔ سب سے آخر میں پروفیسر عبدالقوی دسنوی کا مق
"خطوطِ غالب" پر غالبیات کے وسیع ذخیرہ میں خاصہ کی چیز ہے اور اشاریہ کی وجہ
سے اور وقیع ہوگیا ہے، لیکن غالباً یہ وہی مضمون ہے جو شعبۂ اردو کی طرف سے غالب
پر شائع شدہ کتاب یا خاص نمبر میں پہلے بھی شائع ہوچکا ہے اور ہماری نظر سے گذرا
بہرحال ارباب ذوق اس کے مطالعہ سے محظوظ ہوں گے۔

مرتبہ

سعید احمد اکبرآبادی

No. D. (D) 231 Phone 262815 JANUARY 1975

سالانہ قیمت دس روپے

فی پرچہ ایک روپیہ

حکیم مولوی محمد ظفر احمد خاں پرنٹر پبلشر نے یونین پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶ سے شائع کیا۔

برہان

جلد ۷۴ | ماہ صفر المظفر ۱۳۹۵ھ مطابق فروری ۱۹۷۵ء | شمارہ ۲

فہرست مضامین

ے باعث اس کو منظور نہ کر سکا تھا، اس لئے اب جو یہ دعوت ملی میں نے ٹیلیگرام کے ذریعہ اس کی منظوری
بھیجدی۔ اس کے بعد ہوائی جہاز کا ٹکٹ موصول ہوا اور میں یکم فروری کو گوہاٹی پہنچ گیا۔ قیام کا انتظام
جناب سید مجیب الرحمٰن صاحب کے ہاں تھا جو یہاں کے نمایاں کاروباری ہیں۔ ان کی بیگم سر سعد اللہ مرحوم
کی نواسی ہیں اور دہلی یونیورسٹی کی طالبہ رہ چکی ہیں۔ میاں بیوی دونوں بڑے شائستہ، مہذب اور
بڑے خوش اخلاق ہیں۔

حاجی مسافرخانہ کی اصلیت یہ ہے کہ آسام سے ہر سال کم و بیش ایک ہزار حاجی گوہاٹی ہو کر حج کے
لئے آتے جاتے ہیں اس لئے ان حضرات کے قیام و طعام وغیرہ کی سہولتوں کے پیش نظر یہاں حاجیوں
کے لئے ایک مسافرخانہ کی ضرورت عرصہ سے محسوس کی جا رہی تھی۔ خوش قسمتی سے گورنمنٹ کی اعانت
و امداد اور بعض اداروں کی اس میں شرکت کے باعث آسام حج کمیٹی کو جس کے صدر خود وزیر
قانون ہیں اس مقصد کے لئے ایک نہایت عمدہ اور موزوں جگہ پر تین بیگہ زمین مل گئی، اس
کے بعد فوراً حج کمیٹی نے ایک نہایت شاندار اور وسیع عمارت کا جس پر کم و بیش چودہ لاکھ روپے
خرچ ہوں گے، نقشہ تیار کر لیا اور فراہمی سرمایہ کا کام شروع کر دیا۔

یہی وہ حاجی مسافرخانہ ہے جس کا سنگ بنیاد ۲ر فروری کو ۱۰ بجے دن کے ایک نہایت
عظیم الشان اجتماع میں قرآن مجید کی تلاوت کے بعد صدر جمہوریہ نے رکھا اور اس کے بعد ایک
مختصر تقریر میں عمارت کی تکمیل کے لئے دعا کی۔ اس تقریب کے ساتھ آسام میں اسلامی اور تاریخی
نوادر کی ایک نمائش کا بھی اہتمام کیا گیا تھا جس کا افتتاح محترمہ عابدہ بیگم نے کیا۔ شام کو
چھ بجے ایک وسیع پنڈال میں جلسہ کا انتظام تھا جس میں میں نے "اسلام میں زندگی کا تصور" پر
سوا گھنٹہ تقریر کی، پنڈال حاضرین سے بھرا ہوا تھا جن میں وزیر، گورنمنٹ افسران، یونیورسٹی
کے اساتذہ اور طلباء اور آسام کے مشہور ادیب اور شاعر بتعداد کثیر موجود تھے۔ آسام کی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

جیسا کہ خبر آچکی ہے، ایک اسلامی کانفرنس مسلمانوں کے موجودہ معاملات و مسائل پر سیاسی نقطۂ نظر سے نہیں، بلکہ خالص دینی اور مذہبی تعلیمات اور احکام کی روشنی میں، بحث و گفتگو کی غرض سے اس ماہ کے دوسرے ہفتہ میں بغداد میں منعقد ہورہی ہے۔ عراق کے وزیر اوقاف سمرقند میں بھی موجود تھے اور انھوں نے وہیں مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی سے زبانی تذکرہ اس کانفرنس اور مفتی صاحب کے نام دعوت نامہ بھیجنے کا کیا تھا۔ اب یہ دعوت نامہ باقاعدہ موصول ہوگیا ہے اور جب تک برہان قارئین تک پہونچے گا مفتی صاحب بغداد پہونچ چکے ہوں گے، خدا کرے سفر بہمہ وجوہ بخیریت وعافیت ہو۔ امید ہے کہ واپسی پر اس کانفرنس کی روئداد برہان کے قارئین موصوف کی زبان قلم سے سن سکیں گے۔

گذشتہ جنوری کے دوسرے ہفتہ میں آسام کے وزیر قانون جناب سید احمد علی صاحب کا ایک ارجنٹ ٹیلیگرام اچانک راقم الحروف کو اس مضمون کا ملا کہ ۲ر فروری کو حاجی مسافر خانہ کا سنگ بنیاد صدر جمہوریہ فخر الدین علی احمد صاحب رکھ رہے ہیں، آپ سے درخواست ہے کہ اس تقریب میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوں اور تقریر کریں۔ اس کے ایک دو دن بعد میرے ایک عزیز شاگرد پروفیسر محمد یحییٰ کاٹن کالج، گوہاٹی کا ایک طویل خط بھی ملا جس میں انھوں نے اس دعوت کے قبول کرلینے پر اصرار کیا تھا اور گذشتہ سال بھی ان حضرات نے یہاں کی سیرت کانفرنس میں شرکت کی دعوت بڑے اصرار سے دی تھی، اس کے لئے خطوط اور ٹیلیگرام بھیجے تھے مگر میں بعض مجبوریوں

برہمن سری شنکر دیو کا شاگرد تھا۔

سہ روزہ قیام میں گوہاٹی کی یونیورسٹی، میڈیکل کالج، انجینیرنگ کالج، کاٹن (cotton) کالج جو آسام کا بہت پرانا مشہور اور نیکنام (۱۹۰۱ء کا قائم ہوا) کالج ہے۔ یہ سب دیکھے اور اساتذہ اور طلبار سے ملاقات کی۔ چاروں طرف سرسبز و شاداب پہاڑیاں اور ان کے دامن میں دریائے برہمپتر کی روانی بڑا فرحت بخش منظر پیش کرتے ہیں ان مناظر سے بھی لطف اندوز ہوا۔ عزیز پروفیسر محمد یحییٰ تو ہر وقت ہی میرے ساتھ رہے ان کا اور تمام احباب کا جو ازراہ قدردانی ملاقات کے لئے آتے رہے، سید مجیب الرحمٰن اور ان کی بیگم نے جس طرح خاطر مدارات کی اور میری راحت و آسائش کے لئے ذرا ذراسی باتوں کا خیال رکھا اور جن دوستوں نے تحفہ تحائف اور دعوتوں سے نوازا اُن سب کا تہِ دل سے شکرگزار ہوں۔ فجزاھم اللہ عنی جزاءً خیراً

عورتوں میں تعلیم کا عام رواج ہے، اس لئے ان کی تعداد بھی بہت تھی، دوسرے دن یعنی
فروری کو اسی پنڈال میں جماعت اسلامی کی طرف سے، جس کی ایک بڑی دکان کتابوں کی جو
میں اکثر و بیشتر آسامی اور بنگالی زبان میں تھیں، تقریب گاہ میں لگی ہوئی تھی۔ راقم الحروف کو ا
شاندار استقبالیہ دیا گیا۔ چائے نوشی کے بعد مولانا عبد الفتاح صاحب امیر جماعت اسلامی بنگا
و اڑلیسہ نے ایک نہایت سبق آموز اور پرجوش تقریر کی اور اس گنہگار کی نسبت وہ کچھ فرمایا
کسی قدر ترمیم کے ساتھ مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کا مصرعہ: "اک فاسق و فاجر میں اور ایسی عنایا
یاد آگیا! کیا عجب کہ ایسے ہی صلحائے امت کا حسن ظن موجب مغفرت و رحمت ایزدی ہو جائے
کہ رحمت حق بہانہ می جوید۔ مولانا کی تقریر اور تعارفی کلمات کے بعد نصف گھنٹہ میں نے تقریر کی
جس میں جماعت اسلامی کے نمایاں کارناموں اور ٹھوس اسلامی اور تعمیری خدمات پر روشنی
ڈالی۔

نمائش میں جو چیزیں میں نے خاص طور پر دلچسپی سے دیکھیں اور نوٹ کیں وہ یہ ہیں:
(۱) قرآن مجید کے قدیم مخطوطات (۲) اورنگ زیب عالمگیر کا ایک وقف نامہ اومانند اکے مندر
کے لئے جو گوہاٹی میں دریائے برہمپتر کے درمیان ایک پہاڑی پر واقع ہے (۳) اورنگ زیب
عالمگیر کے دو فرمان راجہ مان سنگھ کے نام جس میں اسے حکم دیا گیا ہے کہ جس طرح بھی بن پڑے کرو پ
(آسام کا قدیم نام) کو فتح کر کے اہوم (آسام کا قدیم حکمران خاندان) کے قبضہ سے نکال لے، (۴)
ہاتھیوں کے اقسام و انواع اور ان کے صفات پر سترہویں صدی کا لکھا ہوا ایک مخطوطہ جس
کا مصنف سوکمار برکائتھ نام کا ایک ہندو ہے، لیکن اس کی تصویریں دو مسلمان مصوروں (دلبراور
ڈوسائی ؟) نے بنائی ہیں (۵) قدیم زمانہ میں جو عرب خاندان یہاں آکر آباد ہو گئے تھے ان کے
ہاتھ کی عجیب و غریب تحریریں کہ ان کی زبان تو آسامی ہے مگر رسم الخط عربی ہے (۶) ایک سو برس
پہلے کی لکھی ہوئی بھگوت گیتا کی شرح جس کا مصنف ایک مسلمان شاہ شیخ چاند خاں ہے اور جو مشہو

سعد بن ابی وقاص اور حضرت عتبہ بن غزوان کا اونٹ جس پر دونوں باری باری سے سوار ہوتے تھے گم ہوگیا اور یہ اس کی تلاش میں نکل جانے کے باعث قافلہ سے پیچھے رہ گئے حضرت عبداللہ بن جحش باقی رفیقوں کے ساتھ چلتے رہے، آخر جب مقام نخلہ میں پہونچے تو انھیں یہاں قریش کا ایک کاروانِ تجارت ملا جو کشمش اور کچھ اور سامان لا رہا تھا، مسلمانوں نے باہم مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ غور طلب بات یہ تھی کہ اگر وہ کاروانِ قریش کی مزاحمت کرتے ہیں اور نوبت جنگ کی آتی ہے تو ماہ رجب چونکہ اشہر حرام میں داخل ہے اس لئے یہ چیز اس مہینہ کی حرمت کے خلاف ہوگی، اور اگر مزاحمت نہیں کرتے تو کاروان بلدۂ حرام میں داخل ہوجائے گا۔ انجام کار فیصلہ یہی ہوا کہ کارواں سے تعرض کیا جائے، چنانچہ مسلمانوں نے تیر اندازی شروع کردی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عمرو بن الحضرمی قتل ہوگیا، کارواں کے دو شخص گرفتار ہوگئے اور ایک شخص جس کا نام نوفل بن عبداللہ تھا فرار ہوگیا۔

اب حضرت عبداللہ بن جحش مع اپنے چھ رفقا کے مالِ غنیمت اور دو قیدیوں کے ساتھ مدینہ واپس پہونچے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے شہر حرام میں عمرو بن الحضرمی کے قتل پر کبیدگیِ طبع کا اظہار کیا اور فرمایا: میں نے تو تمھیں جنگ کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔ محمد بن اسحٰق کی روایت ہے جسے دوسروں نے بھی نقل کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن جحش اور ان کے ساتھیوں پر بعض صحابہ بھی ناراض ہوئے اور کہا: تم لوگوں نے وہ کام کیا ہے جس کا تم کو حکم نہیں دیا گیا تھا (یعنی غارت گری) اور تم نے شہر حرام میں جنگ کی ہے جس کے تم مامور نہیں تھے، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر اس درجہ افسوس تھا کہ آپ نے مالِ غنیمت اور قیدیوں کے قبول کرنے سے انکار فرمادیا۔ یہ دیکھ کر ان حضرات کے چھکے چھوٹ گئے لیکن بعد میں جب قرآن مجید کی آیت:

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ، لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ ماہ مقدس میں جنگ

عہد نبوی کے غزوات وسرایا اور ان کے مآخذ پر ایک نظر

(۶)

سعید احمد اکبر آبادی

سریۂ عبداللہ بن جحش

اس کے بعد ۲ھ کے ماہ رجب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن جحش کی سرکردگی میں آٹھ مہاجرین پر مشتمل ایک دستہ نخلہ روانہ فرمایا جو مکہ سے ایک شب کی مسافت پر ہے اور ساتھ ہی انھیں ایک تحریر دی اور حکم دیا کہ جب تک دو دن کی مسافت طے نہ ہو جائے وہ اسے نہ دیکھیں، پھر جب اسے پڑھیں تو اپنے ساتھیوں میں سے کسی پر جبر نہ کریں۔ حضرت عبداللہ بن جحش نے تعمیل حکم کی، دو دن کے سفر کے بعد جب انھوں نے تحریر پڑھی تو اس میں لکھا تھا: جب تم میری تحریر پڑھو تو اس کے بعد بھی اپنا سفر جاری رکھو، یہاں تک کہ تم نخلہ پہونچو، جو مکہ اور طائف کے درمیان واقع ہے' اسی مقام پر قریش کے حالات کا پتہ چلاؤ اور ہمیں ان سے باخبر کرو۔ حضرت عبداللہ بن جحش نے اس فرمانِ نبوی کو پڑھکر کہا: آمنا وصدقنا! اور اپنے رفقا کو اس مضمون سے آگاہ کیا اور یہ بھی فرمایا کہ میں کسی کو مجبور نہ کروں گا۔ لیکن سب نے بالاتفاق کہا کہ ہم سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مطیع و فرماں بردار ہیں، اس لئے جو آپ کا منشا ہے وہی ہمارا بھی ہے، اب یہ مختصر سا قافلہ حجاز کے راستہ پر پھر روانہ ہوا۔ اثنائے راہ میں حضرت

کے خلاف ہوا۔ کیونکہ آپ کا مقصد دستہ کے بھیجنے سے صرف قریش کے حالات کی ٹوہ لینا تھا، نہ کہ جنگ کرنا۔ یعنی یہ سریہ جاسوسی کی خدمت پر مامور تھا۔ یہ ایک بالکل اتفاقی امر تھا کہ اس دستہ کی مڈبھیڑ ایک کاروانِ قریش سے ہو گئی، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ربط قائم رکھنا ممکن نہیں تھا، اس لئے صحابہ نے اجتہاد سے کام لیا اور وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ اگر کاروانِ قریش سے اس وقت تعرض نہ کیا گیا تو یہ لوگ مکہ میں جاکر خبر کر دیں گے اور مکہ چونکہ وہاں سے قریب ہے ہی اس لئے وہ لوگ یہاں آکر ان کو قتل کر دیں گے یا کم از کم گرفتار کر کے لے جائیں گے دستہ کے اس فیصلہ کی صحت کا ثبوت اس سے بڑھکر اور کیا ہو سکتا ہے کہ بعد میں قرآن نے خود اس کی تصویب کر دی۔ لیکن جہاں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کا تعلق ہے نفسیات کا ایک طالب علم محسوس کر سکتا ہے کہ رحمتِ عالم کی شان یہاں بھی نمایاں ہے۔

غزوۂ بدر

بہ ظاہر یہ ایک معمولی واقعہ تھا، لیکن درحقیقت اس اعتبار سے بہت اہم تھا کہ ایک طرف اس واقعہ نے قریش کو چوکنا کر دیا اور انھیں محسوس ہونے لگا کہ ان کے غرور انانیت و نخوت کے لئے ایک چیلنج پیدا ہو گیا ہے، اس احساس کے بعد اگر ان میں سلامتِ طبع اور دور اندیشی کا جوہر ہوتا تو یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات پر مصالحت کر لیتے کہ اب وہ مسلمانوں کو نہ مسجد حرام سے روکیں گے، نہ ان کو ترک دین پر ورغلائیں گے اور نہ حضور کے تبلیغ و دعوت کے کام میں رخنہ انداز ہوں گے، لیکن انھوں نے اس راہ کو چھوڑ کر جنگ و جدال کی راہ اختیار کی اور اسلام دشمنی میں پہلے سے زیادہ سرگرم ہو گئے، اور دوسری جانب اس واقعہ کے سلسلہ میں مذکورہ بالا آیت قتال کے نزول نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جاں نثاروں کو اس بات کا یقین دلا دیا کہ قریش سے اب خیر و صلاح کی کوئی توقع قائم نہیں کی جا سکتی، قرآن نے انھیں یاد دلایا کہ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے انھیں ترک وطن پر مجبور کیا، یہ انھیں مسجد حرام سے روکتے رہیں گے، یہ اب تک مسلمانوں سے برسرپیکار رہے ہیں اور آئندہ بھی ایسے ہی رہیں گے، اس لئے اب بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ ان سے جنگ کی جائے، اس کے بغیر فتنہ و فساد اور شر و عناد

قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ، وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا وَمَنْ يَرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأُولٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ○

(البقرۃ)

کرنا کیسا ہے؟ آپ کہہ دیجئے کہ اس مہینہ میں جنگ کرنا برا ہے، لیکن اللہ کے راستہ سے روکنا، اس کے اور مسجد حرام کے ساتھ کفر کرنا اور اس کے اصل باشندوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اُس سے بھی زیادہ برا ہے، اور فتنہ انگیزی قتل سے بھی زیادہ بری بات ہے اور (ہاں اے مسلمانو دیکھو) یہ کفار قریش تم سے اس وقت تک برابر برسرپیکار رہیں گے جب تک کہ وہ تم کو تمھارے دین سے برگشتہ نہ کر دیں گے، بشرطیکہ وہ ایسا کرسکیں، (لیکن تم خوب سمجھ لو کہ) اور تم میں سے جو لوگ اپنے دین سے منحرف ہوں گے اور کفر کی حالت میں مرجائیں گے تو دنیا اور آخرت میں ان کے اعمال بیکار ہوجائیں گے، وہ دوزخی ہوں گے اور دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔ (ترجمہ)

نازل ہوئی اور سورۂ انفال کی یہ آیت: وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَأَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهُ اور جان لو کہ غنیمت کے طور پر تم کو جو کچھ بھی دستیاب ہو اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لئے ہے، بھی اتری تو اب حضور نے مال غنیمت میں اپنا حصہ قبول فرمایا اور دو شخص جو قیدی تھے ان کا فدیہ لیکر انھیں رہا کر دیا۔

یہ بات رکھنے کی ہے کہ تاریخ اسلام میں یہ پہلا واقعہ ہے جس میں مسلمانوں کی طرف سے فریق مخالف پر تیر اندازی ہوئی ہے اور اس کے نتیجہ میں ایک شخص قتل ہوگیا، اور مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا ہے، لیکن یہ سب کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر اور آپ کے منشا

(۳) پھر فرمایا کہ تحریر پڑھنے کے بعد جو شخص تمہارے ساتھ نہ جانا چاہے اسے مجبور نہ کرنا۔ اسے جانے دینا۔

(۴) نخلہ کا مقام وقوع کہاں ہے، اور مکہ سے اس کا فاصلہ کتنا ہے؟

یہ سوالات تو وہ ہیں جو سریۂ حضرت عبداللہ بن جحش کے بارہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ اب رہا قریش کا وہ کاروانِ تجارت جو ابوسفیان کی سرکردگی میں شام سے واپس آرہا ہے اس کے متعلق حسب ذیل امور پر غور کرنا چاہیئے:

(۱) یہ قافلہ کس ساز و سامان اور تزک و احتشام سے روانہ ہوا تھا۔

(۲) مکہ سے کب روانہ ہوا تھا۔

(۳) مکہ اور شام کے درمیان مسافت کتنی ہے۔

اب اگر ان تمام امور اور تنقیحات پر یکجائی غور کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ چونکہ مکہ اور شام کے درمیان آٹھ سو نو سو میل کا فاصلہ ہے اور اس زمانہ میں کارواں جس رفتار سے چلتے تھے اس کے حساب سے اس مسافت کو طے کرنے کے لئے کم از کم ایک ماہ کی مدت درکار ہوتی ہے اور کارواں جس مقصد کے لئے گیا ہے وہ ایک دو دن کا کام نہیں، کم از کم ایک مہینہ شام میں اُس کا قیام بھی رہا ہوگا۔ اور ہمیں یہ معلوم ہے کہ غزوۂ بدر کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے علی حسب روایات ۸ ریا ۱۲ رمضان ۲ھ کو روانہ ہوئے ہیں۔ اس بنا پر یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ قریش کا یہ کاروانِ تجارت اوائل رجب میں مکہ سے روانہ ہوا ہوگا۔

اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ یہ کاروان کس ساز و سامان کے ساتھ روانہ ہو رہا ہے، ابن سعد نے خود ابوسفیان، امیر کاروان کا قول نقل کیا ہے کہ مکہ میں کوئی صاحب حیثیت شخص، مرد یا عورت ایسا نہیں تھا جس نے اس کاروان میں حصہ نہ لیا ہو اور اپنی رقم اس میں نہ لگائی ہو۔ ایک عام اندازہ کے مطابق کاروان کے پاس

کا سر قلم نہیں ہو سکتا، چنانچہ غزوۂ بدر اسی واقعۂ نخلہ کا نتیجہ ہے۔

غزوۂ بدر کا آغاز کیسے ہوا؟

جن ارباب علم و نظر کی نگاہ غزوۂ بدر کے مآخذ پر ہے وہ جانتے ہیں کہ اس سلسلہ میں احادیث میں جو کچھ ہے وہ اصل واقعہ کی چند جزئیات کے بیان سے زیادہ نہیں ہے، اور اگرچہ قرآن مجید میں بھی اس غزوہ کا بیان جس تفصیل سے ہے کسی اور غزوہ کا بیان اس تفصیل سے نہیں ہے، لیکن چونکہ قرآن کوئی تاریخ کی کتاب نہیں ہے، اس بنا پر پورے واقعہ کا مربوط اور مسلسل بیان اس میں بھی نہیں ہے، اب رہیں کتب مغازی وسیرت! تو ان میں بھی نفس واقعہ، اس کے اسباب اور اُس کی جزئیات اس طرح ایک دوسرے سے خلط ملط ہو گئے ہیں کہ تاریخ نویسی کے موجودہ مذاق کے مطابق واقعہ کی مختلف کڑیوں کو ایک دوسرے سے مربوط کرنا کارے دارد کا مصداق ہے، اردو زبان کے بلند پایہ سیرت نگار مولانا شبلیؒ اور مولانا عبدالرؤفؒ دانا پوری دونوں نے واقعہ کی صورت ایک دوسرے سے مختلف لکھی ہے، اس کی بڑی وجہ یہی ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے اس سلسلہ میں جو کاوش کی ہے اس کا موضوع درحقیقت حضور کے میدانہائے جنگ کی جغرافیائی تحقیق ہے۔ اس کے سوا انھوں نے جو کچھ کہا ہے دوسروں پر اعتماد کر کے کہا ہے، ہم نے غزوۂ بدر کے تمام مآخذ کو سامنے رکھکر بہت کچھ غور و فکر کے بعد واقعہ کی اصل صورت حال اپنے ذہن میں جو کچھ متعین کی ہے اسے پیش کرتے ہیں۔ امید ہے کہ ارباب علم و تحقیق اسے پسند کریں گے

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ نخلہ کا واقعہ کوئی الگ تھلگ اور منفرد واقعہ نہیں ہے، بلکہ وہ غزوۂ بدر کے سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے، اس ذیل میں امورِ غور طلب یہ ہیں

(۱) سریۂ عبداللہ بن جحش کس تاریخ کو روانہ ہوا۔

(۲) سریہ کو روانہ کرتے وقت وہ کیا بات تھی جس کی وجہ سے حضورؐ نے اس درجہ اہتمام فرمایا کہ امیر سریہ کو ایک بند تحریر دی اور تاکید فرمائی کہ جب تک تم دو دن کی مسافت طے نہ کر لو اسے مت کھولنا۔

صرف اس لئے تھی کہ سریہ ایک نہایت خطرناک مہم پرجارہا تھا۔ اور مدینہ اور اس کے قرب و جوار میں برے بھلے، دوست دشمن ہر قسم کے لوگ تھے، اگر کسی منافق یا یہودی کو اس کی خبر ہوجاتی تو غضب ہوجاتا، اور سریہ کا بچ کر صحیح سلامت آنا مشکل ہوتا۔

مستشرقین جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے انھوں نے لکھا ہے کہ سریۂ عبد اللہ بن جحش کا مقصد ہی قافلۂ قریش جو عمرو بن الحضرمی کی سرکردگی میں آرہا تھا اس کی گھات میں بیٹھنا تھا[۱]۔ حالانکہ حضورؐ نے جو الفاظ لکھے تھے وہ یہ تھے:

"نترصد بہا قریشا" "وتعلم لنا من اخبارھم" ان الفاظ کا صاف ترجمہ یہ ہے کہ "تم نخلہ میں قریش کی ٹوہ لگاؤ اور ان کے حالات معلوم کرکے ہمیں بتاؤ"[۲] واٹ منٹگمری (Watt Montgomary) جو سنجیدہ نگاری کے لئے اپنی جماعت میں مشہور ہے لکھتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل پیغام "نترصد بہا قریشاً" تھا اور "وتعلم لنا من اخبارھم" صاف طور پر اس پر اضافہ ہے جو بعد میں اس غرض سے کیا گیا ہے کہ "ترصد" کے معنی "گھات میں بیٹھو" نہ ہوں، بلکہ "ان کے حالات کی نگرانی کرو" ہوجائیں۔ لیکن اس کی دلیل کیا ہے کہ یہ الفاظ اضافہ ہیں؟ اس کا جواب ندارد، اس دھاندلی کا کچھ ٹھکانا ہے!

پھر یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ اگر بات صرف اتنی ہی تھی کہ عمرو بن الحضرمی کے کاروان سے تعرض کرنا تھا جو چار آدمیوں پر مشتمل تھا تو سریۂ عبداللہ بن جحش جو ایک روایت کے مطابق بارہ اور ایک روایت کی رو سے آٹھ افراد پر شامل تھا اس کے لئے یہ ایسا کونسا مشکل اور خطرناک کام

---

(1) Mohammad in Madina P. 7.

(۲) اس سریہ کا ذکر ابن ہشام، ابن اسحاق، واقدی، ابن سعد، طبری، ابن حزم، ابن کثیر اور ابن عبدالبر ہر ایک نے کیا ہے اور یہ الفاظ ابن اسحٰق کے تتبع میں جو سیرت اور مغازی کے باوا آدم ہیں اکثر نے نقل کئے ہیں۔

پچاس ہزار دینار کا سامانِ تجارت تھا[۱]۔ ڈاکٹر اسپرنگر نے اس کا اندازہ ایک لاکھ ساٹھ ہزار اشرفیوں کا کیا ہے[۲]۔ جو لوگ اس کاروان میں شریک تھے ان کی تعداد کم و بیش ستر اور اونٹوں کی تعداد ایک ہزار تھی، کارواں کا اس ساز و سامان اور تزک و احتشام کے ساتھ روانہ ہونا اور مکہ کے ایک ایک مرد اور عورت کا جوش و خروش کے ساتھ اس میں حصہ لینا اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ یہ سب کچھ محض کاروباری اور تجارتی مقصد سے نہیں تھا، بلکہ اس عظیم جنگ کی تیاری کے سلسلہ میں تھا جو قریش مدینہ پر حملہ کی شکل میں کرنا چاہتے تھے اور جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، یہود مدینہ کے نام ایک خط میں ابوسفیان اس کی دھمکی بھی دے چکا تھا اور قبیلہ قبیلہ اس کا پروپگنڈہ بھی ہو رہا تھا۔

جب مکہ کے حالات یہ ہوں تو نا ممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی اطلاع نہ ہوا ور آپ ان سرگرمیوں سے بے خبر ہوں، چنانچہ ہماری رائے میں آپ نے سریۂ عبداللہ بن جحش جو روانہ فرمایا ہے اس کی اصل محرک قریش کی یہی سرگرمیاں تھیں، ان سرگرمیوں کے باعث اس وقت مکہ گویا دشمن کی جنگی تیاریوں کا ایک کیمپ بنا ہوا تھا اور چونکہ نخلہ جہاں اس سریہ کو پہونچنا اور وہاں سے سراغرسانی کرنا تھا مکہ سے قریب صرف ایک شب کی مسافت پر یعنی بارہ تیرہ میل تھا اس بنا پر یہاں آکر سراغرسانی کرنا جان جوکھم میں ڈالنے کے مرادف اور سخت خطرناک کام تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سریہ کے معاملہ میں بڑی رازداری سے کام لیا۔ امیر سریہ کو ایک بند تحریر دے کر فرمایا کہ جب تک دو شب و روز کی مسافت طے نہ ہو جائے وہ ہرگز اس کو نہ پڑھیں۔ اور پڑھنے کے بعد جو شخص بھی ہمراہ نہ ہونا چاہے اسے ساتھ چلنے پر مجبور نہ کیا جائے، یہ رازداری

---

(1) Mohammad in Madina P. 10.

(۲) بحوالۂ ساحۃ الاسلام از ڈاکٹر احمد محمد الحوفی مطبوعۂ قاہرہ ص ۱۲۸

ابوسفیان نے ایک شخص کو جس کا نام ضمضم الغفاری تھا مکہ روانہ کردیا۔ شدید خوف اور دہشت کے موقع پر عرب کے قاعدہ کے مطابق اس شخص نے اپنے اونٹ کی ناک کاٹی، اپنا کرتا پھاڑا اور زور زور سے چیخنا شروع کیا: "اللطیمۃ۔ اللطیمہ" جس کے معنی یہ ہیں کہ "اے لوگو تمھارے اونٹ جو سامان تجارت لادے ہوئے ہیں ان کو حملہ سے بچاؤ" ضمضم کی اس چیخ پکار نے مکہ میں آگ لگادی اور قریش کا ایک ایک فرد اس مہم کو سر کرنے کے جوش میں آپے سے باہر ہوگیا، جن لوگوں کے پاس مال اور ہتیار نہیں تھے ان کو سہیل بن عمرو نے جو بڑا دولتمند تاجر تھا، یہ سب چیزیں مہیا کیں۔

مکہ میں جو جنگ کی تیاریاں بڑے زور شور سے ہوئیں ان کا ہیرو ابوجہل عمر بن ہشام مخزومی تھا۔ یہ طاقت اور گھمنڈ کے نشۂ پندار میں اس درجہ بدمست ہورہا تھا کہ اگرچہ ابوسفیان اپنے کاروان کو سمندر کے ساحل ساحل، مدینہ کے راستہ سے کترا کر مسلمانوں کے خطرہ سے بچا نکالنے میں کامیاب ہوگیا تھا اور اس لئے مکہ میں کہلا بھیجا تھا کہ اب فوج کشی اور لشکر آرائی کی ضرورت نہیں ہے، لیکن ابوجہل نہ مانا اور ہنکار کے بولا: "نہیں ہم ضرور بدر جائیں گے، وہاں تین دن تک خوب ضیافتیں ہوں گی، رنگ رلیاں منائیں گے، شرابیں اڑیں گی اور رقص و سرود کے جلسے ہوں گے۔" یہ زمانہ بدر میں سالانہ میلہ (Annual Fair) کا بھی تھا۔ مقصد یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مدینہ کے لوگوں پر قریش کی سطوت و طاقت اور ان کی جی داری کی دھاک بیٹھ جائے، ابوجہل کی اس خرمستی کا ذکر مسلمان مورخین سیرت نے تو کیا ہی ہے، مستشرقین میں پروفیسر واٹ منٹگمری نے بھی اپنی کتاب (Mohammad at Madina) میں اور پھر اپنے مقالہ مطبوعۂ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (جدید اڈیشن) میں لفظ بدر کے ماتحت دونوں جگہ اس کا خاص طور پر نوٹس لیا ہے، غزوۂ بدر کے سلسلہ میں قرآن مجید کی آیتِ ذیل ابوجہل اور اس کے ساتھیوں کی ان عاقبت نااندیشانہ بالاخوانیوں کی ہی عکاسی کرتی ہے:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِم بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ، وَيَصُدُّونَ عَن

اور دیکھنا تم ان لوگوں کی طرح نہ ہوجاؤ جو اپنے گھروں سے اکڑفوں کے ساتھ اور لوگوں کے دکھاوے

تھا جس کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس درجہ رازداری سے کام لیا اور ایک بند تحریر کے ذریعہ امیر سریہ کو وہ ہدایات دیں جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، علاوہ ازیں اگر معاملہ یہی تھا تو اس پر اتنا بڑا ہنگامہ کیوں برپا ہوا کہ ایک طرف سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر اظہار ناپسندیدگی فرمایا اور ارشاد ہوا کہ "میں نے تم کو جنگ کرنے کی اجازت تھوڑی دی تھی" اور ساتھ ہی مال غنیمت میں اپنا حصہ لینا منظور نہیں کیا دوسری جانب صحابہ نے عبداللہ بن جحش کو اس قدر برا بھلا کہا کہ روایت میں "وسقط فی القوم" یعنی لوگوں کی نظروں سے گر گئے" کے الفاظ مذکور ہیں۔ مزید برآں منافقین، یہود اور مشرکین اور خود مسلمانوں میں بھی شور مچ گیا کہ ماہ مقدس کی بیحرمتی ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ قرآن کو درمیان میں آکر صفائی پیش کرنی پڑی۔

بہر حال ان وجوہ بالا کی بنا پر اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سریۂ عبداللہ بن جحش مکہ سے جو کاروان قریش شام جارہا تھا اور اس سلسلہ میں وہاں جو اور سرگرمیاں اور سرگوشیاں ہو رہی تھیں ان کی ٹوہ لینے کے لئے ہی بھیجا تھا۔ یہ بالکل ایک اتفاقی حادثہ تھا کہ سریہ کی مڈبھیڑ عمرو بن الحضرمی کے مختصر سے قافلہ سے ہوگئی اور سریہ اس میں الجھ کر رہ گیا۔ اور یوں بھی سریہ جب نخلہ پہونچا ہے یہ ماہ رجب کی آخری تاریخیں تھیں، اس بنا پر قیاس یہی ہے کہ کاروان قریش مکہ سے نکل چکا اور شام کے راستہ پر گامزن ہوگا۔

قریش کے آئندہ کے لیے جو عزائم اور منصوبے تھے وہ ظاہر ہیں ہی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اب تک وقتاً فوقتاً ان لوگوں کے کاروانوں کی جستجو میں جو گشتی دستے بھیجتے رہے تھے اور بعض میں آپ خود بھی گئے تھے اُن کا اِن لوگوں کو علم تھا اور ان کی وجہ سے یہ پہلے ہی سے چوکنا تھے، اب اِدھر عمرو بن الحضرمی کے قتل اور اس کے کاروان کی بربادی کی اطلاع شام میں ابوسفیان اور دوسرے ارکانِ کاروان کو ہوئی تو ان کو دن میں تارے نظر آنے لگے اور انھیں محسوس ہوا کہ اب واپسی میں کاروان تجارت کی خیر نہیں ہے، غلبۂ دہشت وخوف کے باعث بدحواسی کے عالم میں

کی (جہاں لشکر قریش سے سابقہ ہوا) یہ سب مسافت کتنی ہے[1]؟ اور پھر ضمضم کے مکہ پہونچتے ہی تو فوراً لشکر قریش روانہ نہ ہوگیا ہوگا۔ بلکہ تیاری میں کم ازکم دو تین دن ضرور لگے ہوں گے، ان سب چیزوں کو سامنے رکھا جائے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ضمضم کی روانگی اور بدر میں لشکر قریش کی آمد کے درمیان کم ازکم بارہ تیرہ دن کا فاصلہ ہونا چاہیئے۔ حالانکہ ضمضم کی روانگی کے چار پانچ دن بعد ہی جنگ شروع ہوگئی ہے، اس سے صاف طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ ابو سفیان نے ضمضم کو اس وقت مکہ بھیجا تھا جب کہ حضور ابھی مدینہ سے روانہ بھی نہیں ہوئے، چنانچہ ہم نے اوپر جو حساب لگایا ہے اسی کی بنیاد پر پروفیسر منٹگمری لکھتے ہیں: "بعض مآخذ بتاتے ہیں کہ ابو سفیان نے اپنا قاصد مکہ اس وقت بھیجا تھا جب اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تیاریوں کی اطلاع ہوئی تھی، لیکن اوقات اور دنوں کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ بالکل ناممکن نظر آتا ہے[2]۔"

اب رہا دوسرا سوال جو پہلے سوال کا ہی ایک جز اور شاخسانہ ہے اس کا صاف اور قطعی جواب یہ ہے کہ لشکر قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ سے روانگی سے پہلے نہ صرف یہ کہ مکہ سے چل پڑا تھا، بلکہ بدر میں لشکر اسلام سے قبل پہونچ چکا تھا۔ چنانچہ اثنائے راہ میں جب اس لشکر کو ابو سفیان کا پیغام ملا ہے تو ابو جہل نے "واللہ ما نرجع" یعنی بخدا! ہم واپس نہیں ہوں گے" کے الفاظ کہے ہیں، علاوہ ازیں ایک واضح اور صاف روایت یہ ہے کہ جب حضور چلتے چلتے بدر کے قریب خیمہ فگن ہوئے تو شام کے وقت حضرت علی، حضرت زبیر اور حضرت سعد بن

---

[1] بدر مدینہ کے جنوب میں واقع ہے اور مدینہ سے اس کی مسافت ایک سو ساٹھ (160) میل ہے، اور دوسری جانب بدر جو مکہ کے شمال میں ہے اس کی مسافت مکہ سے دو سو پچاس (250) میل ہے، یہ مسافت ان راستوں کے اعتبار سے ہے جن پر پہلے زمانہ میں قافلے چلتے تھے

[2] Mohammad at Madina: P. 10.

سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ○ (الانفال)

کے لئے نکلے ہیں اور راہِ حق سے لوگوں کو روکتے ہیں، اچھا خیر! اللہ کے علم میں تو ان سارے لوگوں کے کچھن ہیں۔

دو سوال

اب ذرا ٹھہریے، آگے بڑھنے سے پہلے دو سوالوں کا جواب ضروری ہے جو یہاں پیدا ہوتے ہیں:

(۱) ایک یہ کہ ابوسفیان نے ضمضم بن عمرو الغفاری کو جو مکہ بھیجا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ سے روانہ ہونے سے پہلے بھیجا تھا یا بعد میں؟

(۲) دوسرا سوال یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے روانہ ہوئے ہیں اس وقت لشکرِ قریش مکہ سے روانہ ہو چکا تھا یا نہیں؟

پہلے سوال کے جواب میں اربابِ سیر و مغازی (ابن اسحٰق سے ابن عبدالبر تک) عام طور پر لکھتے ہیں کہ "جب ابوسفیان کو یہ خبر پہونچی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے کاروانِ تجارت کی جستجو میں مدینہ سے چل پڑے ہیں تو اس نے ضمضم کو اجرت پر لیا اور مکہ روانہ کیا لیکن... در حقیقت یہ بالکل غلط اور خلاف واقعہ بیان ہے، کیونکہ انھیں اربابِ سیر کے بیان کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ۸ر رمضان اور ابن سعد کے بیان کے مطابق ۱۲ر رمضان کو مدینہ سے روانہ ہوئے ہیں، اور غزوۂ بدر ۱۷ر ۱۹ر یا ۲۱ر رمضان (مطابق ۱۳ر ۱۵ر یا ۱۷ر مارچ ۶۲۴ء) کو برپا ہوا ہے، اس حساب سے مدینہ سے باہر نکلنے اور غزوہ کے شروع ہو جانے میں اوسطاً چھ سات دن یعنی صرف ایک ہفتہ کا فصل ہوا۔ اب اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ابوسفیان نے حضور کے مدینہ سے نکلنے کے بعد ضمضم کو مکہ دوڑایا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس وقت ابوسفیان مقام بدر سے کافی پیچھے تھا اور ضمضم کی روانگی یقیناً جلد سے جلد ۱۰ر رمضان یا ۱۴ر ۱۵ر رمضان کو ہی ہو سکتی ہے، ساتھ ہی یہ پیش نظر رکھئے کہ ابوسفیان اس وقت جس مقام پر ہے وہاں سے مکہ تک کی اور پھر مکہ سے بدر تک

اہل خرد کی واماندگی

لیکن سلسلۂ واقعات میں ارباب سیر نے جو روایات نقل کی ہیں وہ اس درجہ پُرپیچ وخم ہیں کہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ جیسا محقق بھی ان میں الجھ کر رہ گیا اور ان سے دامن نہیں بچا سکا ہے، چنانچہ اس موقع پر (عہد نبوی کے میدان جنگ) میں لکھتے ہیں:

"قافلہ سالار (ابوسفیان) کا پیام مکہ پہونچا تو وہاں لازمی طور پر کہرام مچ گیا، کیونکہ ہر ایک گھرانے کا کچھ نہ کچھ سامان اس (کاروانِ ابوسفیان) میں تھا۔ جلدی میں قریش نے ناکافی تیاری کی اور جملہ حلیفوں کے اکٹھے ہونے کا انتظار نہ کیا۔ خاص طور پر جنگجو احابیش کو ساتھ نہ لینے پر بعد میں وہ بہت پچھتاتے بھی رہے، پھر بھی ہزار کے قریب رضاکار جمع ہو گئے، جن میں سے بعض کے پاس گھوڑے بھی تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے عام روایات کے دباؤ میں یہ لکھ تو دیا، لیکن انھیں اس کا احساس ہے کہ ان روایتوں پر بھروسا کرنے سے کیسی کچھ پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں، چنانچہ اس کے بعد ہی رقمطراز ہیں:

"اس کمک (لشکر ابوجہل) کو مکہ سے بدر پہونچنے میں کم وبیش ایک ہفتہ ضرور لگا ہوگا۔ یہ سوال کافی پیچیدہ ہے کہ قافلہ کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کیوں فوراً مدینہ واپس نہیں ہو گئے اور کیوں ہفتہ بھر بدر میں پڑاؤ ڈالے، اپنے مرکز سے دور، خطرہ کا سامنا کرتے مقیم رہے۔

پھر خود ہی اس کافی پیچیدہ سوال کا جواب دیتے ہیں:

"جہاں تک غور کیا مجھے ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے، ہجرت کے ساتھ ہی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے آس پاس کے قبائل سے حلیفی اور معاونت کے معاہدے کرنے شروع کر دیے تھے چنانچہ سلہ ھ میں جہینہ کے بعض سرداروں سے معاہدہ ہوا تھا" الخ

لیکن تاریخی حیثیت سے اس جواب کا کیا پایہ ہے؟ اس کے متعلق ہم بس یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ جواب

ابی وقاص کو دشمن کی خیر خبر لینے کے لئے روانہ کیا، ان حضرات کو قریش کا ایک اونٹ ملا جو پانی سے لدا ہوا تھا، اس اونٹ کے ساتھ اسلم اور ابویسار دو غلام تھے، صحابہ نے ان کو پکڑ لیا اور اپنے خیمہ میں لے آئے، حضور اس وقت نماز پڑھ رہے تھے، اب صحابہ نے دونوں غلاموں سے پوچھا: "تم کون ہو؟" انھوں نے جواب دیا: "ہم قریش کے بہشتی ہیں" بہشتی لشکر کے ساتھ ہوتے تھے، نہ کہ تجارتی قافلہ کے ساتھ، صحابہ نے خیال کیا کہ جھوٹ بول رہا ہے اس لئے اسے مارنا شروع کر دیا، اب ان کو چوٹ لگی تو بولے: نہیں ہم کاروان قریش کے لوگ ہیں، اتنے میں حضورؐ نماز سے فارغ ہو گئے تھے، آپ نے صحابہ سے فرمایا: ان غلاموں نے تم سے سچ بات کہی تو تم نے اسے پیٹنا شروع کر دیا، پھر یہ جھوٹ بولا تو تم نے اسے چھوڑ دیا۔ اس کے بعد حضورؐ نے غلاموں سے دریافت کیا کہ لشکر قریش کہاں ہے؟ یہ بولے: "ٹیلہ کے پیچھے" آپ نے مزید دریافت کیا کہ "یہ لوگ کتنے اونٹ روزانہ ذبح کرتے ہیں" انھوں نے کہا: دس اونٹ روزانہ، ایک اونٹ چونکہ کم و بیش سو آدمیوں کو کافی ہوتا ہے، اس لئے حضور نے اس سے اندازہ لگایا کہ لشکر کی تعداد نو سو اور ایک ہزار کے درمیان ہوگی۔[1]

یہ جو کچھ عرض کیا گیا اس سے قطعی طور پر یہ ثابت ہو گیا کہ:

(الف) ابوسفیان نے ضمضم کو مکہ اس وقت بھیجا ہے جب کہ ابھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے روانہ نہیں ہوئے ہیں۔

(ب) ضمضم کی چیخ پکار پر مکہ میں جنگ کی تیاریاں اس وقت شروع ہوئی ہیں جب کہ مدینہ میں ابھی جنگ کا سان گمان بھی نہیں ہے، اور اس بنا پر ابوجہل ایک لشکر جرار لیکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ سے روانگی سے پہلے ہی مکہ سے چل پڑا ہے۔

---

[1] الدرر لابن عبد البر ص ۱۱۲

جدید ہندوستان میں اسلامی فکر

(تجزیہ اور تنقید)

از جناب جلال الحق صاحب ایم اے

جدید ہندوستان میں اسلام کو بحیثیت مذہب قبول کرنے والے جو رجحانات موجود ہیں، انھیں
ی تفصیل، ترکیب اور مزاج و میلان کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ان سب میں اسلام کو بطور
مکمل نظام حیات کے سمجھنے کی بات نمایاں نظر آئے گی۔ اس تصور کا خصوصی حامل راسخ العقیدہ حرکئیں

سخ العقیدہ حرکیت

کا وہ مخصوص گروہ ہے جو مولانا مودودی کو اسلام کی دعوتی و انقلابی اسپرٹ کو
دوبارہ زندہ کرنے والی شخصیت تصور کرتے ہوئے اپنا ایک مخصوص نظام
لاح (Terminology) ترتیب دیتا ہے۔ اس کے مطابق اسلام اپنی اس صورت میں جو کہ انبیاء
ل علیہم السلام کی تعلیمات سے براہ راست ماخوذ ہے، ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جو اپنا کامل
ر ایک ایسی تنظیمی ہیئت میں کرتا ہے جس کی مجموعی کارکردگیاں ایک واضح نصب العین کے ماتحت
نیز جس کی اکائیاں اپنی زندگیوں کو اس نصب العین سے ہم آہنگ کر چکی ہوں یا کرنے میں مصروف
، اور وہ اس منظم حرکیت کو تحریک اسلامی کا نام دیتا ہے۔ چنانچہ اس کے اپنے الفاظ میں
یک اسلامی کا مقصد اور نصب العین اقامت دین یعنی ایک ایسے جامع اور ہمہ گیر نظام
کا قیام ہے جو اپنے تصور حیات، اپنے اصول، اپنے مقاصد اور اپنے تفصیلی قوانین
ر میں تمام تر اللہ رب العالمین کے احکام و ہدایات پر مشتمل

ڈاکٹر صاحب جیسے فاضل اور صاحب نظر مصنف کے مرتبہ سے نہایت فروتر اور لائق افسوس ہے[۱]۔

---

[۱] تاریخ اسلام میں روایات کا یہی وہ جھول ہے جس کی وجہ سے نہایت غائر نظر سے ان کے تنقیدی مطالعہ کی بہت سخت ضرورت ہے، اسی ضرورت کے پیش نظر عرصہ ہوا راقم الحروف نے "اسلام کے عہد اولیں کے مورخ اور ان کی تاریخ نویسی" پر ایک سلسلۂ مقالات لکھنے کا ارادہ کیا تھا اور اس پر کچھ مواد جمع کر بھی لیا تھا، لیکن افسوس ہے بعض اور دوسرے منصوبوں کی طرح یہ منصوبہ بھی پریشان خاطری اور پراگندہ دماغی کی نذر ہو گیا،

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

بہرحال غزوۂ بدر کی بحث کے خاتمہ پر اس سلسلہ کی روایات کے پیچ و خم پر مختصر گفتگو ہم اس مقالہ میں بھی کریں گے، وباللہ التوفیق

اداروں اور انجمنوں کی علٰحدہ علٰحدہ مساعی کے مجموعی دباؤ کی پیش رفت سمجھتی ہے، جو کسی نہ کسی طرح اسلام کو فائدہ پہنچاتی ہوں۔ خواہ وہ اسلام کے کسی ایک یا چند پہلو ہی کی تبلیغ میں کوشاں کیوں نہ ہوں اور خواہ ان کی دوسری سرگرمیوں کی تشکیل ان اصولوں پر نہ ہو جو اسلام کی حقیقی تعلیمات سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اس تصور کے مطابق یہ بھی ضروری نہیں کہ ان تنظیموں، انجمنوں یا جماعتوں سے وابستہ افراد کا فہم ان کے نصب العین کے شعوری طور پر مطابق واس سے ہم آہنگ ہو۔ نیز یہ کہ وہ یہ سمجھتے ہوں کہ ان کی مساعی دراصل ان کے مذہب کی بقار وقیام کی خاطر یا بالفاظ دیگر رضائے الٰہی کے لئے ہے اپنی تفصیل میں یہ تصور بتاتا ہے کہ یہ ایک حیرت انگیز بات ہے کہ امت نے ابتدا ہی سے اپنے فکری وتاریخی تسلسل میں تفردات کو ٹھکرا کر صرف انھیں عناصر کو آگے بڑھایا ہے جو اسلامی مزاج کے مناسب حال تھے۔ اس کے مطابق سرسید کی تعلیمی تحریک، تحریکِ دیوبند، ندوۃ العلمار، جمعیۃ العلمار، تبلیغی جماعت، جماعتِ اسلامی حتیٰ کہ مسلم لیگ اور مسلم مجلس بھی اسلامی حرکیت کو آگے بڑھانے والی مختلف اکائیاں ہیں۔ ان اکائیوں میں علٰحدہ علٰحدہ ان کے روشن پہلوؤں کے ساتھ تاریک پہلو بھی ہو سکتے ہیں لیکن زمانی تواتر وتوالی میں اسلامی اساسیت کا مضبوط دباؤ ان غیر صالح اجزار کو تحلیل کر دیتا ہے اور آنے والی نسلوں کو صرف وہی اجزار منتقل کرتا ہے جو اسلامی تعلیمات کے مطابق اور اس کے مناسب حال ہوتے ہیں۔ اس کی مثال ایک دریا جیسی ہے جو راستے میں مختلف غلاظتوں سے دوچار ہوتا ہے لیکن اپنے طبعی سیلان کے ذریعہ ان غلاظتوں کو الگ ہٹاتا، پیچھے چھوڑتا صرف پاک وصاف پانی کے ساتھ آگے بڑھ جاتا ہے۔

مذہب کی ان دونوں تعبیروں سے الگ ایک تیسرا تصور بھی ہے جو اگرچہ ابھی بہت واضح اور مربوط شکل میں عوام کے سامنے نہیں آیا ہے اور مختلف اسباب کے تحت ان میں نفوذ وقبولیت سے محروم ہے پھر بھی اسے اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل افراد اور اپج رکھنے والے اذہان کی تائید حاصل ہے۔ یہ تصور ایک ایسے طبقہ کی طرف سے سامنے آیا ہے جو اپنی مسلمہ علمی وادبی حیثیت، وسیع المشربی اور بہتر مطالعہ کے باعث ہندوستانی سماج میں وہ مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکا ہے جس کا کہ وہ

ہو[1]" یا اس گروہ کے قائد اول کے الفاظ میں:

"تمام مسلمانوں کو یہ جان لینا چاہیئے کہ بحیثیت ایک مسلم جماعت ہونے کے ہمارا تعلق اس تحریک سے جس کے لیڈر انبیاء علیہم السلام تھے۔ ہر تحریک کا ایک خاص نظام فکر اور ایک خاص طریق کار ہوتا ہے۔ اسلام کا طریق کار اور طریق فکر وہ ہے جو ہم کو انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں میں ملتا ہے۔ ہم خواہ کسی ملک اور کسی زمانے میں ہوں اور ہمارے گرد وپیش زندگی کے معاملات ومسائل خواہ کیسی ہی نوعیت کے ہوں، ہمارے لئے نصب العین وہی ہے جو انبیاء علیہم السلام کا تھا اور اس نصب العین تک پہنچنے کا راستہ وہی ہے جس پر انبیاءؑ ہر زمانہ میں چلتے رہے۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔ یہ بات ہمارے مرتبہ سے فروتر ہے کہ ہم اس تنگ زاویہ نگاہ سے معاملات دنیا پر نگاہ ڈالیں جس سے ایک قوم پرست یا وطن پرست یا ایک جمہوریت پسند یا اشتراکی ان کو دیکھتا ہے[2]۔"

مختصراً اس گروہ کے نزدیک وہی تحریک تحریک اسلامی کہلانے کی مستحق ہوسکتی ہے جو اقامت دین یا حکومت الٰہیہ وغیرہ کا نصب العین اختیار کرکے، ان دیگر نظام ہائے زندگی کے خلاف جو کہ اسلامی نظام زندگی سے جزواً یا کاملاً متقابل ہوں، منظم، مرلوط ورسمی جدوجہد کرے اور اسلام کے چند مخصوص اجزاء کی دعوت انسانوں کے کسی مخصوص گروہ کو دینے کی بجائے اسلام مجموعی (ان کی اپنی تعبیر کے مطابق) کا تصور رکھتے ہوئے بین الانسانی معاشرے کو اپنا مخاطب بنائے۔ اس طرح یہ مخصوص تصور اسلامی حرکیت کے اس دوسرے مفہوم سے بظاہر متصادم محسوس ہوتا ہے جو اس کو کسی

اسلامی حرکیت کا دوسرا مفہوم

مخصوص فرد، ادارہ یا جماعت کا فعل سمجھنے کی بجائے ان تمام افراد

---

[1] تحریک اسلامی ہند از مولانا صدر الدین اصلاحی ص ۳۴

[2] ترجمان القرآن جلد ۱۶ ص ۳۰۴

وہ اسے اپنے مخالفوں کے دل میں خوف پیدا کرنے یا اپنے خوف کو چھپانے کے لئے نہیں
استعمال کرتا بلکہ اللہ کی قوت وقدرت یاد دلاکر اپنی اور دوسروں کی ہمت بڑھانے اور
انھیں اس پر ابھارنے کے لئے کہ اس دنیا کو اپنے سعی وعمل سے ایسا بنا دیں کہ وہ خالق
کائنات کی عظمت کی گواہی دے۔ اب اس کی عبادت کا مفہوم بھی وسیع ہو گیا ہے اور
وہ ہر عمل کو جو اخلاقی اقدارِ عالیہ، علم وعرفان، خیر وبرکت، عدل وانصاف اور حسن ومحبت کے
لئے کرتا ہے، عبادت سمجھتا ہے۔ ....'' ص ۳۶۳

''عبادت کے تصور کی طرح اس کے تبلیغ کا تصور بھی بدل گیا ہے۔ وہ اسلامی اقدار کو
دنیوی علم وعقل اور اخلاق کی زبان میں جو کہ دنیا کی مشترک زبان ہے عام انسانی اقدار کی
حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ بعض لوگ ان اقدار کے ساتھ خود بخود اسلامی عقیدے
کو بھی قبول کر لیتے ہیں، بعض جو انھیں پہلے سے اپنے آبائی عقیدے کے لوازم کے طور پر
مانتے آئے ہیں انھیں اور زیادہ خلوص اور جوش سے ماننے لگتے ہیں۔ ہندوستانی مسلمان
ان آخر الذکر کو بھی خواہ وہ کسی مذہب کے بھی ہوں مسلمین بالعمل سمجھتا ہے، انھیں صاف
زندگی میں اپنا رفیق بناتا ہے اور ان کے ساتھ مل کر اپنے دیش میں اور پھر ساری دنیا
سچائی اور محبت اور انصاف ــــ قانونی، سماجی، معاشی انصاف کا جھنڈا بلند کرتا ہے۔''
ص ۳۶۴

عمرانی و تاریخی عوامل کی تاثر انگیزی

اسلام کا یہ تصور پیش کرنے والے انسان کی تہذیبی تشکیل میں کام کرنے والے ان عمرانی و
تاریخی عوامل کی تاثر پذیری کے بارے میں بے جا طور پر حساس ہیں
جو کہ انسان اپنے قدیم وطنی ماضی سے وراثۃً حاصل کرتا ہے اور
جو اس کے خیال کے مطابق اس کے ایمان کی نفی نہیں کرتے۔ اس تصور کے مطابق انسان کو اپنے
''لچکدار'' اساسی عقائد کو اُس جدید سیاسی ومعاشی ماحول سے جس میں کہ اس کے نفس کی آمد وشد
ہو رہی ہے اور جس سے وہ بیگانہ نہیں رہ سکتا، اس طرح مطابقت دینا چاہیئے کہ اس کا عقائدی

مستحق تھا۔ یہ گروہ ہندوستانی مسلمانوں کو ان کے جمہوری و دستوری فضا کا جزو لاینفک سمجھتے ہوئے

مذہب کا سیکولر اپروچ

کے مذہب کی جو تعبیر کرتا ہے اس کے مطابق اسے ہم اسلام کی سیکولر تعبیر کا نام دے سکتے ہیں۔ اسی مکتبِ فکر کی نمائندگی کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عابد حسین اپنی کتاب "ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں" کے آخری حصے میں لکھتے ہیں:

"یہ بظاہر ایک چھوٹی سی بات تھی لیکن اس نے مسلمانوں کے پورے تصور زندگی اور پورے اندازِ فکر کو بدل دیا۔ اس کی نظر میں ملّتیں مٹ کر اجزائے ایماں ہوگئیں۔ اور دیواریں جو تہذیبوں کو ایک دوسرے سے الگ رکھتی تھیں گر گئیں۔ اسے محسوس ہوا اور خلوص و شدت سے محسوس ہوا کہ انسانی تہذیب ایک اور ناقابلِ تقسیم ہے۔ اسے اپنی تہذیبِ نفس اور تکمیلِ ذات کے لئے ہر چیز جس میں اسے اپنے ایمان کی روشنی میں کسی اخلاقی قدرِ اعلیٰ کی جھلک نظر آئے خواہ وہ مشرق سے ملے یا مغرب سے، جنوب سے ملے یا شمال سے لینی ہے اور اپنانی ہے۔ طلب صادق نے اس کے اندر جذبۂ صادق بھی پیدا کر دیا اور عالمی تہذیب کی ہر صالح قدر خود بخود کھنچ کر اس کے پاس آنے لگی۔ علم اور علمی اندازِ نظر اس کی طرف اس طرح دوڑا جیسے کھوئی ہوئی بھیڑ اپنے چرواہے کی طرف دوڑتی ہے۔ آزادی اور مساوات کا جمہوری مزاج اس سے جھپٹ کر اس طرح گلے ملا جیسے بچھڑا ہوا رفیق ملتا ہے۔ معاشی انصاف کی سچی روح نے بڑے تپاک سے اسے سلام کیا جیسے مدتوں سے اسی کی تلاش تھی......" ص ۳۶۲

"اب وہ اپنی زندگی کے دو بڑے مقاصد سمجھتا ہے ایک عبادت اور دوسرے تبلیغ۔ مگر اب اس کے ذہن میں عبادت اور تبلیغ کا مفہوم اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے جو بیسویں صدی کے وسط میں تھا۔ جب وہ ایک تاریک و یاس انگیز دور سے گزر رہا تھا اس وقت اس کی عبادت خاک کی آغوش میں پیوستہ مناجات تک محدود تھی۔ اب وہ اس مناجات سے شروع ہوتی ہے اور سینۂ آفاق میں تکبیرِ مسلسل پر ختم ہوتی ہے۔ مگر تکبیر اب اس کا سیاسی نعرہ نہیں رہی بلکہ اس کی نفسِ حیات کی آمد و شد بن گئی۔ اب

ہے کہ برصغیر ہند کی یہ ڈیڑھ سو سالہ تاریخ اپنی بزم میں اتنی رنگارنگی اور تنوع لئے ہوئے ہے کہ مشاہد کا اپنے مزعومات اور مفروضات سے اٹھنا دشوار ہوتا ہے۔ دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہم تاریخی کیفیتوں کا مطالعہ کرتے وقت تاریخ کو اس کی حقیقی تعریف کی روشنی میں سمجھیں گے اور اسے مجموعہ وقوعات کا نام دینے کی غلطی نہ کریں گے۔ بلا شبہ تاریخ ایک آئینہ ہے جس میں ایک قوم کا اجتماعی سراپا دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کی اصل قامت اس کا رنگ روپ، اس کے خد و خال، اس کے جذبات و احساسات، ہر چیز کی جھلکیاں اس میں نظر آتی ہیں۔ تاریخ محض بادشاہوں کی داستان اور سیاسی بساط کے رنگ و آہنگ کا نام نہیں ہے، یہ تو پورے تہذیبی سرمایہ کی عکاس ہے۔ ماضی کے مختلف درجہ بند وقوعات ایک دوسرے کو جس طرح متاثر کرتے ہیں اور تاثر قبول کرتے ہیں اور اس باہمی تعامل سے ان میں جو رشتے استوار ہوتے ہیں، انھیں کا اکتسابی فہم علم تاریخ کہلاتا ہے۔

ہندوستان میں اسلام کی آمد

برصغیر ہند میں اسلام کے نام کے ساتھ جو لوگ آئے اور جنھیں یہاں استحکام حاصل ہوا، ان کی زندگیاں محبت و تبلیغ کے ان روحانی جذبات سے معمور نہیں تھیں جن کا کہ ان کا مذہب ان سے مطالبہ کرتا تھا۔ اسلام اپنی طبیعت کے اعتبار سے ایک مذہب ہے جو متصوفانہ طریقوں سے شخصیت کو اخلاقی استحکام بخش کر اجتماعی دائروں میں زندگیوں کی تشکیل کرتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ دور رسالت اور اس کے مابعد قریبی زمانہ کی مسلم زندگیاں رزم و بزم کی متخالف سمتوں میں جانے والی ابعاد سے یکساں طور پر عہدہ برآ ہونے کی جستجو کرتی نظر آتی ہیں۔ گل و سیف کی دوئی میں وحدت پیدا کرنے کی سعی میں ان کی کامیابی نے ایک قلیل عرصہ میں متمدن دنیا کے ایک بڑے حصے کو ان کی اجتماعی وجودیت سے آشنا کرا دیا تھا۔ دیگر عمرانی خطوں کے برعکس جہاں کہ فاتح افواج اپنے ساتھ پرخلوص مبلغین کا ایک گروہ بھی لاتی تھیں، ہندوستان میں "ہم نہیں سنتے کہ کسی (فوج) کے ساتھ مبلغین یا داعیین کا گروہ تھا۔ لیکن وہ اپنے مذہب سے بالکل بے تعلق بھی نہیں تھے۔ یہ صورت حال غزنی کے محمود کے ساتھ بھی تھی اور تیمور کے ساتھ بھی۔" یہی اسباب تھے جن کے باعث اسلام ہندوستان میں اس ہمہ گیر فطری تاثر پذیری میں ناکام رہا جس کا مظاہرہ اس نے دیگر

تشخص مجروح نہ ہونے پائے۔ ان کے مطابق موجودہ ہندوستان کا جمہوری مزاج، معاشرتی و معاشی عدل کے لئے دستوری اور رسمی سعی، علم و عرفان کا سیکولر اپروچ، مسلمان کے مومنانہ مزاج سے متغائر نہیں ہے۔ یہ قدریں اس کی اپنی ہیں اور اس کی تبلیغ و توسیع میں اس کی جدوجہد اس کی ایمانی انفرادیت کو تحلیل کر دینے کے مترادف نہیں ہوگی بلکہ اس کے برعکس وہ اس سے حقیقی معنوں میں دین و دنیا کی دوئی میں وحدت پیدا کر سکنے میں کامیاب ہو سکے گا۔[ؔ۵] اس تصور کے حامئین مسلمانوں کے گرد پھیلے ہوئے پیچیدہ ماحول کو زیر بحث لاتے ہیں اور معاشرتی تعلقات کو منضبط کرنے والے رسمی اور غیر رسمی اداروں کی بدلی ہوئی نوعیت اور پھیلتے ہوئے دائرہ اثر کو اہمیت دیتے ہیں۔ ماحول کی اس ہمہ گیر اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ اس سے جو اصول اخذ کرتے ہیں وہ عموماً ان قدروں سے تصادم پر منتج ہوتے ہیں جو کہ اسلامی اساسیات کے منطقی تقاضے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے استدلال کے لئے اساسی سرچشموں سے بے توجہی بھی اسے انحرافیت پسندی Apostasism کی طرف لے جاتی ہے۔ بہرحال یہ ایک منفی رجحان ہے جس پر بحث اپنا ایک الگ موضوع رکھتی ہے۔

جدید ہندوستان میں اسلامی فکر کی صحت مند نمائندگی کرنے والے جو گروہ موجود ہیں اور ان میں علٰحدہ علٰحدہ جو ارتباط و تنظیم ہے، آج سے تیس یا پینتیس سال پہلے اس کا فقدان تھا۔ یہ اپنی سرگرمیوں کے رخ اور اصطلاحات کے لئے اسباب و عوامل کے طور پر ہندوستان کی ماضی قریب کی تاریخ سے گہری وابستگی رکھتے ہیں۔ اس لئے انھیں صحیح طور پر سمجھنے کے لئے اس ماضی کا جائزہ لینا لابدی اور ناگزیر ہے۔ البتہ اس سلسلہ میں یہ بات اہم ہوگی کہ یہ جائزہ تعصبات اور قبل معتقدات Pre-supposition کی محدودیتوں سے الگ کر لیا جائے اور

تاریخ کا معروضی تجزیہ

معروضی انداز فکر اپنایا جائے۔ اس بات کی اہمیت خصوصاً اس لئے اور

---

۵ ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں ص ۲۴۴

دوسرا ہو اور قرآنی احکامات ان کو اس پر آمادہ کرتے ہیں۔[۱]" انگریز اپنے سیاسی غلبہ کے ساتھ ایک جدید تہذیب بھی لائے تھے اور ہندوستان میں "اسلام کو اب اس نئی مغربی تہذیب کا سامنا تھا جو اپنے ساتھ سیاسی حاکیت بھی رکھتی تھی۔ نئی نئی حاصل ہوئی طاقت کے نشے میں مخمور یہ غیر ملکی اپنی تہذیبی برتری کے تعلق سے ضرورت سے زیادہ بڑا اعتماد اور اپنے کو ایسے علاقوں کے لئے نئی روشنی کا پیغامبر سمجھتے تھے جہاں خود ان کے مطابق جہل کی مکمل تاریکی نیز ذہنی اور اخلاقی پستی چھائی ہوئی تھی۔"

سیاسی بحالی کی طرف سے مایوسی اور اس جدید طاقتور تہذیب سے خوفزدگی کا ملا جلا علٰحدہ علٰحدہ ردّعمل ہم اس زمانہ کے فوراً بعد کی مختلف شخصیتوں، اداروں اور تنظیموں میں دیکھتے ہیں۔ بالکل ابتدائی ردعمل کے مظاہر[۲] دو متوازی تعلیمی تحریکیں ہیں جن میں سے ایک سر سید کی علی گڑھ تحریک اور دوسری تحریک دیوبند تھی جس کے پیشوا مولانا قاسم نانوتوی اور رشید احمد گنگوہی وغیرہ تھے۔ یہ دونوں تحریکیں اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے اخلاص و رجائیت کی قدروں پر باہم مشترک ہونے کے باوجود ترکیب و طبیعت کے اعتبار سے حد درجہ مختلف و متغائر تھیں ان میں سے اول الذکر نے جہاں مسلمانوں کی تعلیمی بہتری، معاشی بحالی اور سیاسی آسودگی کے لئے جدوجہد کی وہیں عقائد و تاریخ کے تعلق سے کچھ ایسی معذرت خواہانہ Apologitic روش بھی اختیار کی جو راسخ العقیدہ مسلم علماء و عوام کے لئے ناقابلِ قبول تھی۔ اس کے ٹھیک برعکس ثانی الذکر طبقہ اپنی اساسیت پسندی کے باوجود اس فراست و بصیرت سے محروم تھا جو کہ ان کے مذہب کا ارتقائی و حرکت پذیر تصور پیدا کرتا ہے، جس کے مطابق وہ اپنے مذہب کو اس کی حقیقی صورت میں باقی رکھتے ہوئے منقلب حالات و ماحول کے مطابق بنا سکتے تھے۔ وہ اپنے مستقبل کی تعمیر بوسیدہ ماضی کی تابناک روایتوں پر کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے مغربی تہذیب کو جیسے اس کے صالح و غیر صالح عنصر کے ساتھ اپنانے کا

---

[۱] Islam in India's Transition to Modernity P. 136 by Karandikar

جگہوں پر کیا تھا۔ یہاں پر یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ مسلم افواج کو ابتداً جن اقوام پر عسکری و تہذیبی غلبہ حاصل ہوا تھا ان میں سے بیشتر ثقافتی اعتبار سے عروج پر تھیں جبکہ ہندوستان سیاسی مغلوبیت کے اس دور میں مذہبی و سیاسی ناوجدتی سے دوچار تھا۔ بہرحال مسلم قوم ہندوستان میں چھ صدیوں تک بلا شرکت غیرے حکمراں رہی اور پھر مختلف عوامل کے تحت جو ارتقائے معکوس شروع ہوا تو اس صورت حال پر منتج ہوا کہ جو قوم پہلے وطن دوست مجاہدین پیدا کرتی تھی اب اس کی آغوش میں 'بانکے' پرورش پانے لگے[۲۸]۔ نتیجۃً پندرہویں اور سولہویں صدی میں جن غیر ملکی عناصر نے اپنا دخول شروع کیا تھا وہ تجارتی دائروں سے ہٹ کر سیاست و سلطنت کے دائروں میں اپنا دباؤ محسوس کرانے لگے اور اس سے جس آویزش و نزاع کا آغاز ہوا وہ مختلف مرحلے طے کرتا ہوا بالآخر انیسویں صدی کی چھٹی دہائی کی ہولناک خونریزیوں پر ختم ہوا۔ یہی وہ زمانہ ہے جہاں سے ہماری جدید وطنی تاریخ کی ابتداء ہوتی ہے۔

۱۸۵۷ء کی ناکام مسلح جدوجہد جہاں مسلمانوں کے مکمل سیاسی سقوط پر ختم ہوئی وہیں ان کے لئے ابتلاء و آزمائش کے ایک نئے دور کا آغاز بھی ہوا۔ انیسویں صدی کے نصف بعد کی مسلم سماجیات اس قوم کے لئے معاشی دقتوں، سیاسی استبداد، مذہبی رقیبوں کی اثر پذیری نیز معاشرتی ناہمواریوں پر مشتمل ہے۔ غلط یا صحیح طور پر انگریزوں نے بغاوت کا ذمہ دار مسلمانوں ہی کو قرار دیا۔ چنانچہ کورنڈ نیکر کے الفاظ میں: "کچھ برطانوی افسروں نے یہ کہا کہ اس بغاوت کی ابتدا اور تحریک مسلمانوں کی طرف سے ہوئی ہے۔ بنگال سول سروس کا ایک عامل ہنری تھوماس ۱۸۵۸ء میں بغاوت کے بارے میں لکھتا ہے کہ "یہ مسلم سازش کا نتیجہ تھی۔ ان کے وسائل سے قطع نظر بھی، ہندو کبھی اس طرح کے کام میں ہاتھ نہیں ڈالتے نہ ڈال سکتے تھے۔ وے (مسلمان) ابتدائی خلفاء سے لیکر آج تک یکساں طور پر مغرور، غیر روادار، بے رحم اور کسی بھی ذریعہ سے اپنی برتری کے خواہاں نیز عیسائیوں سے گہری نفرت رکھنے والے رہے ہیں۔ وہ کبھی ایسی حکومت کی اچھی رعایا نہیں بن سکتے جس کا مذہب

۱۸۵۷ء کے بعد مسلم سماجیات

---

[۲۸] برصغیر ہندوپاک کی ملّتِ اسلامیہ مصنفہ اشتیاق حسین قریشی ص ۲۲۲

سرسید کی تحریک تجدد کو سمجھنے کے لئے دو باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ انھیں براہ راست مسلمانوں کی روحانی اور اخلاقی اصلاح سے اتنی دلچسپی نہ تھی جتنی ان کی ذہنی اور مادی ترقی سے۔ دوسرے یہ کہ ان کا جدید سائنس اور جدید تہذیب کا تصور کچھ رومانی قسم کا تھا .....[1]"

"مگر جب بمبئی میں ہندو مسلم فسادات ہوئے اور مہاراشٹر میں لوک مانیہ تلک کی سرپرستی میں گنپتی کا میلہ جاری ہوا اور گاؤ کشی بند کرنے کی تحریک شروع ہوئی تو شمالی ہند کے مسلمانوں میں بےچینی اور شبہ کی لہر دوڑ گئی جس کا اثر سرسید پر بہت گہرا پڑا۔ اس سے فائدہ اٹھا کر مسٹر بیک نے ان کو اس پر راضی کر لیا کہ محڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن کے نام سے ایک انجمن بنائی جائے جس کے مقاصد میں مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کرنا ان کو سیاسی شورش سے دور رکھنا اور سلطنت برطانیہ کے استحکام اور حفاظت میں مدد دینا سب سے اہم تھے جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا کہ یہ انجمن مسلمانوں کو کانگریس سے الگ رکھنے میں کامیاب نہیں رہی مگر پھر بھی مسلمانوں کے ایک حلقہ میں فرقہ وارانہ سیاست کے بیج نے جو اس نے بویا تھا بہت جلد جڑ پکڑلی۔ اس فرقہ پروری کا مقصد مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو بھڑکا کر ان کو ہندوؤں کے خلاف صف آرا کرنا نہیں تھا بلکہ ان کے لئے مخصوص سیاسی حقوق حاصل کرنے کی غرض سے ان کی الگ تنظیم قائم کرنا تھا ..." (ہندوستانی مسلمان ص ۶۱)

"محڈن ایسوسی ایشن سرسید کے بڑھاپے کی اولاد تھی جس نے اگلے ۱۹۰۰ء میں مسٹر بیک کے انتقال کے ساتھ دم توڑ دیا مگر فرقہ پروری کا وہ بیج بو گئی جو چھ سال بعد مسلم لیگ کی شکل میں پھوٹنے والا تھا۔[2]"

سرسید کے سیاسی خلفاء

چنانچہ سرسید کے سیاسی خلفاء مثلاً نواب وقار الملک اور محسن الملک وغیرہ نے دیگر سربرآوردہ، تعلیم یافتہ اور دولتمند مسلم زعماء جس میں مولانا

---

[1] اسلام اور عصر جدید نومبر ۱۹۶۹ء صفحہ ۶۸-۶۹
[2] ہندوستانی مسلمان ص ۶۱

مشورہ سرسید دے چکے تھے، بالکلیہ رد کردیا۔ پھر بھی اس ضمن میں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ نہ تو سرسید مذہب مخالف تھے اور نہ ہی علمار ترقی مخالف، جس کا ثبوت سرسید کے اس خاص تاثر سے ملتا ہے جو انھوں نے علی گڑھ سے فارغ طلبہ کی مذہب بیزاری پر ظاہر کئے تھے نیز دوسری طرف شاہ عبدالعزیز بہت پہلے انگریزی پڑھنے کا فتویٰ دے چکے تھے اور خود مولانا قاسم نانوتوی نے اپنی آخری عمر میں انگریزی پڑھنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔

سرسید احمد خاں

اس زمانے میں سرسید کی شخصیت خصوصاً انتہائی فیصلہ کن رہی ہے۔ بشیر احمد ڈار کے الفاظ میں کہ "۱۸۵۷ء کے بعد کی مسلم جدوجہد جو وہ اپنی زندگی کے تمام مذہبی، سیاسی، تعلیمی اور ثقافتی دائروں میں کر رہے تھے، اس ایک شخص کے گرد گھومتی ہے۔"[1]

سرسید کے تعلیمی، مذہبی اور سیاسی خیالات نے برصغیر میں بعد کے رجحانات اور تحریکوں کو متعین کرنے میں گہرا حصہ لیا ہے۔ ان کے افکار کو مفصلاً سمجھنے کے لئے ہم سطور ذیل میں کچھ اقتباسات نقل کرتے ہیں جو ڈاکٹر سید عابد حسین کی کتاب 'ہندوستانی مسلمان' اور ان کے تفصیلی مضمون 'عالم اسلام میں تجدد کی تحریکیں' شائع شدہ 'اسلام اور عصر جدید' سے ماخوذ ہیں:

"سرسید کو ہندوستان اور ہندوستانی قوم سے بڑی محبت تھی۔ اور وہ اپنے امکان بھر ان کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرنا چاہتے تھے۔ مگر ان کو خاص طور سے اپنے ہم مذہبوں یعنی مسلمانوں کی فکر تھی، اس لئے کہ وہ بہت زیادہ خطرہ میں تھے، انھیں انگریزی حاکموں سے نفرت تھی اور انگریز انھیں ۱۸۵۷ء کی بغاوت کا اصل ذمہ دار سمجھ کر ان کے دشمن ہو گئے تھے اور انھیں دبا کر رکھنا چاہتے تھے۔ سرسید نے مسلمانوں کی جماعت کو قعرِ مذلت سے اور مایوسی سے نکال کر ذہنی اور مادی ترقی کی راہ پر لگانے کے لئے ایک ہمہ گیر منصوبہ تیار کیا........"[2]

---

[1] 269 Religious thought of Sir Syed. by B.A. Dar

دارالعلوم عثمانیہ، ندوۃ العلماء اور دار المصنفین جیسے ترقی پسند اداروں کی بنیاد ڈالی وہیں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، پروفیسر یوسف حسین اور مولوی عبدالماجد دریا بادی جیسی شخصیتیں بھی پیدا کیں جنھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ مسلمانوں میں علمی و تحقیقی اسپرٹ کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی۔ دوسری طرف تحریک دیوبند نے بھی عوامی سطح پر مذہبی تعلیم کا ذمہ اپنے سر لیا اور مختلف شہروں و قصبوں میں چھوٹے بڑے مدارس قائم کئے۔ عوامی مذہبی تعلیم سے قطع نظر اس تحریک نے اپنے گرد ایسے علمی و روحانی لوگ بھی جمع کئے جنھوں نے بعد میں ملک کی جدوجہد آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا اور اولوالعزمی و حریت پسندی کی یادگار قائم کی۔ اس مرحلہ میں حالات کی اٹھان کچھ اس طرح ہوئی اور ایسے اتفاقی عوامل بھی پیش آئے جن کی وجہ سے مذکورہ بالا دونوں تحریکیں جو ایک دوسرے سے متوازی سفر کر رہی تھیں، اپنی وہ کیفیت برقرار نہ رکھ سکیں اور تیزی سے قریب آنا شروع ہو گئیں۔ سرسید اسکول کی اساسیت پسندی اور وابستگان دیوبند کی محدود وسیع النظری نے دونوں گروہوں کو بہت جلد ملا کر مطلوب مقاصد کے لئے مشترکہ جدوجہد کی راہ ہموار کر دی۔

مسلم سیاسیات

مسلم اجتماعیت کے اس تعلیمی پہلو سے ہٹ کر سیاسی دائروں میں مسلم لیگ نے کئی مد و جزر دیکھے۔ کانگریس کے ساتھ اس نے انتخابی سمجھوتہ بھی کیا اور اس کی بدترین مخالف بھی رہی۔ دیوبند سے اس کو مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا اشرف علی تھانوی کی صورت میں حامی بھی ملے اور مولانا حسین احمد مدنی اور مفتی کفایت اللہ جیسے مخالف بھی۔ ایک وقت میں یہ محض جاگیرداروں، صاحب ثروت اور طبقہ اشراف سے تعلق رکھنے والوں کا مجمع رہی جس کا کام وقتاً فوقتاً جمع ہو کر رزلیوشن پاس کرنے سے زیادہ نہیں تھا اور دوسرے وقت میں یہ لیاقت علی خاں اور محمد علی جناح وغیرہ جیسے عوامی لیڈروں کے زیر قیادت رہی جن کی معمولی تقریروں میں عوام غیر معمولی تعداد میں شریک ہوتے تھے۔ دوسری طرف خلافت تحریک نے اپنے اثرات میں اضافہ کرنے نیز اسے مزید یقینی بنانے کے لئے علماء کو سیاسی سرگرمیوں کی طرف متوجہ کیا جس کے نتیجہ میں جمعیۃ العلماء قائم ہوئی۔ مسلم لیگ اور جمعیۃ العلماء دونوں پارٹیاں پہلو بہ پہلو سفر کرتی ہوئی اپنے اثرات ترتیب دیتی رہیں۔ ابتدا میں ان کے

محمد علی جوہر، سر آغا خاں وغیرہ پیش پیش تھے، سے مل کر ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی جس کا مقصد ایک طرف انڈین نیشنل کانگریس کے متحدہ قومیت کے نظریہ کا توڑ تلاش کرنا تھا اور دوسری طرف ایجابی طور سے مسلمانوں کے لئے حکومت سے معاشی و تعلیمی مراعات حاصل کرنا تھا۔

فکری اور علمی میدان میں سرسید نے جو کچھ لکھا اس کا مقصد تو "مذہب اسلام کو عیسائی مشنریوں کے حملے سے بچانا اور یہ ثابت کرنا تھا کہ وہ سچا مذہب ہے اور اصولِ عقل و قوانینِ فطرت کے عین مطابق ہے[1]" اور دوسرا مقصد اسلام کی تعلیمات کی نئی تعبیر پیش کرنا اور جدید علمِ طبیعی اور مذہب اسلام میں ہم آہنگی پیدا کرنا تھا تاکہ تعلیم یافتہ مسلمان اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے معقول پسند اور روشن خیال ہوں اور نئے تقاضوں کا ساتھ دیں[2]" اس کے لئے سرسید نے متعدد کتابیں اور رسالے لکھے اور قرآن شریف کی تفسیر بھی لکھنی شروع کی۔ مگر قرآن کی تفسیر کے مطالعہ سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ مجموعی طور پر ان کا انداز وہی ہے جسے ہم نے رومانی اعتذار کہا ہے جو نہ راسخ العقیدہ لوگوں کو مطمئن کر سکتا تھا اور نہ تجدد پسندوں کو[3]۔"

"سرسید کی اسلام کی تعبیر کی کوشش کو دوستوں اور دشمنوں دونوں کی طرف سے شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا[4]۔" چنانچہ ان کے انتقال کے بعد ان کے غیر سیاسی رفقا میں مولوی چراغ علی کو چھوڑ کر

سرسید کے غیر سیاسی رفقاء

جنھوں نے تجدد پسندی میں سرسید سے بھی زیادہ غلو کیا اور نتیجۃً راسخ العقیدہ مسلمانوں کے لئے ناقابلِ التفات بن گئے، سبھی نے سرسید کی قدامت پسندی مخالف اور ترقی پسندانہ اور روشن خیالانہ رجحانات سے مستفید ہونے کے باوجود عقائدی دائروں میں عمومی خیالات سے قربت برقرار رکھی۔

نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی اور مولانا شبلی کی جامع اور ہمہ گیر شخصیتوں نے جہاں ایک طرف

---

[1]، [2]، [3] اسلام اور عصر جدید نومبر ۱۹۷۱ء ص ۷۱، ۶۹، ۶۹

[4] سرسید کے مذہبی افکار، مصنفہ بشیر احمد ڈار

علمِ حدیث پر ایک الزام کا تحقیقی جائزہ

جناب ندیم الواجدی فاضل دیوبند

علمِ حدیث سے تعلق رکھنے والے واقف ہیں کہ حدیث پر ایک بڑے عرصے سے یہ الزام لگایا جاتا رہا ہے کہ اس کی کتابت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بہت بعد میں ہوئی ہے؟ اس الزام میں کہاں تک صداقت ہے؟ مقالے کا موضوع اسی سوال کا تحقیقی جائزہ لینا ہے۔ اس میں شک نہیں اگر یہ الزام ٹھیک ثابت ہو جائے تو بہت سے لوگ احادیث کے بڑے ذخیرے کو ناقابلِ اعتماد سمجھنے لگیں گے، اور اس طرح وہ لوگ منکرینِ حدیث کے فریب کا شکار ہو جائیں گے۔

الزام کی بنیاد

تاریخ کا یہ پہلو بڑا عجیب ہے کہ دین کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کے لیے جواز ہمیشہ قرآن وحدیث سے تلاش کیا جاتا رہا ہے۔ انکارِ کتابت حدیث کے لیے بھی حدیث کی کتابوں کے اوراق پلٹے گئے اور اس ذخیرے سے چند ایسی روایات نکال کر پیش کر دی گئیں جن میں کتابت حدیث سے روکا گیا ہے، اور روکنے والے خود سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس صورت میں یہ کس کی جرأت ہے کہ وہ کتابت حدیث کے جواز اور وقوع کو ثابت کرتا پھرے۔

حضرت ابوسعید خدری (م ۶۵ھ) کی اس حدیث کو خصوصیت کے ساتھ پیش کیا گیا جو حدیث کی بیشتر کتابوں میں معمولی فرق کے ساتھ ملتی ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تکتبوا عنی ومن کتب	آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھ سے کچھ مت لکھو، اور اگر کسی نے قرآن کے علاوہ

درمیان تعلق کی نوعیت خواہ کچھ بھی رہی ہو لیکن بعد کے زمانے میں یہ ایک دوسرے کی بدترین حریف اور رقیب بن گئیں۔ جمعیۃ العلماء کی زاہدانہ اور متقیانہ نفسیات پر زعمائے مسلم لیگ کے غیر مذہبی کردار اور طرز معاشرت کے ردّ عملی اثرات مرتب ہوئے اور وہ آہستہ آہستہ کانگریس سے قریب آتی گئی۔ اس کے اس طرز عمل میں گاندھی جی اور دوسرے کانگریسی قائدین کے گہرے سیاسی و شخصیتی تاثرات بھی عامل بنے۔ آئندہ سالوں میں حالات نے کچھ ایسا رخ اختیار کیا کہ یہ جماعت مسلم عوام سے سیاسی طور پر دور ہوتی گئی اگرچہ مذہبی قرب آخر تک برقرار رہا اور عوام اس کے زعماء سے اپنی عقیدت و محبت کا اظہار کرتے رہے۔

ان تمام اشخاص، اداروں، تحریکوں اور تنظیموں کے ساتھ عمومی مسلم زندگی میں اثر انداز ہونے اور

غیر رسمی عوامل

مجموعی ذہنیت کی تشکیل کرنے میں کچھ دوسری شخصیتیں و غیر رسمی عوامل و رجحانات بھی فیصلہ کن رہے ہیں۔ ان میں خصوصیت سے اکبر الہ آبادی اور حالی کی شاعری کے علاوہ ڈپٹی نذیر احمد، مولوی عبدالحلیم شرر وغیرہ کے تاریخی اصلاحی و معاشرتی ناول بھی قابلِ ذکر ہیں جنھوں نے ایک طرف مسلمانوں کو ان کا ماضی جو غیر قوموں پر ان کی عسکری و ثقافتی فتوحات پر مشتمل تھا، یاد دلایا اور دوسری طرف مسلم سماج کی دکھتی ہوئی رگوں پر انگلی رکھ کر معاشرتی اصلاح کی طرف متوجہ کیا۔ اس ضمن میں بین الاقوامی دائروں میں ہو رہے واقعات (جن کا تعلق براہِ راست مسلمانوں سے تھا) نے بھی اپنا رول ادا کیا۔ (باقی)

روایتوں سے واقف نہیں ہیں، یا ان روایات کے منشار و مقصد کا علم نہیں رکھتے وہ بہت آسانی سے متاثر ہوکر اس الزام کی صداقت کا یقین کر بیٹھتے ہیں۔

عربوں میں کتابت

ہم اپنے زیر بحث موضوع پر تفصیل سے گفتگو کرنے کے لیے اس مسئلہ پر بھی روشنی ڈالتے چلیں کہ عربوں میں کتابت کا رواج کیسا تھا؟ اس سے بھی منعِ کتابت کی احادیث کو سمجھنے میں مدد ملے گی، ساتھ ہی اس الزام کی حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ اسلام کتابت کا مخالف ہے، اور کاتب سے نفرت کرتا ہے، عرب اپنے لاثانی اور بے نظیر حافظے کے لیے بے پناہ شہرت رکھتے ہیں، حافظ ابن عبدالبر (م ۴۶۳ھ) تو حافظے کی قوت کو عربوں کی فطری عادات میں شمار کرتے ہیں۔

کانوا مطبوعین علی الحفظ، مخصوصین بذلک (۱) — حفظ عربوں کی فطری عادت تھا، اس میں انھیں خصوصیت حاصل ہے۔

کچھ آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے۔

کان احدھم یحفظ اشعار بعض فی سمعۃ واحدۃ (۲) — ان میں سے بعض تو بعض کے اشعار ایک ہی مرتبہ سننے میں یاد کر لیتے تھے۔

اور مثال میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ (م ۶۸ھ) کا واقعہ ذکر فرمایا کہ انھوں نے عمر بن ابی ربیعہ (م ۹۳ھ) شاعر کے ستر شعر کا طویل قصیدہ ایک ہی دفعہ سن کر حرف بحرف دہرا دیا تھا[۳] حضرت ابوہریرہ (م ۵۹ھ) کثرت سے احادیث بیان کرتے تھے، اس کا راز انھوں نے خود ہی بیان کیا ہے کہ جب لوگ اپنے اپنے کاموں میں لگے رہتے تو یہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہتے، اسی لیے انھوں نے بہت سی حدیثیں اور ایسی مخصوص باتیں سنیں جو دوسرے لوگ نہ سن سکے، ان ہی حضرت ابوہریرہ کے حافظے کا امتحان لینے کے لیے مروان بن الحکم (م ۶۵ھ) نے انھیں بلایا، اور یہ امتحان گاہ سے سرخرو ہوکر نکلے، آپ سے احادیث سنانے کی درخواست کی گئی اور جو کچھ آپ سناتے رہے۔ پسِ پردہ لکھا جاتا رہا، ایک سال بعد پھر بلایا گیا، اور اس مرتبہ پھر ان ہی حدیثوں کی فرمائش کی

۱؎ جامع بیان العلم ج ۱ ص ۳۵۔ ۲؎ ایضاً، ۳؎ ایضاً،

عنّی غیر القرآن فلیمحہ وحدثوا — مجھ سے کچھ لکھ لیا ہو اسے چاہیئے کہ مٹا دے ہاں
عنی ولا حرج (۱) — حدیث بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اس قسم کی روایات مسند احمد بن حنبل میں بھی ابوہریرہ (م ۵۹ھ) اور زید بن ثابت (م ۴۸ھ) وغیرہ سے موجود ہیں[۲] دارمی کی ایک روایت سے پتہ چلتا ہے کہ ابوسعید خدری (م ۶۵ھ) نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کتابتِ حدیث کی اجازت مانگی تھی مگر آپ نے انکار فرما دیا[۳] مگر ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے حضرت ابوسعید خدری (م ۶۵ھ) کو کتابت کرتے ہوئے دیکھ کر منع فرما دیا تھا (۴) حضرت ابوسعید خدری (م ۶۵ھ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر اس شدت کے ساتھ عمل پیرا تھے کہ جب ان سے ان کے ایک شاگرد ابونضرہ منذر بن مالک (م ۱۰۹ھ) نے درخواست کی کہ ہم جو کچھ آپ سے سنا کرتے ہیں لکھ لیا نہ کریں؟ آپ نے جواب میں فرمایا:- کیا تم احادیث کو مصاحف بنانا چاہتے ہو۔

ان نبیکم صلی اللہ علیہ وسلم کان یحدثنا — تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے حدیث بیان کرتے
فنحفظ فاحفظوا کما کنا نحفظ (۵) — اور ہم حفظ کر لیا کرتے تھے اسی طرح تم حفظ کر لیا کرو

حضرت زید بن ثابت (م ۴۸ھ) ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حدیث نہ لکھنے کا حکم دیا ہے[۶] ایک نہایت شدید روایت ابوبردہ بن ابی موسیٰ الاشعری (م ۱۰۳ھ) کی ملتی ہے روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے والد محترم حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ (م [illegible]) سے احادیث کی ایک کتاب نقل کی تھی انھیں اس کتاب کی اطلاع ہوئی تو ناراضگی سے ارشاد فرمایا: اگر اس میں قرآن کی آیات نہ ہوتیں تو میں اس کو جلا دیتا پھر انھوں نے پانی منگا کر اس کتاب کو دھو ڈالا[۷] الزام کی بنیاد ان ہی جیسی احادیث پر رکھی گئی ہے جو لوگ ان احادیث کے مقابلہ میں دوسری

۱؎ مسلم ج ۲ ص ۴۱۴، مسند احمد ج ۳ ص ۲۱، سنن دارمی ج ۱ ص ۱۱۹، ترمذی ج ۲ ص ۹۱ وغیرہ
۲؎ مسند احمد ج ۲ ص ۴۰۳۔ ج ۵ ص ۱۸۳ ۳؎ سنن دارمی ج ۱ ص ۱۱۹ ۴؎ مجمع الزوائد ج ۱ ص ۵۹ ۵؎ جامع بیان العلم ج ۱ ص ۳۲ و دارمی ج ۱ ص ۱۲۲ ۶؎ امتاع الاسماع ج ۱ ص ۱۱۹ ۷؎ مجمع الزوائد ج ۱ ص ۶۰

إنی لآمر بالبقیع فاسدّ آذانی مخافة ان یدخل فیها، من الخنا، فو اللہ مادخل فی اذنی شئٌ قط فنسیتہ[1]

میں بقیع سے گزرتے ہوئے اس خوف سے کان بند کر لیا کرتا ہوں کہ کہیں ان میں کوئی فحش بات داخل ہو جائے اس لیے کہ واللہ جو چیز کان میں پڑ گئی وہ بھول نہیں پایا۔

حافظوں اور ذکاوتوں کی اسی بے پناہ دولت کی وجہ سے عربوں کا خیال تھا۔

کان ھذا العلم شیئاً شریفاً اذا کان من افواہ الرجال فلما صار فی الکتب ذھب نورہ وصار الی غیر اھلہ[2]

یہ علم جب تک زبانوں میں رہا شریف تھا اور جب کتابوں میں آ گیا تو علم کا نور ضائع ہو گیا اور وہ نا اہلوں کے پاس چلا گیا۔

ایک شاعر کہتا ہے۔

اذا لم تکن حافظاً واعیاً — فجمعك للکتب لا ینفع[3]

اگر تو اچھا حافظ نہیں ہے۔ — تو کتابوں کو جمع کرنا لا حاصل ہے۔

عرب بڑے یقین کے ساتھ کہا کرتے تھے۔

حرف فی تامورك خیر من عشرة فی کتبك[4] — سینے میں ایک حرف کتابوں کے دس حرفوں سے بہتر ہے

عرب شعراء حفظ کے اس راز کو سمجھتے تھے، امام نحو شیخ خلیل (م ۱۷۵ھ) جنہوں نے علم عروض ایجاد کیا فرماتے ہیں۔

لیس بعلم ما حوی القمطر — ما العلم الا ما حواہ الصدر[5]

علم وہ نہیں جیسے کتاب محفوظ رکھے — علم وہ ہے جس کی سینہ حفاظت کرے

ایک شاعر نے ان لوگوں کی مذمت کی جو علم کاغذوں کے سپرد کر دیتے ہیں۔

استودع العلم قرطاساً فضیعہ — وبئس مستودع العلم القراطیس[6]

---

[1] جامع بیان العلم ج ۱ ص ۳۵ [2] جامع ج ۱ ص ۶۸ [3] ایضاً ص ۳۵ [4] ایضاً [5] ایضاً ص ۳۴ [6] ایضاً ص ۳۵۔

گئی، خود وہ شخص جو احادیث نوٹ کر رہا تھا حیرت سے کہتا کہ اس مرتبہ بھی بالکل وہی احادیث سنائیں اور ایک حرف بھی ادھر سے اُدھر نہ کیا[1] حضرت عبداللہ بن مسعود (م ۳۲ھ) کے شاگرد رشید حضرت علقمہ (م ۶۲ھ) اپنے بارے میں تحدیث نعمت کے طور پر ارشاد فرمایا کرتے تھے.

ماحفظت وانا شاب نکانی انظر　　　میں نے جوانی میں کبھی حفظ نہیں کیا تاہم ایسا
الیہ فی قرطاس اوورقۃ (۲)　　　لگتا تھا کہ کاغذ یا ورق پر دیکھ رہا ہوں.

اللہ اللہ کیا عالم تھا، حفظ کئے بغیر ان کی ذہانت اور حافظے کی یہ قوت، مشہور عالم حدیث ابو زرعہ (م ـــھ) فرمایا کرتے تھے.

ان فی بیتی ماکتبتہ منذ خمسین سنۃ　　　میرے گھر میں پچاس سال کا لکھا ہوا سرمایہ ہے
ولم اطالعہ منذ کتبتہ وانی لاعلم فی　　　جب سے لکھا ہے میں نے اس کا مطالعہ نہیں کیا۔ تاہم میں
ای کتاب ھو فی ای ورقۃ ھو فی ای　　　یہ جانتا ہوں کہ فلاں بات کس کتاب کس ورق، کس
صفحۃ ھو فی ای سطر ھو (۳)　　　صفحہ اور کس سطر میں ہے.

ان کے حافظے کا عالم یہ تھا کہ اگر کوئی حدیث ایک مرتبہ بیان کی اور سالہا سال بعد پھر اس کے سنانے کی ضرورت پیش آئی تو کوئی لفظ یا حرف کم و بیش کئے بغیر دہرا دی گئی[4] حضرت امام بخاری (م ۲۵۶ھ) کے استاذ محترم حافظ ابن راہویہ (م ۲۳۸ھ) سے کون واقف نہیں، ایک مرتبہ کسی عالم سے کسی مسئلہ پر بحث کے دوران کسی کتاب کی عبارت کے تعین میں اختلافِ رائے ہوا تو انھوں نے کتب خانے سے وہ کتاب منگوائی اور ان عالم سے کہا.

عُدمن الکتاب احدی عشرۃ ورقۃ ثم عُد سبعۃ اسطر۔ کتاب کے گیارھویں ورق کی ساتویں سطر دیکھ[5] مشہور محدث اور عالم امام زہریؒ (م ۱۲۴ھ) کے حافظے کا اندازہ خود ان کے اس بیان سے لگایا جاسکتا ہے.

[1] کتاب الکنی للنجاری ص ۳۳ [2] جامع ج ۱ ص ۲۴۲ [3] تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۳۷ -

[4] کتاب العلل مع الترمذی ج ۲ ص ۲۳۶ [5] تاریخ دمشق ج ۲ ص ۴۱۳

بعض صحابہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے میں طلباء کو لکھنا سکھانے کے لئے مقرر فرما دیا تھا[۱] یہ طلباء تاریخ اسلام میں اصحابِ صفہ کے نام سے مشہور رہیں، اس درس گاہ میں جو طلباء تعلیم حاصل کیا کرتے تھے ان کی تعداد چار سَو تک بتائی گئی ہے[۲] اسی طرح ایک صحابیہ شفا بنت عبد اللہ کو آنحضور نے مقرر فرمایا کہ ام المومنین حضرت حفصہ بنت عمر (م ۴۵ھ) کو کتابت کی تعلیم دیں[۳] بدر کی معرکۃ الآرا جنگ میں جو لوگ قیدی بنائے گئے انھیں آزاد کرنے کی یہ شرط لگائی گئی کہ جو قیدی لکھنا پڑھنا جانتا ہو وہ دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے، اس کے بدلے میں وہ شخص رہا کر دیا جائے گا[۴] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مخصوص کاتب حضرت زید بن ثابت (م ۴۵ھ) نے خود آنحضور کے حکم پر ان ہی سے کتابت سیکھی تھی[۵] زید بن ثابت (م ۴۵ھ) سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطوط لکھواتے، وہ آپ کو خطوط بھی پڑھ کر سناتے، اور آپ انھیں ان خطوط کے جوابات بھی املا کرایا کرتے تھے[۶]

کتابت سے آپ کی رضامندی

اگر روایات کے ذخیرے پر نظر ڈالی جائے تو ایسی احادیث بھی بکثرت مل جاتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ آں حضور نے کتابت یا کاتب سے نفرت کا اظہار نہیں فرمایا، بلکہ آپ نے کتابت پر رضامندی اور اس کو حاصل کرنے کا حکم دیا، صاحب مجمع الزوائد نے طبرانی اوسط کے حوالے سے عبد اللہ بن عمر (م ۷۳ھ) کی یہ روایت ذکر فرمائی ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا علم کو مقید کر لو
وسلم قیدوا العلم، قلت وما تقییدہ	میں نے عرض کیا علم کو کس طرح مقید کیا جائے،
قال الکتابۃ	آپ نے فرمایا کتابت (سے)

حضرت ابوہریرہؓ (م ۵۹ھ) اور حضرت انسؓ بن مالک (م ۹۳ھ) کی روایات ہیں کہ ایک شخص نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوءِ حفظ کی شکایت کی تو آپ نے ارشاد فرمایا اپنے دائیں ہاتھ سے

---

[۱] اسد الغابہ ج ۳ ص ۵۰۷ [۲] الاستیعاب ج ۲ ص ۳۹۳ [۳] مسند احمد ج ۳ ص ۳۷۱، فتوح البلدان ص ۴۷۷ [۴] مسند احمد ج ۱ ص ۲۴۷، الروض الانف ج ۲ ص ۹۲ [۵] فتوح البلدان ص ۵۱۲ [۶] تاریخ الطبری ص ۱۴۶۰ [۷] مجمع الزوائد ج ۱ ص ۱۵۲۔

جس نے علم کاغذ کے سپرد کر دیا اس نے ضائع کیا، وہ لوگ برے ہیں جو علم کاغذ کے سپرد کر دیتے ہیں۔
ایک شاعر کو اپنے حافظے پہ ناز ہے اور وہ اس کا اظہار کرتا ہے،

علمی معی اینما یممت ینفعنی بطنی وعاء له لابطن صندوقی
ان کنت فی البیت کان العلم فیه اوکنت فی السوق کان العلم فی السوق[1]

میرا علم جہاں بھی جاؤں میرے ساتھ رہتا ہے اور میرا باطن اس کا برتن ہے میرا صندوق اسکا بطن نہیں
اگر میں گھر میں ہوں تو علم بھی گھر میں ہے اور اگر بازار میں ہوں تو علم بھی بازار میں ہے

عربوں کو اپنے حافظے سے پیار تھا اور وہ کتابوں کو نفرت سے دیکھا کرتے تھے وہ سمجھتے تھے کہ علم کی حفاظت سینوں کے ذریعے ہو سکتی ہے، سفینوں کے ذریعے نہیں، اور شاید یہی وجہ ہے کہ اسلام سے پہلے پورے مکے میں صرف سترہ آدمی کتابت کے فن کو جانتے تھے[2] اور مدینے میں کاتبوں کی تعداد صرف نو تھی[3] علامہ اصفہانی (م ۳۵۶ھ) کے بقول اس قلت رواج کی بنیاد یہی تھی کہ لوگ اس فن کو ناپسند کرتے تھے[4]۔

اسلام نے کتابت کو عروج دیا

کتابت، کاتب، یا کتابوں سے عربوں کی نفرت کی وجہ یہی ہے کہ قدرت نے انھیں حافظے کی بے پناہ دولت سے نوازا ہے مگر اسلام نے اس نفرت کو پسند نہیں کیا، بلکہ کتابت کے فن کو رواج دینے کی کوشش کی اور بہت جلد کاتبوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا، کتابت کی اس قدر اہمیت ہوئی کہ جو لوگ کتابت، تیر اندازی اور تیراکی سے واقف ہوتے تھے انھیں "الکامل" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا[5] چنانچہ سعد بن عبادہ الانصاری (م ۱۵ھ) کو کاتب ہونے کی وجہ سے الکامل کہا جاتا تھا مؤرخ احمد بن یحیٰ البلاذری (م ۲۸۹ھ) کا بیان ہے کہ سعد بن عبادہ (م ۱۵ھ) کے ساتھ ساتھ اُسید بن حضیر انصاری[1] عبداللہ بن ابی اوفی (م ۸۹ھ) اور اوس بن خولی (م ۳۵ھ) سے قبل بھی الکامل کے لقب سے ملقب

[1] جامع ج ۱ ص ۲۹ [2] فتوح البلدان ص ۴۷۷ [3] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۱۱۔
[4] کتاب الاغانی ج ۱۶ ص ۳۰ [1] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۹۱ [5] فتوح البلدان ص ۴۷۷

طرف حضرت ابو سعید خدری (م ۶۵ھ) اور دوسرے بزرگوں کی احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ کتابت احادیث کی اجازت نہیں دوسری جانب اتنی سہت سی روایات موجود ہیں جو کتابتِ حدیث کی اجازت واباحت پر دلالت کرتی ہیں۔ ابن قتیبہ الدینوری (م ۲۷۶ھ) جنہوں نے اختلافِ حدیث کی تاویل پر ایک کتاب لکھی ہے، ان روایات میں نسخ کی توجیہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔

ان یکون منسوخ السنة بالسنة کانه نهی فی اول الامر عن ان یکتب قوله، ثم رای بعد لما علم ان السنن تکثر وتفوت الحفظ، ان تکتب وتقید (۱)

یا یہ کہ منسوخ السنۃ بالسنۃ ہو، گویا کہ پہلے آپ کے ارشادات لکھنے سے منع کر دیا گیا، پھر جب دیکھا کہ سنن کثیر ہوگئیں، اور فقط حفظ سے حفاظت نہ ہوگی لکھنے اور مقید کرنے کو جائز قرار دیا گیا۔

امام نووی (م ۶۷۶ھ) کی رائے یہ ہے کہ کتابت کی مخالفت ان لوگوں کے لیے ہے جن کے حافظے اچھے تھے اور ان سے نسیان کی امید نہ تھی۔ ہاں وہ صحابہ جو سوئے حفظ کا شکار تھے ان کے لیے کتابت کی اجازت تھی[۲] بلکہ علامہ شبیر احمد عثمانی (م ۱۳۶۹ء) کی رائے تو یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے لیے کتابت واجب اور ضروری ہے، وہ لوگ صرف حفظ پر اکتفا نہ کریں[۳] اس رائے کی تائید حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص (م ۶۳ھ) کی روایات سے بھی ہوتی ہے کہ ان کی سوءِ حفظ کی شکایت پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں کتابت کا حکم دیا تھا[۴] نووی (م ۶۷۶ھ) اس موقع پر یہ بھی ارشاد فرماتے ہیں کہ احادیث لکھنے کی مخالفت نزول قرآن کے زمانے میں ان لوگوں کے لیے تھی جو قرآن کے ساتھ ساتھ احادیث بھی لکھ لیا کرتے تھے یہ طریقہ کار ظاہر ہے غلط تھا، اس سے قرآن و حدیث میں التباس کا خوف تھا[۵] اگر دیکھا جائے تو یہ توجیہ بہت بہتر اور مناسب ہے، بہت سی روایات سے بھی اس کی تائید ہو جاتی ہے۔ منع کتابت کے سلسلے میں بڑے زور و شور کے ساتھ حضرت ابو سعید خدری (م ۶۵ھ) کی روایات پیش کی جاتی ہیں، ان کی یہ روایات مختلف کتابوں میں مختلف

---

۱ تاویل مختلف الحدیث ص ۳۶۵ ۲ شرح مسلم للنووی ج ۲ ص ۴۱۴ (مع مسلم) ۳ فتح الملہم شرح مسلم ج ۲ ص ۲۹۲ (مقدمہ) ۴ سنن دارمی ج ۱ ص ۱۲۵ ۵ شرح مسلم للنووی ج ۲ ص ۲۱۵۔

اپنے حفظ پر مدد لو[۱] استعانت بالمین یہ کتابت سے کنایہ ہے' اسی طرح حضرت جابر بن عبد اللہ (م ۷۸ھ) ارشاد فرماتے ہیں کہ آپ نے اپنے ہاتھوں سے کام لینے یعنی لکھنے کا حکم دیا[۲]۔ دارمی میں یہ ہی روایت حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص (م ۶۳ھ) سے ہے جس سے معلوم ہوتا ہے[۳] کہ شخص جس نے سوء حفظ کی شکایت کی تھی خود حضرت عبد اللہ بن عمرو ہی تھے[۴] یہ بھی ممکن ہے کہ ایسے لوگ کئی ہوں جن کو یہ شکایت تھی' اور جس کا علاج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا تھا'

مرضِ وفات کے دوران آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

ائتونی بکتاب اکتب لکم کتابا فلا تضلوا بعدہ[۵] — میرے پاس کاغذ لاؤ تمہیں ایک تحریر لکھ دوں تاکہ تم اس کے بعد گمراہ نہ ہو۔

اگرچہ حضرت عمرؓ کے منع کر دینے سے یہ تحریر لکھی تو نہ جا سکی تاہم اس سے یہ ظاہر ہو ہی گیا ہے کہ کتابت کا جواز موجود ہے' حضرت رافع بن خدیج (م ۷۴ھ) ارشاد فرماتے ہیں کہ ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ ہم زبانِ مبارک سے بہت سی باتیں سنا کرتے ہیں اور انھیں لکھ بھی لیتے ہیں' آپ نے اس کی توثیق کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کوئی حرج نہیں[۶] سرخسیؒ (م ۴۹۰ھ) نے ایک روایت ذکر کی ہے کہ اہل فارس نے حضرت سلمان فارسی کو خط لکھا کہ وہ سورۂ فاتحہ کا ترجمہ کر کے بھیج دیں' چنانچہ حضرت سلمان نے یہ ترجمہ فارسی روانہ کیا[۷] ظاہر ہے کہ یہ ترجمہ آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر کیسے کر سکتے تھے۔

روایات کے عظیم الشان ذخیرے میں لا تعداد شہادتیں موجود ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت یا کاتب سے نفرت نہیں کی' بلکہ آپ نے اسے پسند فرمایا بلکہ بعض مواقع پر حکم بھی فرمایا

تضادِ روایات کا حل

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخران روایات کے باہمی تضاد و اختلاف کا حل کیا ہے؟ ایک

---

[۱] مجمع الزوائد ج ۱ ص ۱۵۲ [۲] کنز العمال ج ۵ ص ۲۲۶ [۳] دارمی ج ۱ ص ۱۲۵ [۴] بخاری ج ۱ ص ۲۱' و ۲۲' [۵] مجمع الزوائد ج ۱ ص ۱۵۱ [۶] مبسوط ج ۱ ص ۳۷ [۷] (م ۲۳ھ)

اس طرح تیار ہوئے، احادیث کی کتابوں میں ایسی روایات بکھری پڑی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں صحابہ لکھتے رہے ہیں، ان سب روایات کو جمع کرنا مشکل ہے، تاہم بطور مثال چند صحیفوں اور مجموعوں کی نشان دہی کی جاسکتی ہے۔

بخاری میں حضرت ابوہریرہ کی ایک روایت ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ایک خطبہ جو قبیلہ خزاعہ میں ایک قتل کے موقع پر ارشاد فرمایا گیا تھا یمن کے ایک شخص کو لکھ کر دینے کا حکم فرمایا تھا، بخاری کتابتِ علم کے باب کی اس روایت میں اس شخص کے نام کی صراحت موجود نہیں بلکہ صرف لابی فلاں کے الفاظ ہیں، مگر دوسری روایتوں سے جو خود بخاری میں دوسری جگہوں پر ہیں اس کی تصریح ہے کہ اس یمنی شخص کا نام ابوشاد تھا[1] اس خطبے کے بارے میں جب امام اوزاعی (م ۱۵۷ھ) سے سوال کیا گیا کہ یہ خطبہ لکھ کر دے دیا گیا تھا، اور کیا لکھنے والوں نے بعینہ وہی خطبہ لکھا، اس پر اوزاعی (م ۱۵۷ھ) نے جواب میں فرمایا

نعم ھذہ الخطبۃ التی سمعھا من النبی صلی اللہ علیہ وسلم — ہاں یہ وہی خطبہ تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا۔

رافع بن خدیج (م ۷۴ھ) کے بارے میں ایک روایت ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یارسول اللہ ہم زبانِ مبارک سے بہت سی باتیں سنتے ہیں اور پھر انھیں لکھ بھی لیتے ہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا: کوئی حرج نہیں ہے[2] ان ہی صحابی کے محترم چچا حضرت ابورافع (م ۳۵ھ) کے ترجمے میں حافظ ابن حجر (م ۸۵۲ھ) نے لکھا ہے کہ انھوں نے بھی آں حضور سے کتابتِ حدیث کی اجازت حاصل کی تھی[3] حضرت ابوہریرہ (م ۵۹ھ) کی حدیث ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص (م ۶۳ھ) احادیث لکھا کرتے تھے

بخاری کے الفاظ یہ ہیں۔

---

[1] بخاری ج ۱ ص ۲۲ [2] عینی شرح البخاری ج ۱ ص ۵۶۷ [3] مجمع الزوائد ج ۱ ص ۱۵۱ [4] تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۴۴۰

الفاظ کے ساتھ مذکور ہیں مجمع الزوائد میں یہ روایت کچھ تفصیل سے موجود ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کتاب اللہ کے ساتھ احادیث بھی نوٹ کی تھیں، جس پر آپ نے ناگواری ظاہر فرمائی اور اس طرح لکھنے سے منع فرمایا۔ آپ کے الفاظ یہ ہیں۔

أكتابٌ مع كتاب الله امحضوا كتاب الله واخلصوه (۱)　　کیا کتاب اللہ کے ساتھ کوئی اور کتاب بھی ہے، اللہ کی کتاب بالکل علیحدہ کر لو

اسی طرح حضرت ابوبردہ (م ۱۰۴ھ) کے والد محترم کا واقعہ کہ آپ نے اپنے صاحبزادے کے پاس احادیث کا مجموعہ دیکھا جو خود ان سے نقل کیا گیا تھا، اسے دیکھ کر ارشاد فرمایا۔

لولا ان فيه كتاب الله لاحرقته[۲]　　اگر اس میں اللہ کی کتاب نہ ہوتی تمیں اس کو جلا دیتا۔

حضرت ابوہریرہ (م ۵۹ھ) کی ایک طویل حدیث سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ کتاب اللہ کے ساتھ کوئی اور کتاب نہ لکھی جائے یہ تو معلوم ہی ہے کہ یہ جلیل الشان صحابی ان حضرات میں شامل ہیں جن سے منع کتابت کی روایات موجود ہیں، آپ کی بعض روایتوں سے صاف یہ ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث لکھنے پر صرف اس لیے ناراضگی ظاہر کی تھی کہ صحابہ قرآن کے ساتھ احادیث بھی لکھ لیا کرتے تھے، ان روایات سے یہ بھی انکشاف ہوتا ہے کہ بعض صحابہ نے ایسی بہت سی کتابیں جلا ڈالی تھیں جن میں کتاب اللہ اور حدیث دونوں شامل تھیں[۳] یہ ہی وجہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منع فرما دینے کے باوجود بہت سے صحابہ لکھتے رہے، اگر مخالفت کی بنیاد یہ نہ ہوتی جو بیان کی جا رہی ہے تو صحابہ یقیناً رکتے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مخالفت موقتی تھی مطلق نہ تھی، جب وہ اندیشے جاتے رہے جس کی بنیاد پر کتابت سے روکا گیا تھا تو اس کی اجازت دے دی گئی

عہد نبوی کے احادیثی ذخیرے

نہیں کہا جا سکتا کہ آنحضور کے زمانے میں کل کتنے صحابہ نے احادیث لکھیں، اور کتنے مجموعے

۱؎ مجمع الزوائد ج ۱ ص ۱۵۹ ۲؎ ایضاً ص ۱۶۰ ۳؎ مسند احمد ج ۳ ص ۱۲، ۱۳۔ و ج ۲ ص ۳۴ و ۳۵

مایرغبنی فی الحیاۃ الا الصادقۃ[1]　　مجھے زندگی میں صرف صادقہ پسند ہے۔

یہ صادقہ آپ کے پوتے شعیب کو مل گیا تھا، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو کتابیں شعیب کو حاصل ہوئی تھیں ان میں صرف یہ ہی ایک صحیفہ نہ تھا بلکہ اور کتابیں بھی تھیں، حافظ کا یہ بیان دیکھئے۔

وجد شعیب کتب عبداللہ فکان یرویھا عن جدہ[2]　شعیب کو حضرت عبداللہ کی کتابیں ملیں یہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں پھر یہ صحیفہ شعیب کے بیٹے عمرو (م ۱۱۸ھ) کو حاصل ہوا وہ بھی الصادقہ سے روایت کرتے ہیں انھوں نے اپنے باپ کو بتایا بھی نہیں تھا[3] خدا امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ) کو جزائے خیر دے اپنی سند میں انھوں نے اس صحیفے کو شامل کر کے مسلمانوں کے لیے محفوظ بنا دیا ہے[4] اس صحیفے کے بارے میں یہ بھی تحقیق ہوئی ہے کہ مجاہد (م ۱۰۴ھ) نے اسے حضرت عبداللہ کے پاس دیکھا تھا، پوچھنے پر آپ نے بتلایا کہ اس میں وہ احادیث ہیں جو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وقت سنی ہیں جب میرے اور آپ کے علاوہ کوئی تیسرا نہ ہوتا تھا[5] گولڈ سیہر نے جو علم حدیث کا محقق مستشرق تسلیم کیا گیا ہے۔ اپنی ایک قابل قدر کتاب "تحقیقات اسلامیہ" میں ایک جگہ یہ ذکر کیا ہے کہ حضرت شعیب عبداللہ بن عمرو بن العاص کے پاس احادیث کا ایک مجموعہ رہا ہے، اسی جرمن محقق کا دعویٰ یہ بھی ہے کہ جابر بن عبداللہ (م ۷۸ھ) اور سمرہ بن جندب (م ۵۸ھ) کے پاس بھی احادیث کے مجموعے تھے، جابر بن عبداللہ کے مجموعۂ احادیث کے حوالے سے قتادہ (م ۱۱۷ھ) نے بہت سی احادیث بیان کی ہیں سمرہ بن جندب نے یہ نیا مجموعہ اپنے فرزند کے لیے ترتیب دیا تھا[1]

حضر موت کے ایک شاہزادے وائل بن حجر (آپ کی وفات معاویہؓ کے عہد حکومت میں ہوئی) جب اسلام لانے کے شوق میں مدینے حاضر ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں تین تحریریں دیں، خود وائل بن حجر کا بیان ہے۔

فلما اردت الرجوع الی قومی امرلی رسول　　جب میں اپنی قوم میں واپس جانے لگا تو آنحضرت

حاشیہ صد ۱۲۶ و صد ۱۲۷ [1]

[1] جامع بیان العلم ج ۱ ص ۷۷، واسد الغابہ ص ۸ و طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۷۷ [2] دارمی ج ۱ ص ۷۷ [3] [4] تہذیب ج ۸ ص ۵۴ [3] تہذیب ج ۸ ص ۵۳ [4] مسند احمد ج ۹ ص ۲۲۳-۲۳۳ [5] ابن سعد ج ۲ ص ۷۸

ما من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم　　آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ میں مجھ سے زیادہ
احد اکثر حدیثا عنہ منی الا ما کان　　سوائے عبداللہ بن عمرو کے کوئی حدیث بیان نہیں کرتا
عبداللہ بن عمرو فانہ کان یکتب ولا اکتب[۱]　　اس لیے کہ وہ لکھا کرتے تھے میں نہیں لکھا کرتا تھا

بعض اور روایات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے آپ کے پڑپوتے عمرو بن شعیب ۱۱۸ھ کی ایک روایت ہے کہ۔

عن عبد اللہ بن عمرو بن العاص قال یا　　بن عمرو بن العاص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
رسول اللہ اکتب کل ما اسمع منک　　سے عرض کیا کہ میں جو کچھ سنوں لکھ لیا کروں؟ آپ نے
قال نعم قلت فی الرضا والغضب قال نعم　　فرمایا' ہاں' میں نے کہا رضا و غضب دونوں میں
فانی لا اقول بعد ذلک کلہ الا حقا[۲]　　آپ نے فرمایا ہاں میں ہر حالت میں حق کہتا ہوں۔

خود عبداللہ بن عمرو بن العاص (م ۶۳ھ) اپنے ایک بیان میں فرماتے ہیں۔

بینما نحن حول رسول اللہ علیہ وسلم نکتب　　ہم آنحضور کے ارد گرد بیٹھے لکھ رہے تھے
اذ سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ای　　کہ آپ سے سوال کیا گیا کہ پہلے کون سا
المدینتین تفتح اولا قسطنطینیۃ او رومیۃ فقال　　شہر فتح ہوگا' قسطنطنیہ یا رومہ؟ آپ نے
النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا بل مدینۃ ھرقل اولا[۳]　　ارشاد فرمایا کہ پہلے شہر ہرقل فتح ہوگا۔

اس روایت سے یہ تو پتہ چلتا ہی ہے کہ حضرت عبداللہ لکھا کرتے تھے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے بہت سے صحابہ بھی آپ کی باتیں لکھا کرتے تھے۔ خیال ہے کہ حضرت ابن عمرو بن العاص جو احادیث لکھا کرتے تھے وہ اس صحیفہ میں ہوں جس کا ذکر بیشتر کتابوں میں موجود ہے اور جس کے بارے میں یہ تصریح موجود ہے کہ اس کا نام الصادقہ تھا اور اس میں ایک ہزار احادیث موجود تھیں[۴] اس صحیفے کے بارے میں خود حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کا ارشاد گرامی ہے۔

---

[۱] بخاری ج ۱ ص ۲۲ [۲] جامع بیان العلم ج ۱ ص ۷۲ [۳] داری ج ۱ ص ۱۲۶
[۴] طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۷۷ [۵] صفحہ ۴۸ پر ملاحظہ فرمائیے۔

احادیث غیر مستند بھی پہونچی ہوں[1] حضرت علیؓ بن ابی طالب (م ۴۰ھ) کے پاس بھی ایک مجموعہ تھا[2] بخاری کی ایک روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، ایک ساتھی کے سوال پر حضرت علیؓ نے اس صحیفے کا حوالہ دیا تھا[3] حضرت سعد بن عبادہ ابن الصامت (م ۱۵ھ) کے پاس بھی احادیث کا ایک مجموعہ موجود تھا، ربیعہ فرماتے ہیں (م ۱۳۶ھ) مجھے اس کی اطلاع سعد کے بیٹے نے دی تھی[4] حضرت عبداللہ بن عباس (م ۶۸ھ) پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ کتابت حدیث کے مخالف تھے مگر روایات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے خود احادیث لکھی ہیں[5] ابن سعد الواقدی (م ۲۳۰ھ) نے اپنی طبقات میں حضرت عبداللہ بن عباس کے مرتب کردہ بہت سے مجموعوں کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے وفات کے بعد چھوڑے[6] ترمذی کتاب العلل سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، آپ کے آزاد کردہ غلام عکرمہ (م ۱۰۵ھ) کی یہ روایت دیکھیے۔

اِن نفراً قدموا علی ابن عباس	اہل طائف کا ایک وفد ابن عباس
من اھل الطائف بکتب من کتبہ فجعل	کی خدمت میں ان ہی کی کتابوں میں سے کچھ
یقرأ علیھم[7]	کتابیں لے کر حاضر ہوا اور پڑھنے لگا

خود حضرت سعید بن جبیر (م ۹۵ھ) جو حضرت ابن عباس کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں فرماتے ہیں۔

اکتب عند ابن عباس فی صحیفۃ[8]	میں ابن عباس کے پاس ایک صحیفہ لکھتا ہوں

حضرت ابوہریرہؓ کے پاس بھی ایک صحیفہ موجود تھا[8] یہ صحیفہ حضرت ابوہریرہ نے اپنی زندگی کے آخری دور میں مرتب کیا تھا، حضرت امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ) نے اس صحیفے کو بھی اپنی مسند میں شامل کرلیا ہے[9] اور ایک عرصہ ہوا ڈاکٹر حمید اللہ سابق پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد نے کئی

---

[1] تاریخ کبیر ج ۴ ص ۱۸۲ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۵ کنز العمال ج ۵ ص ۲۳۷ [3] طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۷۷، طبقات الحفاظ ج ۲ ص ۵ [4] بخاری ج ۱ ص ۲۲ [5] ترمذی کتاب الاحکام ج ۱ ص ۱۸۰ [5] دارمی ج ۱ ص ۴۶ [6] طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۲۱۲ [7] ترمذی کتاب العلل مع ج ۲ ص ۲۳۷ [8] دارمی ج ۱ ص ۱۲۸ [9] طبقات الحفاظ ج ۲ ص ۳۱۲۔

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بکتب ثلاثۃ کتاب لی، وکتاب لی ولاھلِ بیتی وکتاب لی ولقومی[۱] صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے تین کتابیں عنایت فرمائیں ایک میرے لئے۔ ایک میرے اور گھر والوں کے لیے اور ایک میرے اور میری قوم کے لیے

ایک مرتبہ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص (م ۶۳ھ) نے حضراتِ صحابہ کی ایک جماعت سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں آپ کو حدیث بیان کرنے کی جرأت کس طرح ہوتی ہے، صحابہ نے فرمایا، اے بھتیجے جو کچھ ہم بیان کرتے ہیں ہمارے پاس لکھا ہوا ہے[۲]۔ حافظ ابن حجر (م ۸۵۲ھ) نے تہذیب میں یہ روایت نقل کی ہے کہ جابر بن عبداللہ (م ۷۸ھ) کے شاگرد وہب بن منبہ (م ۱۱۰ھ) اور سلمان بن قیس (م ۔۔ھ) آپ سے احادیث لکھا کرتے تھے، سلمان کی مکتوبہ حدیثوں کے مجموعوں سے شعبی (م ۱۰۶ھ) اور سفیان (م ۱۶۱ھ) نے استفادہ کیا ہے[۳] گولڈ سیہر نے حضرت جابر بن عبداللہ کے بارے میں کہا ہے کہ ان کے پاس بھی ایک صحیفہ تھا اور حضرت قتادہ اس صحیفے سے احادیث بیان کرتے تھے۔ خود بخاری کی تاریخ کبیر سے اسکی تائید ہوتی ہے، اس تاریخ میں حضرت قتادہ کا بیان ہے جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ مجھے یہ صحیفہ سورۂ بقرہ سے بھی زیادہ یاد ہے[۴]، اس صحیفے کو بھی مسند احمد میں سندات جابر میں دیکھا جا سکتا ہے مصنف عبدالرزاق کی زیارت کی سعادت نصیب نہیں ہوئی ہے، کہیں پڑھا ہے کہ محدث عبدالرزاق (م ۲۱۱ھ) نے اپنے مصنف کے ابواب الذنوب میں صحیفۂ جابر کی روایات نقل کی ہیں"۔

حضرت ابوبکر صدیق (م ۱۳ھ) نے بھی پانچ سو احادیث کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا تذکرۃ الحفاظ میں قاسم بن محمد (م ۱۰۶ھ) کی ایک طویل روایت ذکر کی گئی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے اس مجموعے کو صرف اس خوف کی وجہ سے تلف کر دیا تھا کہ ممکن ہے اس سے کچھ

---

[۱] تحقیقات اسلامیہ ج ۲ ص ۱۰۱ [۲] معجم طبرانی صغیر ص ۲۴۱، ۲۴۲ [۳] مجمع الزوائد ج ۱ ص ۱۵۲ [۴] تہذیب ج ۴ ص ۲۱۵۔

ملتے ہیں، سعد بن ہلال (م ۔۔۔ھ) کا ارشاد ہے کہ ہم جب حضرت انس سے بکثرت احادیث پوچھنے لگتے، تو وہ کتابوں کا ایک ذخیرہ نکال کر فرماتے کہ یہ حدیثیں ہیں جو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہیں، اور لکھ کر آپ پر پیش کی ہیں[۱] بیان غیر مبہم اور واضح ہے کہ حضرت انسؓ نے آنحضور کی احادیث لکھیں، اور لکھ کر آپ کو سنائی بھی، خود حضرت انس بن مالک بھی احادیث لکھنے کی ہدایت فرماتے تھے۔

یا بنی قیدوا العلم[۲] — بیٹو! علم کو مقید کرلو

اور اس حکم کی تعمیل کی گئی، ایک راوی فرماتے ہیں۔

رائت ابان یکتب عند انس ابن مالک[۳] — کہ میں نے ابان کو انس بن مالک کے پاس لکھتے ہوئے دیکھا۔

حضرت عبد اللہ بن عمر (م ۷۳ھ) کی روایات بھی قلم بند کی گئیں، ابن عمر کے آزاد کردہ غلام حضرت نافع (م ۱۱۷ھ)، آپ کے چہیتے شاگرد تھے اور خادم تھے، انھوں نے حضرت ابن عمر سے بکثرت روایات اور فتاوی نقل فرمائے ہیں ان ہی حضرت نافع کو لوگوں نے احادیث لکھاتے ہوئے دیکھا، ایک مجمع تھا علم کے پروانوں کا جو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سینوں میں بھی محفوظ کر رہا تھا اور سفینوں میں بھی[۴] ظاہر ہے کہ حضرت نافع جو احادیث لکھواتے ہوں گے ان میں سے بیشتر حضرت عبد اللہ بن عمر ہی کی ہوں گی۔

حضرت عائشہ (م ۵۷ھ) کی روایات بھی لکھی گئیں۔ لکھنے والے آپ کے بھانجے عروۃ بن الزبیر (م ۹۴ھ) تھے۔ ایک موقع پر آپ نے اس مجموعے کو تلف کر دیا تھا، زندگی بھر حسرت کرتے رہے کہ کاش میں اس مجموعے پر اپنا سب کچھ قربان کر دیتا۔[۵]

عبد اللہ بن ابی اوفی (م ۸۶ھ) کے متعلق بخاری[۶] نے کتاب الجہاد میں ایک روایت ذکر کی

۱؎ تقیید العلم للخطیب ص ۹۵ ۲؎ دارمی ج ۱ ص ۱۲۷ ۳؎ ایضاً ۴؎ دارمی ج ۱ ص ۱۲۵ ۵؎ تہذیب ج ۷ ص ۱۸۳ جامع ج ۱ ص ۷۵

مخطوطوں کی تحقیق و تصحیح کے بعد صحیفہ ھمام بن منبہ کے نام سے ترتیب دے کر شائع کر دیا تھا اس صحیفے کا اردو ترجمہ بھی اسی کے ساتھ منسلک ہے حضرت ابوہریرہ (م ۵۹ھ) کے پاس صرف یہی ایک صحیفہ نہ تھا بلکہ روایات شاہد ہیں کہ ان کے پاس احادیث کے بہت سے مجموعے تھے ایک مشہور صحابی عمرو بن امیہ ضمری (م ۶۰ھ) کے صاحبزادے بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ نے احادیث کے کافی مجموعے ترتیب دیئے تھے ایک مرتبہ حضرت ابوہریرہ کے سامنے کوئی حدیث بیان کی اور یہ بھی کہا کہ یہ حدیث میں نے آپ ہی سے سنی ہے، مگر حضرت ابوہریرہ نے انکار کیا اور کہا اگر یہ حدیث مجھ سے ہی سنی ہے تو میری کتابوں میں کہیں ضرور موجود ہوگی، راوی کہتے ہیں کہ ابوہریرہ نے میرا ہاتھ پکڑا اور اپنے کمرے میں لے گئے اور احادیث کے بہت سے صحیفے دکھائے، ان ہی ذخیروں میں وہ حدیث بھی مل گئی[۱] آپ حضرت ابوہریرہ کے مشہور شاگرد بشیر بن نھیک (م ۱۱۰ھ) فرمایا کرتے تھے۔

كنت أكتب ما اسمع من أبي هريرة	میں حضرت ابوہریرہ سے جو کچھ سنتا لکھ لیا
فلما اردت أن افارقه اتيته	کرتا تھا، جب میں نے ان سے رخصت
بكتابه فقرأته عليه وقلت له هذا	ہونے کا ارادہ کیا ان کے پاس ایک کتاب لایا
ما سمعت منك قال	اور ان کے سامنے پڑھی اور عرض کیا یہ وہ حدیثیں ہیں جو میں
نعم[۳]	نے آپ سے سنی ہیں، ابوہریرہ نے فرمایا، ہاں۔

حضرت عثمان بن مالک (م خلافت معاویہ) کے پاس بھی لکھی ہوئی احادیث موجود تھیں[۳] حضرت زید بن ثابت (م ۴۸ھ) نے علم الفرائض پر ایک کتاب لکھی تھی، اس کے بعض ٹکڑے بیہقی (م ۴۵۸ھ) نے اپنی سنن میں دیئے ہیں[۴] ایک صحیفہ حضرت ابوالحسان الاعرج کے پاس بھی تھا جو ان کی تلوار سے لپٹا ہوا تھا، اس میں تقریباً وہی احکام و مسائل تھے۔ جو حضرت علی کے مجموعے میں پائے جاتے ہیں[۵] مشہور صحابی حضرت انس بن مالک (م ۹۳ھ) کے پاس بھی مکتوبہ حدیثوں کے ذخائر

[۱] مسند احمد ج ۲ ص ۳۱۲ [۲] فتح الباری ج ۱ ص ۱۴۸، جامع بیان العلم ج ۱ ص ۷۴۔
[۳] دارمی ج ۱ ص ۱۲۷، تقیید الخطیب ص ۱۰۱ و جامع ج ۱ ص ۷۲ و کتاب العلل ترمذی ج ۲ ص ۳۳۸
[۴] بخاری ج ۱ ص ۲۲ [۵] سنن بیہقی ج ۶ ص ۲۴۸۔ سنن نسائی ج ۲ ص ۲۰۵

حضرت عمرو بن حزم (م ۵۱ھ) کو جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تو ایک تحریر بھی لکھوا کر ان کے حوالے فرمائی جس میں فرائض، صدقات اور دیات وغیرہ کے تعلق سے بہت سے احکامات درج تھے[1] اور اس کتاب کے بارے میں سعید بن المسیب (م ۹۳ھ) کا بیان ہے کہ میں نے یہ کتاب عمرو بن حزم کے بیٹوں کے پاس دیکھی تھی نسائی ج ۲ ص ۲۱۹ ارض طائف وج کے درختوں اور شکار وغیرہ کی تحریم کے لیے بھی آپ نے ایک تحریر خالد بن سعید کے ذریعہ تحریر کرائی البدایہ کے حاشیے میں سہیلی کے حوالے سے ہے کہ اس ارض طائف کی حرمت مکہ کی تحریم کی طرح تھی[2] معن راوی فرماتے ہیں کہ میرے سامنے عبد اللہ بن مسعود (م ۳۲ھ) کے فرزند ایک کتاب نکال کر لائے اور قسم کھا کر کہا کہ یہ میرے والد کی تحریر ہے[3]۔ شبرمہ سے بعض منسلک امراء نے اپنے شکوک کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ حدیثیں آپ کہاں سے بیان کرتے ہیں شبرمہ نے کہا ہمارے پاس لکھی ہوئی ہیں[4] جبلہ بن الایہم الغسانی (م ۵۳ھ) یہ نصاری عرب کے سربراہوں میں سے تھے آپ نے انھیں ایک خط تحریر فرمایا تھا جس میں اسلام کی دعوت دی گئی تھی[5]

اہل یمن کو بھی آپ نے کوئی تحریر بھیجی تھی، دارمی کی روایت کے الفاظ ہیں۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتب	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل یمن کو
الی اھل الیمن انہ لا یمس القرآن	لکھا کہ قرآن کو بغیر طہارت نہ چھوا جائے
الا طاھر، ولا طلاق قبل ملاك ولا	ملکیت سے پہلے طلاق نہیں ہے، اور خریدنے
عتاق حتی یبتاع[6]	سے پہلے عتاق نہیں ہے۔

مکہ کو حرم قرار دیا گیا، یہ حکم بھی تحریری شکل میں تھا۔ حضرت رافع بن خدیج (م ۷۴ھ)

---

[1] طحاوی ج ۲ ص ۴۱۷ و نسائی ج ۲ ص ۲۱۸ [2] البدایہ ج ۵ ص ۳۴ [3] جامع بیان العلم ج ۱ ص ۷۲ [4] ایضاً [5] البدایہ ج ۸ ص ۶۳ [6] دارمی ج ۲ ص ۱۶۱

ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ بھی احادیث لکھا کرتے تھے[۱] ابن جریج (م ۱۵۰ھ) ایک مرتبہ ہشام بن عروۃ (م ۱۴۶ھ) کے پاس ایک کتاب لے کر آئے اور کہا کہ یہ آپ کی احادیث ہیں جو میں آپ سے روایت کرتا ہوں، ہشام نے ابن جریج کی تصدیق کی[۲] سمرہ بن جندب (م ــــھ) کے پاس بھی ایک بڑا صحیفۂ حدیث موجود تھا، حافظ ابن حجر نے سلیمان بن سمرہ (م ــــھ حجاج کے دور میں) کے بارے میں لکھا ہے۔

روی عن ابیہ نسخۃ کبیرۃ۔[۳] عبداللہ بن حکیم (م ــــھ) کی ایک روایت ہے کہ آنحضور کی ایک تحریر قبیلہ جہینہ کے پاس سے ہمارے پاس پہنچی؛ اس میں احادیث بھی تحریر تھیں[۴] نسائی نے اپنی سنن کی کتاب الدیات کے ضمن میں سہل بن ابی خثیمہ (م ــــھ، خلافت معاویہ) کی ایک روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سہل کے قتل کے موقع پر قاتلین کو ایک تحریر لکھی تھی[۵] اس قسم کی روایتیں بھی موجود ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں صحابہ کو نماز، روزے، زکوۃ، حج، صدقات اور دیون کے متعلق بہت سے احکامات املا کرا دیے تھے[۶] اسی طرح آپ کی وفات کے بعد صحابہ کو ایک ایسا فرمان بھی تلوار سے لپٹا ہوا ملا جس میں صدقات کے احکام لکھے ہوئے تھے[۷] غالباً یہ وہی کتاب الصدقات ہوگی جس کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عمر کا بیان یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی کے آخری دور میں اپنے حکام و عاملین کے پاس بھیجنے کے لیے ایک کتاب لکھی تھی، لیکن اس کو روانہ کرنے سے پہلے ہی آپ کا وصال ہو گیا تھا" اس لیے وہ حضرت ابوبکر (م ۱۳ھ) کے دور خلافت میں عمال تک پہنچائی

---

[۱] بخاری ج ۱ ص ۳۹۷ [۲] کتاب العلل ج ۲ ص ۳۴۸

[۳] تہذیب ج ۴ ص ۱۹۸ [۴] ترمذی ج ۱ ص ۲۰۶ [۵] نسائی ج ۲ ص ۲۰۴۔

[۶] طبرانی ص ۲۱۷ کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال ج ۳ ص ۱۸۲، طبقات ابن سعد ج ۳۔ ص ۹، سنن دار قطنی ص ۲۰۴ و ص ۲۰۹ و ص ۲۸۵

[۷] سنن ابی داؤد باب زکوٰۃ السائمہ ص ۲۳۴ ج ۱ [۸] ترمذی ج ۱ ص ۷۹۔

(۸) ابن عبد البر — م سنہ ۴۶۳ھ — جامع بیان العلم وفضلہ

(۹) " " " — " " — الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب

(۱۰) ابن عساکر — سنہ ۷۷۶ھ — تاریخ دمشق

(۱۱) ابن کثیر — م سنہ ۷۷۴ھ — البدایہ والنہایہ

(۱۲) ابن قتیبہ — م سنہ ۲۷۲ھ — تاویل مختلف الحدیث

(۱۳) الطحاوی، ابو جعفر — م سنہ ۳۲۱ھ — شرح معانی الآثار

(۱۴) البخاری، ابو عبد اللہ — م سنہ ۲۵۲ھ — الجامع الصحیح

(۱۵) " " — " " — کتاب الکنی

(۱۶) الترمذی، ابو عیسیٰ — م سنہ ۲۷۹ھ — سنن ترمذی

(۱۷) " " — " — کتاب العلل

(۱۸) الاصبہانی، ابو الفرج — م سنہ ۸۹۷ھ — کتاب الاغانی

(۱۹) الطبرانی، ابو القاسم — م سنہ ۳۶۰ھ — معجم طبرانی صغیر

(۲۰) " " — " — طبرانی کبیر

(۲۱) السجستانی، ابو داؤد — م سنہ ۲۷۵ھ — سنن ابی داؤد

(۲۲) الشیبانی، احمد بن حنبل — م سنہ ۲۴۱ھ — مسند احمد

(۲۳) البلاذری احمد بن یحییٰ — م سنہ ۲۸۱ھ — فتوح البلدان

(۲۴) العینی بدر الدین — م سنہ ۸۵۵ھ — عمدۃ القاری فی شرح البخاری

(۲۵) البغدادی، خطیب — م سنہ ۴۶۳ھ — تقیید العلم الخطیب

(۲۶) سہیلی — م سنہ ۵۸۱ھ — روض الانف

(۲۷) سرخسی — م سنہ ۴۹۰ھ — مبسوط

(۲۸) العثمانی، شبیر احمد — م سنہ ۱۳۶۹ھ — فتح الملہم

ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ تحریر میرے پاس ایک خولانی چمڑے پر چڑھی ہوئی تھی[۱] ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) البدایہ والنہایہ میں الواقدی م ۲۰۷ھ سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب وفد عبدالقیس آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور اسلام لے آیا تو آپ نے انھیں صدقات اور دین کی تعلیمات واحکام لکھ کر عنایت فرمائے[۲] ۹ھ رمضان میں تبوک سے حجر کے سربراہوں نے اپنے اسلام لانے کی اطلاع بذریعہ زرعہ ذو زن مالک بن مرۃ الرہاوی کے ذریعے آنحضورؐ کی خدمت میں بھیجی، آپ نے اس کے جواب میں انھیں ایک خط تحریر فرمایا[۳]

ان تمام روایات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ احادیث کی کتابت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں ہو گئی تھی، یہ بلاشبہ تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ احادیث کی ترتیب وتدوین تابعین کے دور میں ہوئی، مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ احادیث کا ذخیرہ بے بنیاد اور ناقابل اعتماد ہے۔

"مآخذ ومصادر"

(۱) ابن الاثیر	۶۳۰ھ	اسد الغابہ
(۲) العسقلانی، ابن حجر	م ۸۵۲ھ	تہذیب التہذیب
(۳) " "	"	تقریب التہذیب
(۴) " "	"	الاصابہ فی تمییز الصحابہ
(۵) " "	"	طبقات الحفاظ
(۶) ابن خلکان	م ۶۸۱ھ	وفیات الاعیان
(۷) الواقدی، ابن سعد	م ۲۳۰ھ	الطبقات الکبیرات

[۱] مسند احمد بن حنبل ج ۴ ص ۱۴۱ [۲] البدایہ والنہایہ ج ۵ ص ۳۰

[۳] البدایہ ج ۵ ص ۷۵

آغا حشر کی غزلیں

از ڈاکٹر انجمن آرا انجم، علی گڑھ

آغا حشر فطری شاعر تھے۔ ان کی شعری صلاحیت کا اندازہ ان کے ڈراموں اور کلام سے بخوبی ہوتا
۔ انھوں نے شاعر کی حیثیت سے کوئی بڑا مقام تو حاصل نہیں کیا مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر وہ اپنی
ہیت اور تخلیقی قوت شاعری کے لئے اسی طرح صرف کرتے جس طرح اردو ڈرامے کی ترقی کے لئے
تو یقیناً وہ بہت اچھے شاعر ہوتے۔ ان کی غزلوں کو پڑھکر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ شاعری
اصولوں کو بڑی چابکدستی سے نبھاتے ہیں اور ان کو برتنے میں بہت محتاط ہیں اس لئے انھوں
بہت کم جگہ ٹھوکر کھائی ہے۔ ان کا اندازِ بیان سادہ، رواں مگر شگفتہ اور دلنشیں ہے۔ ان
یہاں آورد نہیں آمد ہے جو ان کی طباعی اور ذہانت کی دلیل ہے۔ ان کے کلام میں فلسفیانہ گہرائی
یت، زندگی کے عمیق مشاہدات و تجربات اور علو تخیل کی تلاش عبث ہے کیونکہ اپنی شاعری کے متعلق
و حشر نے کہا ہے:

حشر میری شعر گوئی ہے فقط فریادِ شوق — اپنا غم دل کی زباں میں دل کو سمجھاتا ہوں

یہ میری شاعری اے حشر شرحِ دردِ الفت ہے — وہی سمجھیں گے اس کو جو زبان دل سمجھتے ہیں

جگہ فرماتے ہیں

مرے ہر شعر میں اے حشر ہے مستی و رنگینی — غزل میری شباب یار کی تصویر ہوتی ہے

(۲۹) الذہبی، شمس الدین	م ۷۴۸ھ	میزان الاعتدال
(۳۰) " "	"	تذکرۃ الحفاظ
(۳۱) النسائی، عبدالرحمٰن	م ۳۰۳ھ	سنن نسائی
(۳۲) الدارمی، ابومحمد عبداللہ بن عبدالرحمٰن	م ۲۵۵ھ	سنن دارمی
(۳۳) البیقہی، ابوبکر احمد بن حسین	م ۴۵۸ھ	سنن بیقہی
(۳۴) الہندی علاء الدین	م ۹۷۵ھ	کنزالعمال فی سنن الاقوال والافعال
(۳۵) الدارقطنی علی بن عمر	م ۳۸۵ھ	سنن دارقطنی
(۳۶) طبری	م ۳۱۰ھ	تاریخ الامم والملوک
(۳۷) نورالدین	م ۸۰۷ھ	مجمع الزوائد
(۳۸) القشیری مسلم بن حجاج	م ۲۶۱ھ	الجامع الصحیح
(۳۹) نووی محی الدین	م ۶۷۶ھ	شرح مسلم
(۴۰) " "	"	تہذیب الاسماء والصفات
(۴۱) مقریزی	م ۸۴۵ھ	امتاع الاسماع
(۴۲) ابن حجر العسقلانی	م ۸۵۶ھ	فتح الباری
(۴۳) البخاری ابوعبداللہ	م ۲۵۲ھ	التاریخ الکبیر

حیات مولانا عبدالحیؒ

مولفہ جناب مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی

سابق ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء جناب مولانا حکیم عبدالحی حسنی کے سوانح حیات علمی و دینی کمالات و خدمات کا تذکرہ اور ان کی عربی و اردو تصانیف پر مفصل تبصرہ۔ آخر میں مولانا کے فرزند اکبر جناب مولانا حکیم سید عبدالعلیؒ کے مختصر حالات بیان کیے گئے ہیں۔

کتابت و طباعت معیاری تقطیع متوسط ۲۰×۲۶/۸ قیمت ندوۃ المصنفین

ڈر ہے کہ کہیں سعی کی طاقت بھی نہ لے لے　　　قسمت کو دعا کوشش ناکام دئے جا

شب فرقت کی کربناکی کا نقشہ کس اثرانگیزی سے کھینچا ہے:

کیا تجھ سے کہوں گزری کیا کیا شبِ فرقت میں　　　آنکھیں تھیں اور آنسو تھے تم آئے نہ موت آئی

شام فرقت کی تاریکی اور تنہائی میں دل کا داغ شمع کا کام دے رہا ہے:

بتائیں صبح سے کیوں جل رہا ہے دل کا داغ　　　شمع روشن کر رکھی ہے شام فرقت کے لئے

دنیا کی تمام رونق اور ہنگامے صرف انسان کی وجہ سے ہیں۔ جب تک زندگی ہے کشاکش بھی ہے اس کے بعد کچھ نہیں:

کشاکش زندگی کی ارتباطِ جسم وجاں تک ہے　　　یہ سب ہنگامۂ محفل ہماری داستاں تک ہے

بیان کی دلکشی، زبان کی شیرینی اور خیال کی معنی آفرینی کے لحاظ سے کیا حسرت کے ان اشعار کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے:

کہو زاہد سے کیوں ہے اس قدر فردوس پر نازاں　　　ہزاروں جنتیں آباد ہیں تخئیل اختر میں

جو سودائے محبت ہو تو حاجت کیا رفوگر کی　　　جنونِ فتنہ افزا کا گریباں چاک کر ڈالو

گنہگارِ وفا کو اس ادا سے دی سزا تو نے　　　کہ ناکردہ گنہ کو خواہشِ تعزیر ہوتی ہے

کہیں لڑکھڑائیں قدم مرے جو شراب شوق کے جذب سے

گروں اس طرح کہ ادا مری ترے در پہ فرض نماز ہو

نیاز عشق نے گل کے عوض سجدے بکھیرے ہیں　　　جہاں تیرا قدم دیکھا وہیں نقش جبیں پایا

اس کے علاوہ حشر نے شعر کے بارے میں اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے:

حقیقت شعر کی اے حشر بس ہم یہ سمجھتے ہیں　　کہ بجلی ہو اثر میں اور پانی ہو روانی میں

ان کے کلام میں اثر آفرینی ہو یا نہ ہو مگر سلاست و روانی اور فصاحت اور سادگی ان کی شاعری کی وہ خصوصیات ہیں جو نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ سلیس و فصیح طرزِ بیان کے باوجود ان کے یہاں شعریت اور تاثیر پالینا مشکل نہیں۔ محبت کی اہمیت، ہمہ گیری اور اس کو زندگی کا بنیادی عنصر سمجھ کس دلنشیں اور خوبصورت پیرایۂ بیان میں کہتے ہیں:

زندہ ہے تجھ سے روحِ طرب کائنات میں　　تو نغمۂ ازل ہے ربابِ حیات میں

آسودگیٔ روح، نشاطِ نظر نہیں　　دنیا میں کچھ نہیں ہے محبت اگر نہیں

حشر کے رنگِ شاعری، طرزِ ادا، بیان کی سادگی اور لطفِ زبان کا اندازہ مندرجہ اشعار سے کیجئے:

نہ چھیڑ اُمڈے گا اک طوفانِ فریاد آج پلکوں سے　　نوائے شورِ غم سازِ لبِ ساحل میں رہنے د

جنوں انگیز ہے رسوا نہ کر رازِ محبت کو　　یہ برقِ فتنہ ساماں پردۂ محمل میں رہنے د

سجدے نہیں یہ ہمدم جھک جھک کے پڑھ رہا ہوں　　لکھی ہے میری قسمت اس سنگِ آستاں پ

بنا دے دیوانہ عقل و دیں کو پھر آج اس چشمِ سرمگیں سے

ہے جس کی ہر گردشِ حسیں سے خرامِ موجِ شراب پ

محبوب کے التفات کے باوجود عاشق کبھی کبھی اپنے غم کا اظہار اس کے سامنے نہیں کر پا اس مضمون کو حشر نے اس طرح باندھا ہے کہ خیال اور زبان دونوں کا مزہ آگیا ہے:

صرفِ کرم تھی وہ نگہِ ناز بزم میں　　میں ہی نہ کہہ سکا غمِ دل التجا کے ساتھ

ایک جگہ کوششِ ناکام کو سراہتے ہوئے کہا ہے:

"ذرا خدا لگتی کہنا اور حشر کی اس نظم کو دیکھنا لفظوں اور معانی
کے لشکر نا آشنا میدانوں میں کس شان سے چڑھ کر آئے ہیں۔
طبع مسلم کے کمانڈر نے کیسی ہوش ربا مورچہ بندی کی ہے[۱]"

مسلمانوں کو اسلام کی عظمت وشان ، جاہ وجلال اور انسانیت نواز تعلیم کی یاد دلاتے ہوئے موجودہ پستی پر تاسف کا اظہار حشر نے یوں کیا ہے :

وہ پیامِ آخری ، اسلام جس کا نام تھا | وہ ظہورِ صدق ، جو پروردۂ الہام تھا
وہ تجلیٔ حقیقت ، جو ضلالت سوز تھی | گرمیٔ قلبِ محمدؐ سے تپش اندوز تھی
روشنی دنیا کو دی ، جس مہرِ عالمتاب نے | زنگِ فطرت دھو دیا جس نور کے سیلاب نے
ظلمت آگیں خلقتِ انساں کو بینا کر دیا | سنگریزے کو جلا دے کر نگینہ کر دیا
بارہا نالید و گفت اے قومِ ما بیدار شو! | حصۂ خود از حریفاں گیر و گرمِ کار شو!

مایۂ صد آفت است ایں گوش ناشنوائے تو | ہوش کن! از امروز گرد و خوار تر فردائے تو
شرم کن! محوِ ادائے کفر ساماں کردہ | آں دل وجانے کہ اول نذرِ قرآں کردہ

پھر مسلم قوم کو فاروقؓ اور حیدرؓ کا سا شیوہ اور کردار اختیار کرنے اور آئینِ خلیل اللہ کو زندہ کرنے کا پر جوش پیغام اس طرح دیا ہے کہ دلوں کی گہرائی میں اترتا چلا جاتا ہے :

سطوتِ فاروقؓ بنما ، شیوۂ حیدرؓ بگیر! | تاج از کسریٰ ستان و باج از قیصر بگیر!

بہرہ ور کر دل کو سوزِ احمدِ بے میم سے | جگمگا دے بزمِ جاں کو شمعِ ابراہیم سے
اپنی ہستی نذر دے ملت کی قرباں گاہ کو | زندہ کر دنیا میں آئینِ خلیل اللہ کو

۱۔ تجلیات حشر ، ص ۲۸۶

ایک دھندلا سا تصور ہے کہ دل بھی تھا یہاں — اب تو سینے میں فقط اک ٹیس سی پاتا ہوں میں

لہو ہو جائے دل گھٹ گھٹ کے پر آنسو نہ ٹپکیں گے — کریں گے ضبط مجبورِ ستم طاقت جہاں تک ہے

مگر حشر کا شاعرانہ رنگ، زورِ بیان اور فنکارانہ صلاحیت ان کی دو مشہور و معروف اور معرکہ آرا نظموں "شکریۂ یورپ" اور "موجِ زمزم" میں پوری طرح جلوہ گر ہے۔ یہ نظمیں اقبال کے رنگ میں لکھی ہوئی ہیں اور کچھ دیر کے لئے ان پر اقبال کی تخلیقات کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ الفاظ کی بندش، خطیبانہ انداز، جوشِ بیان، لہجے کا اتار چڑھاؤ، خیال اور فن کی ہم آہنگی اور ساتھ ہی فارسی زبان کے ادراک و احساس اور طرزِ ادا کی دلآویزی نے ان نظموں کو شاعری کا ایک اچھوتا نمونہ بنا دیا ہے۔

یہ دونوں نظمیں انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسوں میں پڑھی گئیں جہاں حشر نے سامعین کے دلوں پر رقت طاری کر دی اور نہ صرف ان سے خراجِ تحسین و عقیدت وصول کی بلکہ اپنے شاعرانہ کمال اور فنی مہارت کا پورا ثبوت دیا۔ پروفیسر علم الدین سالک نے "شکریۂ یورپ" کی مقبولیت کے بارے میں تحریر کیا ہے:

> "اس نظم کو اس درجہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ اس کے مطبوعہ نسخے جو ایک ایک آنہ پر فروخت ہونے شروع ہوئے تھے اس جلسہ میں ایک ایک پونڈ پر دستیاب نہ ہوسکے[1]۔"

ان نظموں کے ڈرامائی عناصر نے ان کو اور زیادہ موثر اور دلنشیں بنا دیا ہے۔ اس سے حشر کے پروازِ تخیل، ذہنی رسائی اور زبان و فن پر گہری روشنی پڑتی ہے۔

"شکریۂ یورپ" کے متعلق شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامی رقمطراز ہیں:

---

[1] علم الدین سالک، آغا حشر کاشمیری در تجلیاتِ حشر، مرتبہ سید محمد طفیل احمد بدر امروہوی ص ۳۵

جلوہ پرورد چراغ خلوتِ الہام ہوں | میں امانت دارِ سوزِ سینۂ اسلام ہوں
میری عظمت کی کہانی ہے حدیثِ کائنات | حاصل افسانۂ اوراق صبح و شام ہوں
لے کے آیا ہوں نوید کوثر آشامی یہاں | ساقیٔ خمخانۂ بطحا کا میں پیغام ہوں
آ تجھے بھی مست کردوں نغمہائے عشق سے | میں کہ گلبانگ نواپردازی ایام ہوں
می طپد صد جلوۂ شاداب در جانم ہنوز | تشنۂ ذوق تماشا ہست طوفانم ہنوز

اس نظم کے دعائیہ اشعار کا ایک ایک لفظ جوشِ اسلامی سے بھرپور اور روحانی کرب کا آئینہ دار ہے۔ ان اشعار میں اپنی کھوئی ہوئی تہذیب اور اسلامی کردار کو حاصل کرنے کی بے اختیار فضا کروٹیں لے رہی ہے اور ساتھ ہی اپنی خطاؤں اور گمراہیوں پر بے حد تاسف کا اظہار بھی ہے:

اے خدا دے زور دست خالد و حیدر ہمیں | پھر الٹنا ہے صفِ کفر و درِ خیبر ہمیں
مست تھی جس کے نشہ سے روحِ سلمانؓ بلال | ہاں پلا دے پھر وہی صہبائے کیف آور ہمیں
دل صنم خانہ بنا ہے یاد غیر اللہ سے | بت بھی اب کہنے لگے مسلم نما کافر ہمیں
المدد اے نعرۂ اللہ اکبر المدد | بتکدے کو پھر بنانا ہے خدا کا گھر ہمیں
تیری رحمت دیتی جاتی ہو تسلی ساتھ ساتھ | لے چلے جب شرمساری جانبِ محشر ہمیں
تیرے در کو چھوڑ کر ہم بینوا جائیں کہاں | یا بتا دے اور کوئی اپنے جیسا گھر ہمیں
دوسروں کو زور و زر دے عیش دے آرام دے | اور ہمیں اس دولتِ دنیا سے صرف اسلام دے

غزلوں میں لئے ہوئے مذکورہ بالا چند اشعار اور نظموں سے انتخاب کردہ بند اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ حشرؔ غزل کے میدان میں وہ بات پیدا نہ کر سکے جو نظم میں کی۔ غزل میں انھوں نے قدیم روش کو اپنایا ہے جبکہ نظم میں ان کے علمی ادبی جوہر کھل کر سامنے آئے ہیں۔ اس لئے ان کی نظمیں ان کی غزلوں سے کہیں زیادہ اثرانگیز، زبان و بیان کا اچھوتا نمونہ اور ان کے فن کا بہتر مظہر ہیں۔

•••

آگے چل کر یورپ کی سیاہ کاریوں کا نقشہ یوں کھینچا ہے :

اے زمینِ یورپ اے مقراضِ پیراہن نواز — اے حریفِ ایشیا اے شعلۂ خرمن نواز
چارہ سازی تیری بنیاد افگنِ کاشانہ ہے — تیرے دم سے آج دنیا ایک ماتم خانہ ہے
اشکِ حسرت زا سے چشمِ حیرت نمناک ہے — خونچکاں رودادِ اقوام گریباں چاک ہے

اس کے بعد یورپ کی مہربانیوں کا شکریہ طنزیہ انداز میں اس طرح ادا کیا ہے :

گرچہ اک دنیا کا دل تیری طرف سے خون ہے — امتِ خیر الوریٰ لیکن تری ممنون ہے
کون ہوں کیا ہوں کہاں ہوں سب حقیقت کھل گئی — تو نے وہ ٹھوکر لگائی چشمِ ملت کھل گئی
یک بیک خونِ تنِ بیجاں میں ہیجاں آگیا — قطرہ دریا بن گیا دریا میں طوفاں آگیا
بت شکن وحدت پرست اک جسم اک جاں ہو گئے — غل ہوا دنیا میں پھر کافر مسلماں ہو گئے
از کرم بپذیر یارب جوشِ بے اندازہ را — تا قیامت زندہ دار ایں زندگیٔ تازہ را

اس نظم کا مشہور آخری دعائیہ بند جس میں روح کا سارا سوز و گداز اور دل کا تمام درد سمٹ کر آگیا ہے جب حشر نے پڑھ کر سنایا تو سامعین کے ہاتھ بے اختیار بارگاہ ایزدی میں دعا کے لئے اٹھ گئے اور ان کی آنکھوں سے سیلابِ اشک جاری ہوگیا :

آہ جاتی ہے فلک پر رحم لانے کے لئے — بادلو ہٹ جاؤ دے دو راہ جانے کے لئے
ڈھونڈھتے ہیں اب مداوا سوزشِ غم کیلئے — کر رہے ہیں زخمِ دل فریاد مرہم کے لئے
رحم کر اپنے نہ آئینِ کرم کو بھول جا — ہم تجھے بھولے ہیں لیکن تو نہ ہم کو بھول جا
خوار ہیں بدکار ہیں ڈوبے ہوئے ذلت میں ہیں — کچھ بھی ہیں لیکن ترے محبوب کی امت میں ہیں
حق پرستوں کی اگر کی تو نے دلجوئی نہیں — طعنہ دیں گے بت کہ مسلم کا خدا کوئی نہیں

حشر کی دوسری مشہور و معروف نظم "موجِ زمزم" کا ہر بند خیال اور فن کا ایک حسین امتزاج ہے جو فنکار کی جولانیٔ طبع اور حریت پسندی کا ثبوت ہے۔ پر شکوہ الفاظ، بندش کی چستی اور جوشِ بیان نے اس نظم کا رنگ بھر دیا ہے۔ شانِ مسلمانی کا اظہار کتنے زوردار الفاظ میں کیا ہے :

کفایت المفتی

ایک قابل قدر دینی خدمت

میرے والد ماجد حضرت مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ رح کی وفات کے بعد جب مدرسہ امینیہ کی انتظامی خدمت مجھ ناتواں کے سپرد کی گئی تو اگرچہ اس خدمت کی ذمہ داری کا بار مجھ ناتواں و بے علم کے لیے کیا کم اہم تھا لیکن ایک عظیم مقصد اور بھی پیش نظر تھا جس کو سر کرنا نہایت کٹھن اور دشوار تھا یعنی مفتی اعظم رح کے فتاویٰ کو جمع کرنا، باب بندی کرنا اور کتابی صورت میں شایع کرنا ــــ ہمت کر کے اللہ کا نام لے کر حضرت کی وفات کے بعد سے اس کا مسودہ لکھنا شروع کر دیا تھا۔ جو ذخیرہ میرے سامنے تھا وہ ناکافی اور کم تھا اس لیے ضروری تھا کہ جو فتاوے پچاس برس کے عرصہ میں لوگوں کے پاس پہنچ چکے ہیں وہ حاصل کئے جائیں، اخبارات میں متعدد مرتبہ اعلان کیا گیا۔ اشتہار چھپوا کر روزانہ کی ڈاک میں پابندی کیساتھ ہزاروں بھیجا گیا۔ بار بار گزارش کی گئی کہ جن حضرات کے پاس حضرت مفتی اعظم کے قلم مبارک کے لکھے ہوئے فتاویٰ موجود ہیں وہ میرے پاس بھیجیں تاکہ مجموعہ میں شامل کئے جائیں مگر افسوس کیساتھ کہنا پڑتا ہے کہ حضرت مفتی اعظم کے عقیدت مندوں سے جس تعاون کی امید تھی وہ حاصل نہ ہو سکا یعنی باہر سے بہت تھوڑی تعداد میں فتوے دستیاب ہوئے، یہ مجموعہ کم از کم پندرہ سولہ ہزار فتاویٰ پر مشتمل ہونا چاہیئے تھا کیوں کہ حضرت مفتی اعظم نے پچاس برس مسلسل خدمت افتاء انجام دی، شاید ہی کوئی مسئلہ ایسا ہو جو آپ کے سامنے استفتاء کی صورت میں آیا ہو۔ افسوس کہ لوگوں نے اتنی تکلیف گوارا نہ فرمائی کہ اپنا کچھ قیمتی وقت صرف کر کے اپنے گھر کے سامان میں تلاش کرتے اور جو فتوے برآمد ہوتے وہ احقر کے پاس بھیج دیتے۔ ایسے کئی اشخاص ملے جنہوں نے خود فرمایا کہ ان کے پاس مفتی صاحب کے فتاویٰ کا خاصا ذخیرہ موجود ہے مگر افسوس کہ وعدہ کے باوجود انہوں نے بھیجنے کی زحمت گوارا نہ کی ــ غرضکہ سولہ برس کے عرصے میں جتنے فتوے مہیا ہوئے ان کا مجموعہ تیار ہوا جو تقریباً ساڑھے چار ہزار فتاوی پر مشتمل ہے اس مجموعہ کا نام کفایت المفتی ہے اس کی ۹ جلدیں ہیں جو شایع ہونی شروع ہو چکی ہیں ــ اب پھر درخواست ہے کہ جن حضرات کے پاس حضرت مفتی کفایت اللہ رح کا تحریر کیا ہوا کوئی فتوے موجود ہو وہ اولین فرصت میں تلاش کر کے احقر کے پاس مندرجہ ذیل پتہ پر روانہ فرمائیں ــ

حفیظ الرحمٰن واصف ــ مہتمم مدرسہ امینیہ اسلامیہ۔ کشمیری دروازہ۔ دہلی ۔ ۶ ۱۱۰۰۰

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

مرتبہ

سعید احمد اکبرآبادی

d. No. D. (D) 231 Phone 262815 FEBRUARY 1975

حکیم مولوی محمد ظفر احمد خاں پرنٹر پبلشر نے یونین پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر
دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶ سے شائع کیا۔

برہان

جلد ۷۴ | ماہ ربیع الاول ۱۳۹۵ھ مطابق مارچ ۱۹۷۵ء | شمارہ ۳

فہرست مضامین

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت - اسلام کا اقتصادی نظام - قانون شریعت کے نفاذ کا مسئلہ -
تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام - سوشلزم کی بنیادی حقیقت -

سنہ ۱۹۴۰ء غلامانِ اسلام - اخلاق وفلسفۂ اخلاق - فہم قرآن - تاریخِ ملت حصہ اول ' نبی عربی صلعم ' - صراطِ مستقیم (انگریزی)

سنہ ۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اوّل - وحی الٰہی - جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول -

سنہ ۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم - اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات)
مسلمانوں کا عروج وزوال - تاریخِ ملت حصہ دوم ' خلافتِ راشدہ ' -

سنہ ۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد اوّل - اسلام کا نظامِ حکومت - سرمایہ - تاریخ ملت حصہ سوم ' خلافتِ بنی امیہ '

سنہ ۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم - لغات القرآن جلد دوم - مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت (کامل)

سنہ ۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم - قرآن اور تصوف - اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے)

سنہ ۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اوّل - خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ - جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو -

سنہ ۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظمِ مملکت - مسلمانوں کا عروج وزوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم - حضرت شاہ کلیم اللہ دہلوی -

سنہ ۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم - تاریخِ ملت حصہ چہارم ' خلافتِ ہسپانیہ ' تاریخِ ملت حصہ پنجم ' خلافتِ عباسیہ اوّل '

سنہ ۱۹۴۹ء قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے (کامل)
تاریخِ ملت حصہ ششم ' خلافتِ عباسیہ دوم ' بصائر -

سنہ ۱۹۵۰ء تاریخِ ملت حصہ ہفتم ' تاریخِ مصر ومغربِ اقصیٰ ' تدوینِ قرآن - اسلام کا نظامِ مساجد -
اشاعتِ اسلام ، یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا -

سنہ ۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم - عرب اور اسلام - تاریخ ملت حصہ ہشتم خلافتِ عثمانیہ ' جارج برنارڈ شا

سنہ ۱۹۵۲ء تاریخ اسلام پر ایک طائرانہ نظر - فلسفہ کیا ہے ؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اوّل (جس کو ازسرِ نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے - کتابتِ حدیث -

سنہ ۱۹۵۳ء تاریخ مشائخ چشت - قرآن اور تعمیرِ سیرت - مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ -

بیٹھے، جہاں کوئی ناگواری ہوئی قابو سے باہر ہو گئے، تدبیر اور مصلحت کا کیا تقاضا ہے، اسلام
ان سے کس ضبط و نظم کا اور کن اخلاق اور صفات کا مطالبہ کرتا ہے! اس کی ذرا پروا نہیں،
گردشِ ایام نے انھیں کہاں پہونچا دیا ہے! اس کا ادنیٰ تصور بھی نہیں، اس ملک میں انھیں کس
طرح رہنا ہے! اس کا دور تک کوئی دھیان نہیں، جو قوم رخشِ عمر پر اس طرح سوار ہو کہ

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اس کو سلامتی سے منزل تک پہونچ جانے کی ضمانت کون دے سکتا ہے؟

راقم الحروف کا مقالہ "علامہ اقبال کا نظریۂ اجتہاد" جو حیدر آباد میں پڑھا گیا اور گذشتہ جنوری
کے برہان میں شائع ہوا تھا اسے ہندوستان کے اربابِ علم اور اصحابِ فکر و نظر نے کس نظر سے دیکھا! اس
کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حیدر آباد کے نہایت وقیع، سنجیدہ اور دیرینہ اخبار سیاست نے سیمینار پر
ضمیمہ شائع کیا اور مذکورہ بالا مقالہ کا تذکرہ کرتے ہوئے پہلے اس نے مقالہ نگار کی ذات اور
شخصیت کے متعلق اپنے حوصلہ افزا خیالات کا اظہار کیا، پھر مقالہ کو سیمینار کا ایک پر مغز مقالہ لکھا،
اس کے بعد اس کے مشتملات کا تجزیہ کیا اور آخر میں اس جملہ پر اپنا تبصرہ ختم کیا: "مولانا کے مقالہ نے
ان کے تبحر علمی اور ان کی باریک بینی کا لوہا منوا لیا" (سیاست مورخہ ۲۲ دسمبر ۱۹۷۴ء) لیکن جیسا کہ احباب
کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے پاکستان میں اس مقالہ کا خاص طور پر بڑا چرچا ہوا۔ یہاں تک کہ ۲۸
جنوری کے شام کے پروگرام میں پاکستان کے ریڈیو اسٹیشن نے اپنے ایک نشریہ میں اس مقالہ کا
تذکرہ کیا اور اس کا مفصل تعارف کرایا۔

حقیقت یہ ہے جیسا کہ اقبال نے خود کہا ہے، شاعری تو ان کے لئے صرف اظہار خیال کا
ایک ذریعہ تھی، ورنہ ان کے فکر و نظر کا محور اسلام کا احیا اور اس کی نشأۃ ثانیہ تھی، ان کی سب سے
بڑی تمنا اور آرزو یہ تھی کہ پورے عالم اسلام میں کم از کم ایک ریاست تو ایسی ہو جو ایک طرف سائنس

نظرات

پچھلے دنوں جامع مسجد دہلی کے علاقے میں جو واقعات پیش آئے اور ان کے سلسلہ میں پولس نے
جس بربریت و بہیمیت کا مظاہرہ کیا ہے اس کی جتنی بھی مذمت اور اس پر اظہار افسوس کیا جائے
کم ہے، آج کل جلسہ و جلوس، نعرہ بازی، پولس پر پتھراؤ روزمرہ کی چیزیں بن گئی ہیں لیکن یہ اندھیر
تو کہیں بھی نہیں ہوتا کہ چند سو انسانوں کے مجمع پر اپنی حفاظت کے نام پر پولس بے تحاشا فائرنگ
اس طرح شروع کردے کہ دس افراد (جن میں اکثر اٹھتی عمر کے نوجوان تھے) خاک و خون میں
غلطاں ہو کر جاں بحق ہو جائیں، سترہ اٹھارہ برس کی ایک لڑکی اپنے گھر میں ہی گولی کا نشانہ بنا
دو یا تین آدمی آگ میں زندہ جل بھن کر بھسم کر دیے گئے ہوں، پچاسوں زخموں سے چور
ہو گئے ہوں، متعدد دکانوں کو آگ لگا کر خاک سیاہ کر دیا گیا ہو اور کتنی ہی دکانوں کو کرفیو
کی آڑ میں لوٹ لیا گیا ہو، پارلیمنٹ میں مخالف پارٹیوں نے اس معاملہ کو بہت زور شور سے
اٹھایا اور پر جوش تقریریں کیں، لیکن اب تک گورنمنٹ نے ان واقعات کے لئے کوئی انکوائری
کمیٹی بھی مقرر نہیں کی ہے، اور مظلوم و ستم رسیدہ انسانوں میں روپیہ تقسیم کر کے ان کے آنسو پونچھنے
کی کوشش کر رہی ہے، لیکن عدل و انصاف کا تقاضا اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جب کہ مجرمین
کو ان کے جرم کی سزا ملے، تاکہ ان بھیانک مظالم کا مظاہرہ یہاں وہاں پھر کبھی نہ ہو اور کارکنان
حکومت ڈسپلن کے پابند رہیں۔

ساتھ ہی ہم کو مسلمانوں سے یہ کہنا ہے کہ زندگی کا یہ کیا ڈھنگ ہے کہ نہ اسلامی تعلیمات کا پاس
اور لحاظ ہے، نہ اپنے اہم تعمیری مسائل کی فکر ہے، نہ دوست اور دشمن میں امتیاز ہے، نہ زبان پر قابو
ہے اور نہ عمل اور کردار ڈسپلن کے پابند ہیں۔ نہ ماحول اور حالاتِ گرد و پیش کا کوئی احساس ہے، نہ
جذبات عقل و ہوش کے تابع ہیں، نہ اپنی بے مائگی اور تہی دامنی کا ادراک ہے، بس جو جی میں آیا

عہد نبوی کے غزوات و سرایا
اور
ان کے مآخذ پر ایک نظر

(۷)

سعید احمد اکبرآبادی

مدینہ میں تیاریاں

مدینہ میں عام چرچا تھا کہ ابوسفیان کا تجارتی قافلہ بڑے ساز و سامان اور تزک و احتشام کے ساتھ شام سے واپس آرہا ہے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متعین پالسی کے مطابق یہ طے تھا کہ قافلہ مدینہ کی راہ سے گذرے گا تو آپ صحابۂ کرام کے ایک دستہ کے ساتھ مدینہ سے نکل کر مقام بدر پر اس قافلہ سے تعرض کریں گے لیکن قدرت کو منظور کچھ اور ہی تھا، چنانچہ یہاں یہ سب تیاریاں ہو ہی رہی تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع پہونچی کہ ابوجہل ایک لشکر جرار لے کر روانہ ہوچکا ہے تو آپ نے یہ خبر اپنے ساتھیوں کو سنائی اور ان سے مشورہ کیا، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے یکے بعد دیگرے کھڑے ہوئے اور پر زور تقریر کی، لیکن آپ انصار کی رائے معلوم کرنا چاہتے تھے، کیونکہ انصار سے معاہدہ یہ تھا کہ دشمن مدینہ پر حملہ کرے گا تو انصار مدد کریں گے اور یہاں ظاہر ہے اب تک کوئی ایسی صورت نہیں تھی، اس بنا پر حضور نے مجلس مشاورت دراز کردی اور منتظر رہے کہ دیکھیں انصار کیا کہتے ہیں۔ انصار نے اس بات کو محسوس کرلیا تو حضرت سعد بن معاذ ان کے نمائندہ

اور ٹکنالوجی اور علوم وفنون کے اعتبار سے وقت کی ایک بالکل ماڈرن اسٹیٹ ہو اور دوسری جانب تہذیب وتمدن، فکر ونظر اور عقیدہ وعمل کے اعتبار سے صحیح اسلامی اسٹیٹ ہو، جہاں اسلام کے روحانی اور اخلاقی اقدار اپنی پوری تابانی کے ساتھ جلوہ فگن ہوں، ظاہر ہے کہ ایسی ریاست کا قیام واستحکام اجتہاد کے بغیر نہیں ہوسکتا، اس بنا پر وہ عمر بھر اسی اجتہاد کے ادھیڑ بن میں لگے رہے، اقبال کے فکر وفن پر سینکڑوں کتابیں اور ہزاروں مقالات لکھے گئے، مگر پیغام اقبال کے اس مرکزی نقطہ پر کوئی توجہ نہیں کی گئی، ضرورت ہے کہ اقبال کا مطالعہ از سر نو اس نقطۂ نظر سے کیا جائے۔ بحکم الاقرب فالاقرب پاکستان پر ان کا حق سب سے زیادہ ہے، اس لئے یہ کام وہاں ہونا چاہیئے۔

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی جو ۱۰ فروری کو "عالمی اسلامی کانفرنس" "موتمر علماء المسلمین" میں شرکت کے لئے بغداد گئے تھے بنگلور کے "مسلم مجلس مشاورت" اور "مسلم پرسنل لا" کے اجتماعات سے فارغ ہوکر ۲۶ فروری کو بخیریت تمام دہلی واپس آگئے "موتمر علماء المسلمین" اپنے بنیادی مقصد کے لحاظ سے نہایت کامیاب رہی، چالیس ملکوں کے مشاہیر علماء نے اس کی کاروائیوں میں سرگرم حصہ لیا اور فلسطین اور بیت المقدس کو صیہونیت کے خوفناک اور ظالمانہ پنجوں سے چھڑانے کا عہد کیا، موتمر کے حسب ذیل عہدہ دار اتفاق رائے سے چنے گئے۔

(۱) رئیس مؤتمر شیخ عبداللہ غوشہ — اردن کے قاضی القضاۃ

(۲) نائب رئیس اول مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی — جمہوریۂ ہند

(۳) نائب رئیس ثانی شیخ ہادی فیاض — نجف اشرف

(۴) جنرل سکریٹری شیخ عبداللہ الشیخلی — بغداد

آپ نے لشکر کو تین حصوں میں تقسیم کر کے میمنہ کی قیادت حضرت زبیر بن عوام کو اور میسرہ کی سربراہی حضرت مقداد بن عمرو الکندی کو کہ دونوں بہترین شہسوار تھے تفویض کی۔ اور ساقہ یعنی پچھلا دستہ جسے انگریزی میں Rearguard کہتے ہیں اس کے قائد حضرت قیس بن ابی صعصعہ بنائے گئے، ساز و سامان کا یہ عالم تھا کہ پوری فوج کے پاس لے دے کے کل ستّر اونٹ اور دو گھوڑے تھے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایک اونٹ میں کئی کئی افراد کو شریک کر دیا کہ وہ باری باری سے اس پر سوار ہوتے تھے، ایک اونٹ میں خود حضور کے ساتھ حضرت علی اور حضرت مرثد بن ابی مرثد شریک ہوگئے، ان دونوں نے اپنی اپنی باری بھی حضور کو پیش کی تو آپ نے اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا: تم دونوں مجھ سے زیادہ طاقتور نہیں ہو اور میں اجر و ثواب کے معاملہ میں تم سے زیادہ بے نیاز نہیں ہوں، پھر ارشاد ہوا کہ ایک اونٹ میں بس میرا حصہ وہی ہوگا جو تم میں سے کسی ایک کا ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید انتظام یہ کیا کہ اونٹوں کی گردنوں میں جو گھنٹیاں بندھی ہوئی تھیں وہ سب دور کرا دیں تاکہ لشکر کی نقل و حرکت پوشیدہ رہے۔

اب یہ لشکر روانہ ہوا تو عام قاعدہ کے مطابق دشمن کی فوج کی نقل و حرکت اور اس کے حالات کا کھوج لگانے کی غرض سے چند آدمیوں کا دستہ آگے روانہ کر دیا گیا جس میں بسبس بن عمرو الجہنی اور عدی بن ابی الزغباء شامل تھے، مدینہ سے روانہ ہو کر پہاڑ کی گھاٹیوں میں سے گذرتے ہوئے جب یہ لشکر مقام الروحاء پر پہونچا جو مدینہ سے تین میل کی مسافت پر ہے تو یہاں آپ نے حضرت ابولبابہ کو مدینہ کی امارت پر مامور فرمایا اور انھیں اس مقام سے واپس کر دیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر پہونچنے کے لئے جو راستہ اختیار کیا اصحاب مغازی و سیَر اس کی درمیانی منزلوں کا ذکر کرتے ہیں، لیکن یہ نا تمام ہے، عہد حاضر کے مشہور فاضل

کی حیثیت سے کھڑے ہوئے اور بڑے جوش میں بولے : یارسول اللہ! اگر آپ ہم کو حکم دیں کہ اس سمندر میں کود پڑو تو ہم اس میں بے تکلف چھلانگ لگادیں گے، حضرت المقداد بن عمرو نے مہاجرین کی طرف سے نہایت ولولہ انگیز تقریر کی اور کہا: "اے اللہ کے رسولؐ! آپ کو اللہ نے جو راہ دکھائی ہے اُس پر چل پڑیئے، ہم سب آپ کے ساتھ ہیں، خدا کی قسم! ہم وہ نہیں کہیں گے جو بنو اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے کہا تھا کہ "آپ اور آپ کا خدا، دونوں جائیے اور جنگ کیجئے، ہم تو یہیں بیٹھے ہوئے ہیں" ان تقریروں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ مبارک خوشی سے چمک اٹھا اور فرمایا "اچھا تو چلو، اور یہ خوش خبری سنو کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے قریش کے دو طائفوں (عیرا ورنفیر) میں سے ایک کا وعدہ کرلیا ہے[1]" بعض صحابہ جنھوں نے کسی وجہ سے عذر کیا آپ نے ان پر جبر نہیں کیا، اس وقت آپ کے ساتھ کل ۳۱۷ جاں نثاروں کا مجمع تھا جن میں سے دوسو اکتیس (۲۳۱) انصار تھے، ایک سوستر (۱۷۰) خزرج سے اور اکسٹھ (۶۱) اوس قبیلہ سے، اور باقی چھیاسی (۸۶) کی تعداد میں مہاجر تھے، لیکن اس تعداد میں بھی قریشی صرف اکتالیس (۴۱) تھے، باقی جتنے بھی تھے وہ موالی اور حلفاء میں سے تھے۔

ضروری انتظامات مدینہ سے روانہ ہونے کا وقت قریب آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں امامت صلوٰۃ کی خدمت حضرت عبداللہ بن مکتوم کے سپرد کی، لشکر کو مہاجرین اور انصار پر تقسیم کیا۔ اول الذکر کی قیادت حضرت علی کے سپرد ہوئی اور موخر الذکر کے قائد حضرت سعد بن معاذ بنائے گئے، دونوں کا عَلَم جو سیاہ رنگ کا تھا الگ الگ تھا۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پورے لشکر کے قائد عام تھے اور آپ کا علم سفید تھا۔ لیکن اس وقت آپ نے یہ عَلَم حضرت مصعب بن عمیر کو جو قریشی تھے عطا فرمایا۔ پھر

---

[1] الدرر لابن عبدالبر ص ۱۱۱

ہے، اوراس کی صورت یہ ہے کہ "جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ساتھ
(ب)در میں فروکش ہوئے تو آپ کے پاس سے قریش کی آب بردار سواریاں (روایا قریش) گذریں
ان میں بنو الحجاج کا ایک سیاہ فام غلام بھی تھا، صحابہ نے اس کو پکڑلیا اور اس سے ابوسفیان
اور اس کے ساتھیوں کا اتا پتہ دریافت کرنے لگے، غلام نے کہا: مجھے ابوسفیان وغیرہ کا علم
نہیں ہے۔ البتہ ابوجہل، عتبہ، شیبہ اور امیہ بن خلف تو یہیں پڑے ہوئے ہیں۔ اس کے
بعد واقعہ کا بقیہ جز وہی ہے جسے ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔

یہ واقعہ تو شام کے وقت کا تھا۔ اس سے پہلے یہ واقعہ پیش آچکا تھا کہ جائے قیام
پر پہونچنے کے بعد خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ایک ساتھی کو لے کر لشکر قریش کی فرودگاہ
کا سراغ لینے کے لئے روانہ ہوئے تھے، اثنائے راہ میں آپ کو ایک سن رسیدہ عرب ملا۔
آپ نے اس خیال سے کہ اس شخص کو جاسوسی کا شبہ نہ ہو لشکر قریش کے ساتھ لشکر اسلام کا
بھی نام لیا اور دریافت کیا کہ یہ دونوں لشکر کہاں ہیں؟ یہ شخص بھی گرگ باراں دیدہ تھا،
بولا: "پہلے تم دونوں بتاؤ کہ کون ہو؟ تب میں بتاؤں گا"۔ حضور نے جواب دیا: "پہلے تم بتاؤ
پھر ہم بتائیں گے"۔ بوڑھے نے کہا: بات پکی ہے؟ حضور نے فرمایا: "بالکل!" اب یہ شخص
بولا: "مجھے خبر ملی ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے ساتھی فلاں روز مدینہ سے روانہ
ہوئے ہیں، اگر یہ اطلاع صحیح ہے تو میں کہتا ہوں کہ اب یہ حضرات فلاں مقام پر ہوں گے،
اسی طرح مجھے معلوم ہوا ہے کہ لشکر قریش فلاں روز مکہ سے چلا ہے، اگر یہ خبر درست ہے تو میں
کہتا ہوں کہ اب یہ لشکر فلاں مقام پر ہوگا"۔ جب یہ شخص اپنی بات کہہ چکا تو اس نے پوچھا
کہ اب بتاؤ تم دونوں کون ہو؟ حضور نے جواب دیا: ہم ایک گھاٹ کے رہنے والے ہیں
"نحن من ماءٍ" اس طرح حضورؐ نے متعین طور پر یہ معلوم کرلیا کہ اس وقت لشکر قریش کا
پڑاؤ کہاں ہے، اور آپ وہاں سے روانہ ہوگئے۔

اس مقام پر ایک مرتبہ پھر اپنے ذہن میں یہ بات اجاگر کرلیجئے کہ مدینہ سے لشکر اسلام

محمد احمد باشمیل نے اپنی کتاب 'غزوۃ بدر الکبریٰ' میں اپنے ذاتی مشاہدہ اور تحقیق کے بعد اس راستہ کا تذکرہ مفصل طور پر کیا ہے اس لئے ہم ذیل میں اسے نقل کرتے ہیں:

"مدینہ سے بدر کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ راستہ اختیار فرمایا کہ مدینہ کے قریب جو ایک پہاڑ ہے آپ اس کے دروں میں گھس گئے اسے عبور کر کے آپ وادی عقیق میں پہونچے، پھر علی الترتیب ذوالحلیفہ، اولات الجیش، تربان، ملل[۱]، غمیس الحمام، صخیرات الیمامہ، السیالہ، فج الروحاء اور پھر شنوکہ[۲] سے گذرے، بئر الروحاء سے نکلتے وقت آپ نے مکہ کا راستہ اپنی بائیں جانب چھوڑ دیا تھا۔ پھر بدر کے ارادہ سے آپ نازیہ پر دائیں طرف مڑ گئے، یہاں تک کہ جب آپ نے ایک وادی جس کا نام رحقان ہے اور جو نازیہ اور تنگنائے صفرا کے درمیان واقع ہے طے کر لی تو آپ اس سے اتر آئے، پھر وادی الصفراء کو اپنے بائیں جانب چھوڑا۔ اور دائیں طرف چلتے ہوئے ایک وادی میں پہونچے جس کا نام ذفران ہے، یہی وہ وادی ہے جہاں کتب مغازی وسیر کی عام روایات کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لشکر قریش کے چل پڑنے اور بدر کی طرف رخ کرنے کی اطلاع ملی تھی، وادی ذفران سے نکلنے کے بعد آپ گھاٹیوں کی طرف چل دیے جن کا نام الاصافر ہے۔ ان گھاٹیوں سے اتر کر آپ ایک آبادی میں آئے جو بدر کے قریب ہے اور جس کا نام الدبہ ہے، اور الحنان جو ایک بڑا ٹیلہ ہے اسے دائیں جانب چھوڑ دیا۔ الدبہ سے روانہ ہو کر آپ بدر کے قریب فروکش ہوئے۔

یہاں وہ واقعہ پیش آیا جسے ہم الدرر لابن عبدالبر کے حوالہ سے نقل کر چکے ہیں لیکن یہ واقعہ صحیح مسلم جلد ثانی باب غزوۂ بدر اور البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۲۶۵ میں بھی موجود

---

[۱] یہ مدینہ سے قافلہ کے لئے دو راتوں کے فاصلہ پر ہے۔

[۲] بدر کے قریب ایک پہاڑ کا نام ہے۔

سے روانہ ہوئے ہیں اس سے کم از کم دو دن پہلے لشکر قریش مکہ سے روانہ ہوچکا تھا۔

اب غور کرنا چاہیئے کہ حضور جو قریش کی ایک ایک نقل و حرکت پر کڑی نگاہ رکھتے تھے اور اس سلسلے میں آپ کے جاسوسی دستے ادھر ادھر برابر گھومتے رہتے تھے۔ علاوہ ازیں مکہ سے متصل رہنے والے جن قبائل سے آپ کا معاہدہ ہوچکا تھا ان سے بھی قریش کی نقل و حرکت کا سراغ ملنے میں مدد ملتی ہوگی تو کیا یہ ممکن ہے کہ ان سب باتوں کے باوجود اس طمطراق اور شان و شوکت کے ساتھ لشکر قریش کی مکہ سے روانگی کا آپ کو علم نہ ہو، عقل و درایت کا فیصلہ ہے کہ آپ کو مدینہ میں ہی لشکر قریش کی روانگی کا علم ہوگیا تھا۔ اور اسی لئے آپ مدینہ سے ایک لشکر کی صورت میں جنگ کے لئے آمادہ ہوکر نکلے تھے۔

تین قافلے

لیکن اس وقت صورتِ حال بڑی عجیب و غریب تھی اور خدائے احکم الحاکمین نے اپنے حبیب کو ایک عظیم ابتلا و آزمائش سے دوچار کر دیا تھا، ایک طرف ابوسفیان کا کارواں تھا جو نہایت بیش قیمت ساز و سامان سے لدا پھندا شام سے درانہ واپس آرہا تھا اور منزل پہ منزل مارتا ہوا آگے بڑھتا جارہا تھا۔ دوسری طرف لشکر قریش تھا جو بڑے حوصلوں اور ارمانوں کے ساتھ مکہ سے روانہ ہوکر مدینہ کے راستہ پر گامزن تھا، اور تیسری جانب یہ لشکر اسلام تھا جسے اس کا تو علم تھا کہ یہ دونوں قافلے ایک اوس کے پیچھے اور دوسرا اوس کے آگے حرکت کر رہے ہیں لیکن ان قافلوں کی صحیح پوزیشن نہ معلوم ہونے کے باعث اس کا علم نہ تھا کہ اس کا سابقہ سب سے پہلے کس سے ہوگا۔ بہرحال سابقہ کسی سے بھی ہو، مدینہ سے یہ لشکر اس سے عہدہ برآ ہونے کا عزم لے کر روانہ ہوا تھا۔

لیکن افسوس ہے کہ ایک طرف ارباب روایات کی کوتاہ بینی کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے سارا زور کاروان ابوسفیان پر لگا دیا اور اسی کو آنحضرت صلی اللہ کے خروج عن المدینہ کا مقصد قرار دیا ہے، اس سلسلہ میں لشکر قریش کا ذکر آتا بھی ہے تو ثانوی حیثیت

کی روانگی کی تاریخ میں اختلاف ہے، عام ارباب مغازی وسیر کے نزدیک یہ روانگی ۸ رمضان المبارک (۲ھ) کو ہوئی تھی لیکن ابن سعد نے ۱۲ ر تاریخ لکھی ہے، اور ہمارے نزدیک صحیح یہی ہے، کیونکہ مدینہ اور بدر کے درمیان قافلوں کی راہ سے ایک سو ساٹھ میل کی مسافت ہے، یہ مسافت حضورؐ نے کتنے دنوں میں طے کی ہوگی؟ اس کا حساب اس سے لگائیے کہ مکہ اور بدر کی درمیانی مسافت دو سو پچاس (۲۵۰) میل ہے، ان دونوں مسافتوں کا مجموعہ چار سو دس (۴۱۰) میل ہوا۔ اور یہ معلوم ہے کہ ہجرت کے وقت حضورؐ نے یہ مسافت نو (۹) دن میں طے کی ہے کیونکہ ارباب روایات کے عام بیان کے مطابق حضورؐ مکہ سے یکم ربیع الاول کو روانہ ہوئے تھے اور ۱۲ ربیع الاول کو قبا میں داخل ہو گئے تھے (اگرچہ مولانا شبلی نے بڑے دعوے کے ساتھ یہ تاریخ ۸ ربیع الاول لکھی ہے) اب ان دنوں میں سے تین دن وہ منہا کر دیجئے جو آپ نے غارِ ثور میں بسر کئے، اس طرح سفر کے دن نو (۹) ہوتے ہیں۔ اب نو پر چار سو دس (۴۱۰) کو تقسیم کیجئے تو کسر کو نظر انداز کر کے پینتالیس (۴۵) میل فی یوم کی مسافت بنتی ہے، اس سے قیاس کیجئے کہ قطع مسافت کی اس رفتار کے مطابق ......
.... مدینہ سے بدر کی مسافت جو ایک سو ساٹھ میل وہ حضورؐ نے، علی الخصوص جب کہ آپ جلدی کے باعث تیز رفتاری سے چلے ہوں گے، کتنے دن میں قطع کی ہوگی؟ مذکورہ بالا حساب سے یہ مسافت زیادہ سے زیادہ ساڑھے تین دنوں میں طے ہو جانی چاہیئے اور چونکہ غزوۂ بدر ۱۷ ر رمضان کو شروع ہوا ہے، اس بنا پر یہ صاف ظاہر ہے کہ ابن سعد کے بیان کے مطابق حضور ۸ ر کو نہیں ۱۲ ر کو مدینہ سے روانہ ہوئے ہیں اور کم از کم غزوہ سے دو دن پہلے آپ بدر پہونچ گئے ہیں اور چونکہ مذکورہ بالا دو روایات سے یہ ثابت ہے کہ حضور جب بدر کے قریب پہونچے ہیں اس وقت آپ کو معلوم ہوا کہ لشکر قریش پہلے سے وہاں پہونچ چکا ہے اور آپ کی جائے قیام سے ایک ٹیلہ کے دامن میں موجودہ نقشوں کے مطابق پانچ چھ کیلو میٹر کے فاصلہ پر مقیم ہے۔ اس بنا پر یہ بھی ثابت ہو گیا کہ حضور جس روز مدینہ

اس میں بھی حضور نے کسی انصاری کو کبھی شریک نہیں کیا۔ آخر آج وہ کونسی نئی بات ہے جس کے باعث حضورؐ انصار کو نہ صرف شریک کرتے ہیں، بلکہ ان کی تعداد مہاجرین سے بھی زیادہ رکھتے ہیں، پھر یہ کیا بات ہے کہ چالیس اور زیادہ سے زیادہ ستر افرادِ کاروان سے تعرض کرنے کے لئے حضورؐ تین سوسترہ افراد کا مجمع لے کر روانہ ہو رہے ہیں اور وہ کس اہتمام کے ساتھ! مہاجرین اور انصار کا نمائندہ الگ الگ جان سپاری و فداکاری کا یقین دلاتا ہے، سب شرکاء مہم کو فوج کی طرح تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے، ہر دستہ کا جھنڈا الگ ہے، خود حضور سب کے قائد اعظم یعنی کمانڈر انچیف ہیں اور آپ کے جھنڈے کا رنگ مختلف ہے، مدینہ کی دیکھ بھال اور امامت صلوٰۃ کے لئے الگ الگ دو اصحاب مقرر کئے گئے ہیں! سوچنا چاہئے کہ یہ اہتمام اور بندوبست ایک چھاپہ مار دستہ کے لئے ہوتا ہے یا فوج کے لئے، اس بنا پر ہمیں اس میں ذرا شبہ نہیں ہے کہ گو صحابہ میں اس کا چرچا عام نہ ہو، جہاں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کا تعلق ہے آپ مدینہ سے اس عزم کے ساتھ روانہ ہوئے تھے کہ لشکر قریش سے معرکہ آرائی کرنی ہے، پھر یہ حقیقت بھی نظر انداز نہ کرنی چاہئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وسائل و ذرائع معلومات سب مادی ہی تو نہ تھے، غیبی اور روحانی بھی تو تھے، چنانچہ قرآن مجید کی آیتِ ذیل میں اسی کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے:

اذ یریکھم اللہ فی منامک قلیلاً ط ولو اراکھم کثیراً لفشلتم ولتنازعتم فی الامر ولکن اللہ سلم ط انہ علیم بذات الصدور ط

اس سلسلہ کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو آپ کے خواب میں کم کر کے دکھایا، اور اگر وہ ان کو زیادہ تعداد میں دکھاتا تو تم ہمت ہار دیتے اور لڑائی کے بارہ میں آپس میں جھگڑ پڑتے، لیکن خدا نے تم کو اس سے بچا لیا، بیشک وہ دل کی اندرونی باتوں سے واقف ہے۔

سے آتا ہے، اور دوسری جانب مولانا شبلی نے اگرچہ بڑی محققانہ اور فاضلانہ گفتگو کی ہے لیکن کاروان ابوسفیان سے انھیں ایسی چڑ ہے کہ اس کا نام لینا تک انھیں گوارا نہیں ہے ہمارے نزدیک اصحاب سیر و مغازی اور مولانا شبلی دونوں انتہا پسندوں میں ہیں اور حق بات وہی ہے جو ہم نے لکھی ہے، اس معاملہ میں قرآن مجید سے بڑھکر اور کوئی حکم نہیں ہوسکتا۔ ارشاد ہے:

کما اخرجك ربك من بيتك بالحق، وان فريقاً من المومنين لكارهون، يجادلونك في الحق بعد ما تبين كانما يساقون الى الموت وهم ينظرون	جیسا کہ اے پیغمبر آپ کا رب آپ کو حق کے ساتھ آپ کے گھر سے نکال لایا، حالانکہ مومنوں کا ایک طبقہ اسے پسند نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ حق کے ظاہر ہوجانے کے بعد بھی یہ لوگ آپ سے جھگڑتے تھے، گویا کہ یہ لوگ موت کی طرف لے جائے جا رہے تھے اور انھیں موت سامنے نظر آرہی تھی۔

اس آیت سے بنص صریح یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور کا خروج عن المدینہ کسی ایسے مقصد کے لئے ہے جس میں جان کا خطرہ ہے، اور یہ لشکر قریش سے مقابلہ کی صورت میں ہی ہوسکتا تھا، نہ کہ کاروان ابوسفیان کی صورت میں جو چالیس اور بعض روایات کے مطابق ستر افراد و اشخاص پر مشتمل تھا اور ایک جنگی لشکر کی طرح پورا مسلح بھی نہ ہوگا۔ اس حالت میں اگر بعض مسلمانوں کو تردد اور خوف ہوا تو بر تقاضائے بشریت ہوا۔ کیونکہ وہ ایک طرف اپنی بے سازوسامانی اور دوسری جانب لشکر قریش کی جنگ سامانی دونوں کا احساس رکھتے تھے۔

علاوہ ازیں ارباب روایات نے اس حقیقت کو بالکل نظرانداز کردیا کہ اب سے پہلے تمام چھاپہ مار دستوں میں، یہاں تک کہ غزوہ العشیرہ جس میں دوسو صحابہ شریک تھے

ی یا لشکر قریش سے، لیکن ظاہر ہے ان میں سے اکثر کی اندرونی خواہش یہ ہوگی کہ سابقہ کاروان
سفیان سے ہو تو بہتر ہے، لیکن خدا کو منظور کچھ اور ہی تھا، قرآن مجید میں اس صورت
کی محاکات اس طرح کی گئی ہے:

یعدکم اللہ احدی الطائفتین
الکم وتودون ان غیر ذات
وکۃ تکون لکم ویرید اللہ ان
ق الحق بکلمتہ ویقطع دابر الکافرین
ق الحق ویبطل الباطل، ولو کرہ
جرمون ۵

اور اس وقت کو یاد کرو کہ جب اللہ نے قریش کے دونوں طائفوں میں سے ایک طائفہ کا تم سے وعدہ کیا تھا کہ وہ تم کو ملے گا، تم اسے پسند کرتے تھے کہ تمھیں وہ طائفہ ملے جس میں لڑنے کا بوتا نہیں ہے، اور اللہ کی مرضی یہ تھی کہ اپنے حکم سے دین حق کو قائم کرے اور کافروں کی جڑ بنیاد کاٹ ڈالے، تاکہ حق کو حق اور باطل کو باطل کر دکھائے اگرچہ مجرموں کو برا ہی کیوں نہ لگے۔

حسب ذیل آیت بھی اسی سلسلۂ بیان کی ایک کڑی ہے:

نتم بالعدوۃ الدنیا وھم
لعدوۃ القصوی والرکب اسفل
م ولو تواعدتم لاختلفتم
یعلد ولکن لیقضی اللہ امرا کان
لا لیھلک من ھلک عن بینۃ

یہ وہ وقت تھا جب کہ تم (مسلمان) میدان جنگ کے ورلے سرے پر تھے اور وہ پرلے سرے پر، اور قافلۂ (ابوسفیان) تم سے نیچے کی طرف کو ہٹا ہوا تھا، (یعنی وہ پہلو بچا کر ساحل کے راستہ پر پڑ لیا تھا) اگر تم پہلے سے ایک

شیہ صفحہ گذشتہ) جا رہے ہیں۔ اگرچہ حضور کا مقصد کچھ اور تھا جس کی تصدیق بعد کے
ت سے ہو گئی۔

لیکن اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ یہاں معاملہ لشکر قریش کا تو اب پیدا ہوا تھا۔ ابوسفیا
کے کاروان کا معاملہ اور اس کا عام چرچا تو بہت پہلے سے مدینہ میں بپا تھا اور شام سے اس کی
واپسی کے دن گنے جا رہے تھے۔ اب اس وقت صورت حال یہ ہے کہ لشکر اسلام مدینہ سے
روانہ ہو رہا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا عندیہ بعض سیاسی اور جنگی مصلحتوں کے
باعث مدینہ میں عام نہیں ہونے دیا ہے[1]۔ قافلہ ابی سفیان مسلمانوں کے پیچھے آرہا ہے، ایک
دو منزل طے کرنے کے بعد مسلمانوں کو بھی عام طور پر اس کا علم ہوجاتا ہے کہ لشکر قریش مکہ سے
آرہا ہے لیکن انھیں یہ نہیں معلوم کہ اُن کا پہلا سابقہ کس سے ہوگا؟ کاروان ابوسفیان

---

[1] ان میں سب سے بڑی مصلحت یہ تھی کہ یہود اور منافقین کی طرف سے اطمینان نہ تھا
ممکن ہے ان کو اس کی خبر ہوتی کہ آپ جنگ کے لئے جا رہے ہیں اور لشکر قریش بڑے ساز و
سامان کے ساتھ آیا ہے تو وہ یہاں مدینہ میں فتنہ کھڑا کر دیتے، اور یوں بھی حضورؐ کی عام عادت
تھی کہ جب کسی جنگ کا ارادہ فرماتے تو صاف لفظوں میں اس کا اظہار نہیں فرماتے تھے، چنانچہ
صحیح بخاری باب غزوۂ تبوک میں حضرت کعب بن مالک کا یہ قول منقول ہے:

ولم یکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یرید غزوۃ الا ورّی بغیرھا

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی غزوہ کا ارادہ فرماتے تو اس کے اظہار میں توریہ سے کام لیتے تھے۔

اس سلسلہ میں یہ بات خاص طور پر نوٹ کرنے کی ہے کہ حضرت کعب بن مالک نے یہ فقرہ اپنی غزوۂ
تبوک میں عدم شرکت کی داستان کے سلسلہ میں کہا ہے اور اسی ذیل میں انھوں نے غزوۂ بدر کا بھی
ذکر کیا ہے، گویا وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسے مواقع پر توریہ لینے کے
کے باعث مجھکو غزوۂ تبوک میں جو مغالطہ ہوا تھا وہی مغالطہ غزوۂ بدر میں پیش آیا۔ کیونکہ
وہاں تو عام خبر یہی تھی کہ حضور کاروان ابوسفیان کے ارادہ سے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس بنا پر اگر بعض حضرات اپنی بے سروسامانی کے باعث جنگ سے کترانے لگے ہوں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟

ایک اہم نکتہ اس موقع پر ہم ایک اہم نکتہ کی طرف بھی قارئین کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں جس پر کسی نے دھیان نہیں دیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ غزوۂ بدر سے پہلے سات آٹھ مرتبہ چھاپہ مار دستے روانہ کئے گئے ہیں جن میں سے بعض میں خود حضورؐ بھی شریک ہوئے ہیں، لیکن کسی دستہ کو کامیابی نہیں ہوئی، اور نہ کوئی شخص ہلاک ہوا۔ سریۂ عبداللہ بن جحش کا جو معاملہ ہوا وہ بالکل اچانک ناگزیر حالات میں اور حضورؐ کی اجازت کے بغیر ہوا تو کہیں اس کی وجہ یہ تو نہیں ہے کہ درحقیقت حضورؐ کا مقصد تجارتی قافلہ کی غارتگری کرنا تھا ہی نہیں، بلکہ قریش پر یہ اثر پیدا کرنا تھا کہ اب ان کی تجارتی لائن محفوظ نہیں رہی ہے، اس لئے ان کی خیر اسی میں ہے کہ وہ معلوم شرائط پر حضورؐ سے مصالحت کریں، ورنہ اگر قافلہ پر دھاوا بول دینا ہی آپ کا اصل مقصد و منشا ہوتا تو یقیناً کاروان ابوسفیان بھی آپ سے بچ کر نہیں نکل سکتا تھا۔ کیونکہ بدر اور بحر احمر کے ساحل کے درمیان فاصلہ ہی کتنا ہے؟ صرف تیس کیلومیٹر کا۔ اور آپ اس سے بے خبر نہیں ہوسکتے تھے کہ ابوسفیان کو اگر بدر میں مسلمانوں کی موجودگی کی کن بھن مل گئی تو وہ راستہ بدل کر ساحل کی راہ سے نکل جائے گا۔ اس بنا پر آپ بآسانی یہ کرسکتے تھے کہ ساحل کے راستہ پر بھی روک لگا دیتے، لیکن آپ نے اگر ایسا نہیں کیا تو کیا ہمارا یہ سمجھنا غلط ہے کہ کاروان ابوسفیان کے معاملہ میں خود حضور کچھ زیادہ سرگرم نہیں تھے اور اغماض سے کام لے رہے تھے، پھر جب خود اللہ تعالیٰ کا منشا یہ تھا کہ "ولکن لیقضی اللّٰہ امراً کان مفعولا، لیھلک من ھلک عن بینۃ و یحیی من حیّ عن بینۃ" تو کیا خدا کے اس منشا کا انعکاس آپ کی طبیعت اور میلان پر نہ ہوگا۔

اب تک ہم نے اس بحث میں ایک مورخ کا قلم استعمال کیا ہے، اب اس سے

وَيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ط وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ٥

دوسرے سے وعدہ کرتے تو وقت مقررہ کے بارہ میں آپس میں اختلاف کر بیٹھتے، لیکن اللہ تو حکم کر چکا تھا کہ جنگ ہو کر رہے تاکہ جس کو ہلاک ہونا ہے وہ علانیہ ہلاک ہو اور جس کو زندہ رہنا ہے وہ کھلم کھلا زندہ رہے اور بیشک اللہ سب کچھ سنتا بھی ہے اور جانتا بھی ہے۔

یہاں تک روایات اور واقعات کو منقح کر کے واقعہ کی اصل صورتِ حال جو ہم نے لکھی ہے وہ اس درجہ بے غل وغش ہے کہ غزوۂ بدر کے سلسلہ میں قرآن مجید کی آیات پر منطبق ہو جاتی ہے اور روایات میں باہم جو تعارض نظر آتا ہے وہ بھی رفع ہو جاتا ہے، مثلاً صحیح بخاری باب غزوۂ بدر میں ہے کہ حضرت کعب بن مالک نے ایک مرتبہ بیان کیا کہ میں غزوۂ تبوک کے علاوہ کسی اور غزوہ سے غیر حاضر نہیں ہوا۔ اور رہا غزوۂ بدر! تو اس میں عدم شرکت کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کاروانِ قریش کے ارادہ سے نکلے تھے، لیکن اللہ نے آپ کو اور دشمنوں کو جمع کر دیا، اور پہلے سے کسی قرارداد کے بغیر جنگ ہو گئی۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ عدم شرکت کی وجہ حضور کا کاروان قریش سے تعرض کرنے کی غرض سے مدینہ سے نکلنا تھا، لیکن ابن سعد اور تفسیر ابن جوزی میں بعض روایات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے "وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكَارِهُوْنَ" کا مصداق وہ لوگ ہیں جنھیں معلوم تھا کہ حضور جنگ کے لئے جا رہے ہیں۔ ہمارے مذکورہ بالا بیان کے مطابق ان دونوں میں تطبیق کی صورت یہ ہو گی کہ عام طور پر شہرت تو یہی تھی کہ حضور کاروان قریش کے ارادہ سے جا رہے ہیں اس بنا پر حضرت کعب بن مالک نے جو خیال کیا وہ بیجا نہیں تھا، لیکن اگر خاص مدینہ میں نہیں تو کچھ دور جانے کے بعد پتہ چل ہی گیا تھا کہ لشکر قریش سے جنگ کرنی

جدید ہندوستان میں اسلامی فکر

(تجزیہ اور تنقید)

(۲)

از جناب جلال الحق صاحب ایم اے

مسلم اجتماعی زندگی کے لئے بیسویں صدی کی دوسری دہائی سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کا زمانہ انتہائی ہنگامہ خیزیوں، کشمکشوں اور بے چینیوں کا زمانہ ہے۔ غیر ملکی حکمرانوں نے اپنی اس نو آبادی میں مسلمانوں کے تعلق سے جو معاشی و تعلیمی پالیسی اپنائی تھی اب اس کے اثرات زیادہ واضح طور پر سامنے آنے شروع ہو گئے تھے۔ ان دونوں دائروں میں ان کے اور ان کے ہموطنوں کے درمیان جو خلیج پیدا ہو گئی تھی، اس کا گہرا احساس انھیں قنوطیت پسندی کی طرف لے جا رہا تھا۔ شدھی سنگھٹن، آریہ سماج اور عیسائی مشنریوں کی تبلیغیت ان کے اس خیال سے حد درجہ مستبعد تھی جس کے تحت وہ صرف اپنے مذہب کو دوسروں کے لئے قابل قبول ہونے کا دعوے دار سمجھتے تھے۔ ان کے ہموطنوں میں جارحانہ قوم پروری کے رجحانات رکھنے والے جن عناصر کا تیز ارتقا ہوا تھا اور اس کے نتیجہ میں فرقہ وارانہ فسادات کی جو لہر چل پڑی تھی وہ ان میں عدم تحفظ اور خوف زدگی کے احساسات پرورش دے رہی تھی۔ بین الاقوامی حالات بھی حد درجہ ناسازگار اور مایوس کن تھے۔ انگریز استعماریت پسندوں نے جس طرح ترکوں اور عربوں میں علٰحدہ علٰحدہ قومی عصبیتیں فروغ دے کر انھیں آپس میں لڑا دیا تھا اور اس کے نتیجہ میں جس طرح اور جن حالات میں صدیوں سے قائم ادارہ خلافت

ہٹ کر ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہر چیز کے اسباب مادی ہی تو نہیں ہوتے، بلکہ کچھ اور بھی ہوتے ہیں جن کا مشاہدہ عام انسان نہیں کر سکتے۔ قرآن مجید کی سورۂ انفال میں غزوۂ بدر سے متعلق جو آیات ہیں ان سب کا یکجائی مطالعہ کیجئے اور ان کی اسپرٹ دیکھئے اور دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو معاملۂ تقرب خاص اللہ کے ساتھ تھا اور اللہ تعالیٰ نے دین حق کو سرفراز و سربلند کرنے کے جو وعدے آپ کے ساتھ کر رکھے تھے، ان کو پیش نظر رکھئے تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ جو کچھ ہو رہا تھا مشیتِ ایزدی کے ایک طے شدہ پروگرام کے ماتحت ہو رہا تھا اور حضورؐ کے نفس قدسی کو پہلے سے ہی اس سے مطلع کر دیا گیا تھا چنانچہ اسی اطلاع کا یہ نتیجہ تھا کہ آپ نے تین سو تیرہ آدمیوں کی ایک نیم مسلح جماعت کو نو سو پچاس کی پوری طرح ہتیار بند اور باساز و سامان جماعت کے ساتھ بے تکلف ٹکرا دیا اور جب یہ دونوں جماعتیں مصروفِ پیکار تھیں اس وقت آپ سجدہ میں پڑے ہوئے دعا فرما رہے تھے کہ "اے خدا تو نے جس مدد کا وعدہ فرمایا ہے وہ مدد بھیج"۔ یہ مدد کا وعدہ خدا نے کب فرمایا تھا؟ اسی وقت جب کہ مشیتِ ایزدی نے آئندہ پیش آنے والے واقعات کی ایک جھلک آپ کو دکھا دی تھی۔

نظر آتی ہیں وہ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر اور علامہ اقبال کی ہیں۔ انھوں نے اپنے حالات کو سمجھتے ہوئے مختلف دائروں میں مسلمانوں کے لئے جو معتدل اور متوازن لائحہ عمل تجویز کئے اور جن افکار و خیالات کی اشاعت کی اس نے آئندہ نسلوں کی ذہنی تشکیل میں اہم اور فیصلہ کن رول ادا کیا۔ یہاں ان کی زندگیوں کے بارے میں قدرے تفصیل میں جانا موضوع کو سمجھنے میں سہولت پیدا کرے گا۔

مولانا ابوالکلام آزاد

چھ سو سال کے غیر معمولی اور ہمہ گیر اقتدار نے مسلمانوں میں جس قائدانہ حس کی تعمیر کی تھی وہ مغلیہ سلطنت کے غیر رسمی سقوط سے مردہ نہیں ہوئی بلکہ اس سے تاثر حاصل کر کے مزید مشتعل ہوگئی۔ چنانچہ سید احمد بریلوی رح اور شریعت اللہ رح وغیرہ کی تحریکوں کو احیائے ماضی کی تحریکیں کہنے کا مطلب بھی ہے کہ ان کی ساری سرگرمیوں کا مرکز اپنے سیاسی ماضی کو بحال کرنا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت کے بعد جب مسلم اقتدار مکمل طور پر تحلیل ہوگیا اور استعماری سلطنت کامل طور پر مستحکم ہوگئی تو مسلمانوں کی اجتماعی روح میں حکومت سے اس محرومی کے باعث جو خلا پیدا ہوا تھا، اس کا احساس شدید ہوگیا۔ مولانا محمود الحسن رح کی ریشمی رومال تحریک اور فکری میدان میں مولانا حمید الدین فراہی رح و مولانا شبیر احمد عثمانی رح کی تفاسیر و دیگر کتب اسی احساس کے مظاہر تھے۔ ان حضرات نے اپنی تحریروں میں اسلام کے ان پہلوؤں کو اہمیت دی جن کا تعلق زندگی کی اجتماعی تنظیم سے ہے۔ مذہب اسلام میں سیاست و حکومت کی نوعیت کے تعین سے متعلق جس بحث کی ابتدا شاہ ولی اللہ کے زمانہ سے ہوئی تھی وہ اس مرحلہ میں آکر زیادہ واضح ہوگئی۔ خلافتِ اسلامیہ کے انتشار نے مذہب میں اس سیاسیت پسندی کو مزید غذا پہنچائی

اس زمانہ میں ان اثرات کو سب سے زیادہ جس شخص نے قبول کیا وہ مولانا ابوالکلام آزاد تھے جو عمر کے اعتبار سے ابھی آغاز شباب میں ہونے کے باوجود اپنے مضامین و تقریروں کے ذریعہ عوام و خواص کی توجہ کا مرکز بن رہے تھے۔ آزاد اپنے ذہنی ارتقا کے دوران سرسید

ختم ہوا تھا وہ ان کے لئے انتہائی اندوہ ناک تھا۔ انھیں اس بات کا خصوصی قلق تھا کہ جس خلافت کی حفاظت کے لئے انھوں نے اپنی تمام تر مفلسی کے باوجود لاکھوں روپے کے چندے دئے، وہ خود مسلمانوں کے ہی ہاتھوں ختم ہوگئی۔ سیاسی اعتبار سے بھی یہ زمانہ افراتفری کا زمانہ تھا۔ مسلم لیگ کے رہنما جس مذہب کو اپنی ساری سرگرمیوں کی بنیاد قرار دیتے تھے، نہ تو اس کی تعلیمات سے آشنا تھے اور نہ ہی ان کے کردار اس سے ہم آہنگ تھے۔ کانگریسی قائدین کی ناعاقبت اندیشیوں اور دوررسی کے فقدان نے جس فضا کی تخلیق کی تھی اس کے تحت مسلم عوام کا ان پر اعتماد متزلزل ہوگیا تھا۔ جمعیۃ العلماء نے قومیت کے تعلق سے جو رویہ اپنایا اور مسلم لیگ والوں نے اس کا جس طرح استحصال کیا، اس نے بھی مذہب پسند مسلم عوام میں اثر آفرینی کی اور یہ گروہ ان کے لئے سیاسی طور سے ناقابل توجہ ہوگیا۔

ان باتوں کے علاوہ اس زمانہ میں ایک سنجیدہ مشاہد کے لئے ایک خاص بات جو قابل ذکر نظر آتی ہے وہ اپنا تعلق اس فکری پراگندگی سے رکھتی ہے جس میں کہ اس وقت کا مسلم ذہن گرفتار تھا۔ سرسید، مولوی چراغ علی اور سید امیر علی وغیرہ نے اپنی ساری قوت اس بات پر صرف کردی تھی کہ کسی طرح مذہب اسلام کا دیگر مذاہب سے ارفع و برتر ہونا ثابت کردیا جائے خواہ اس کے لئے ان اصولوں کی قربانی کیوں نہ دینی پڑے جن کا استخراج مذاہبی محکمات سے ہوتا ہے۔ ساری جدوجہد میں تہذیبی مشکلات کے گہرے تجزیہ اور ان کے حل کی جستجو کا فقدان نظر آتا ہے۔ زمانہ کے ادب صحافت حتیٰ کہ فلسفہ اور تفسیر میں بھی جذباتیت اور ردمالوفیت کا غلبہ نظر آتا ہے۔ مغربی تہذیب کی مکمل تردید، اور اس کے خوب و زشت پہلوؤں میں تفریق کی بنیاد پر اخذ و ترک کی کسی کوشش کے آثار نہیں ملتے۔ شبلی اور شرر وغیرہ نے تاریخ وغیرہ پر جو کام کیا تھا اس نے مسلم قوم میں ماضی پروری کی بیمار ذہنیت تشکیل دی خصوصاً صادق صدیقی، نسیم حجازی وغیرہ نے تو اس صورت حال کو اپنی انتہا پر پہنچا دیا تھا۔

فکری پراگندگی کا دور

اس ذہنی ناآسودگی اور فکری پراگندگی کے دور میں ان کیفیات سے جو تین شخصیتیں برسرپیکار

کا وفادار شہری اور دوسری طرف ایک بین الاقوامی مذہبی تنظیم کا رکن بنانا تھا[۵۱]۔ لیکن جب
انگلستان و ترکی کی جنگ کے دوران ایک مضمون لکھنے پر ان کو نظر بند کر دیا گیا[۵۲] اور وہاں ان کو
قرآن مجید کے مطالعہ کا موقع ملا تو اس سے ان کے مذہبی و سیاسی خیالات میں بڑی تبدیلیاں
واقع ہوئیں۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے وہ زبردست واردات قلب اور روحانی تجربہ سے
دوچار ہوئے جس نے ان کو حقائق کا گہرا شعوری ادراک کرایا جو یہ تھا کہ کل کائنات ایک
حکومت الٰہیہ ہے جس کا فرمانروا ایک خدا ہے اور سطح ارض پر اس کا خلیفہ انسان ہے.....
مگر اس (انسان) کے اندرونی عقیدے اور خلقی سرشت کا تقاضہ ہے کہ وہ صرف خدائے
واحد کی اطاعت کرے[۵۳]۔ مولانا آزاد ہی کی طرح انھوں نے بھی اطاعت کے مفہوم میں
انسان کے اجتماعی وجود کو شامل کیا اور حکومت الٰہیہ کی بات اس کے معروف معنوں میں کہی قومیت
کے نظریہ کے تعلق سے بھی ان کے خیالات اب بہت بدل گئے۔ "انھوں نے مغربی تصور
قومیت کو استعماریت کا بنیادی سبب قرار دیتے ہوئے اس پر سخت تنقید کی اور وفاق مذاہب
کی صورت میں ہندوستانی قومیت کا ایک نیا تصور پیش کیا جس سے ہندوستان کو "یونائٹڈ اسٹیٹس
آف انڈیا" کہنے کی بجائے "یونائٹڈ فیتھس آف انڈیا" کہا جاسکے۔ انھوں نے ملک کو ایسے محفوظ
علاقوں میں تقسیم کرنے کا مشورہ دیا جہاں ہر مذہب کو مذہب تبدیل کرا دینے کا مطلق اختیار حاصل
ہو۔ انھوں نے ہندوؤں سے مطالبہ کیا کہ یا تو وہ پس ماندہ طبقات کو جلد سے جلد اپنے
اندر جذب کرلیں ورنہ پھر مسلمانوں کو اجازت دیں کہ وہ انھیں اپنے مذہب میں شامل کرلیں۔
انھوں نے کلاسیکی سیکولرزم کو اس کے اس بنیادی تصور کو کہ "خدا کا حصہ خدا کو دے
دو اور قیصر کا قیصر کو" چیلنج کرتے ہوئے ردّ کر دیا اور کہا کہ ان کی اپنی رائے
میں کوئی ایسی شے نہیں ہوسکتی جو قیصر کی تو ہو اور خدا کی نہ ہو۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ

۵۱، ۵۲، ۵۳ ہندوستانی مسلمان ص ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸

سے بہت متاثر ہوئے تھے لیکن پھر جو ردّعمل ہوا اس نے ماحول کے اثرات سے مختلط ہو کر اپنا اظہار حکومت الٰہیہ کے تصوّر میں کیا۔ آزاد عقلی اور جذباتی دونوں راستوں سے اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس بدلے ہوئے دور میں بھی زندگی کے اجتماعی نظم کو شریعت کی بنیادوں پر استوار کرنا غیر عملی نہیں ہے۔ اسلامی تعلیمات کی ہمہ گیریت وہمہ زمانیت نے ان کی اس فکر کو بہت سہارا دیا۔ اسی مقصد کے تحت انھوں نے حزب اللہ قائم کی اور ۱۹۱۲ء میں کلکتہ سے "الہلال" نکالا جس نے مسلمانوں کی ادبی اور علمی زندگی میں ایک نئی روح پھونک دی بلکہ ان میں ایک نئی مذہبی وسیاسی بیداری بھی پیدا کر دی[1]۔ "الہلال" کے ذریعہ مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک طرف مذہبی طبقہ میں وقت کے اہم سیاسی مسائل کے احساس اور عمل کے ذوق کو ابھارا اور دوسری طرف انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں مذہب کی محبت اور عزت پیدا کر دی"۔ نئی نسلوں کی کورانہ مغرب پسندی نیز سرسید اور ان کے دیگر رفقاء کی مدافعیت پسندی پر گہری اور بصیرت افروز تنقید سے لے کر تحریک جدوجہد آزادی میں سرگرم شمولیت تک مولانا آزاد کی زندگی کے ایک ایک لمحے نے ہندوستان کی وطنی اور ملّی تاریخ پر گہرے اثرات ترتیب دئے ہیں۔

مولانا محمد علی جوہر

مولانا آزاد کے بعد دوسری قابلِ ذکر شخصیت مولانا محمد علی جوہر کی ہے جو مسٹر سے مولانا بنے، 'کامریڈ' اور 'ہمدرد'، خلافت تحریک نیز اپنی مخلص، پُر ایثار اور بلند حوصلہ زندگی کے باعث ایک طویل عرصہ تک مسلم ذہن اور ملکی سیاست پر چھائے رہے۔ خلافت تحریک جوان کی شخصیت کو نمایاں کرنے میں سب سے اہم عامل رہی ہے، کے ابتدائی دور میں، اگرچہ وہ اس کے بانی تھے، وہ مبہم اور ایک عمومی ذہنیت کے مسلمان تھے۔ اس وقت ان کا مقصد ہندوستانی مسلمانوں کو ایک لحاظ سے کیتھولک عیسائیوں کی طرح ایک طرف اپنی قومی ریاست

[1] ہندوستانی مسلمان مصنفہ سید عابد حسین ص ۱۴۲

ن کی شخصیت میں جو ہمہ جہتی اور ہمہ گیری تھی اس کے تحت مختلف نقطہ ہائے نظر رکھنے والے گروہوں کو
ن سے مکمل طور پر متفق یا مکمل طور سے مختلف ہونا ممکن نہیں رہا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ان کی انھیں
صفات کی گوناگونی نے ان کے افکار کو دور و قریب ہر دائرے میں بہنچایا اور وہ تاریخ پر
ثر انداز ہونے والی شخصیت سے گزر کر تاریخ ساز بنے اور جدید مسلم دور کے معمار اعظم کہلائے۔
اقبال یوروپ سے واپسی میں اپنے ساتھ مغربی تہذیب کی مادیت پرستی، خدا بیزاری،
طنیت اور استعماریت کے خلاف شدید جذباتی و عقلیتی رد عمل لیکر آئے۔ ان کا خیال تھا کہ اگرچہ
ین الانسانی معاشرہ سائنسی ترقیوں سے بہت زیادہ مستفید ہوا ہے پھر بھی بحیثیت مجموعی سائنس
پنی نظری ذمہ داریوں کو ادا کرنے نیز انسانیت کے کام آنے میں ناکام رہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ
مذہب اور صرف مذہب ہی آج کے انسانوں کو ان ذمہ داریوں کا اہل بنا سکتا ہے جو سائنس کی
رقیوں نے اس کے شانوں پر ڈالی ہیں" اور یہ مذہب ان کی نظر میں صرف اسلام ہی ہو سکتا تھا۔
تہذیب جدید کا تاریخی و تجزیاتی مطالعہ ان کو اس خیال کی طرف لے گیا کہ دین و دنیا
کی تفریق ایک مخصوص تاریخی و نفسیاتی رد عمل کا نتیجہ ہے جو مسیحیت کے
لئے تو مناسب ہو سکتی ہے لیکن اسلام کے لئے نہیں۔
ولانا آزاد اور مولانا محمد علی جوہر کا یہ تصور کہ اسلام انسانی زندگی کی مابعد الطبیعی تعبیر ہے اور اسی
رح معاملات کے ان پہلوؤں سے بھی بحث کرتا ہے جن کا براہ راست تعلق قوت نافذہ رکھنے
الے ادارے سے ہے، اقبال کے یہاں آکر اور بھی گہرا ہو جاتا ہے۔ تاریخ یورپ کے اس
طالعہ سے ایک اور احساس جو انھوں نے اخذ کیا اور جس کو اس زمانہ کے اس جنگجویانہ پس منظر
ہ مزید ہوا دی، وہ یہ تھا کہ وطنیت اپنی مخصوص اصطلاح میں اسلام کے نظام روحانی سے مطابقت
ہیں رکھتی۔ ان کے اسی احساس نے ان کو اس مخصوص نظریہ کی شدید مخالفت پر آمادہ کیا جس
حامی مسلمانوں کے مذہبی قائدین تھے۔
آفاقیت اور عالمگیریت کا جو عنصر اقبال کی تحریروں میں ملتا ہے اس کے اسباب منفی اور

ہمیں اپنے تمام دنیوی امور میں خدا کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔"[۱]

مولانا محمد علی جوہر نے مذہب کی جو سیاسی تعبیر کی اس میں اگرچہ عقلیت ومنطقیت کی کمی تھی پھر بھی خلافت عثمانیہ کے تعلق سے انھوں نے جو پالیسی اپنائی اس نے مسلم عامۃ الناس کی آفاقی حسّیت کو بہت اپیل کیا نیز ان کے انگریزی پس منظر اور راسخ العقیدگی میں شدت نے ایک بڑا فائدہ یہ پہنچایا کہ جدید تعلیم یافتہ نسل کو مذہبی مراسم کی ادائیگی کے لئے پھر ایک مرتبہ حوصلہ پیدا ہوا۔ جدوجہد آزادی کے سلسلہ میں مسلم رول کے تعین کے سلسلہ میں ان کا خیال یہ تھا کہ مسلمان بغیر ہندو ہموطنوں کو ساتھ لئے آزادی کی مہم سر نہیں کرسکتے اگرچہ بعد میں حالات نے کچھ ایسا رخ اختیار کیا کہ وہ ہندو مسلم اتحاد سے مایوس ہوگئے اور کانگریس چھوڑ کر مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کرلی۔ تحریک ترک موالات بھی ان کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے جس سے بحیثیت مجموعی ہندوستان کے تمام عمرانی گروہوں کے ذہن سے مغربی تہذیب کے طلسم کو پاش پاش کردیا۔

علامہ اقبال

علامہ اقبال کا نام ترتیب کے لحاظ سے تو اگرچہ مولانا آزاد اور مولانا محمد علی جوہر کے بعد آتا ہے لیکن متنوع رجحانات کے حامل اشخاص اور اداروں پر دیرپا وفیصلہ کن تاثر پذیری کا لحاظ کیا جائے تو وہ مذکورہ بالا دونوں شخصیتوں سے آگے ہیں۔ اقبال ایک عظیم شاعر، بالغ نظر مفکر، بلند پایہ فلسفی، صاحب طرز ادیب، ماہر قانون، مدبر اور ایک اچھے انسان تھے۔ مریم جمیلہ کے الفاظ میں "مغربی سیادت کے باعث اسلامی معاشرے کو جس انتشار کا سامنا کرنا پڑا نیز جس تہذیبی افراتفری سے دوچار ہونا پڑا، اس کے درمیان فلسفی شاعر اقبال مسلم ادب کی تاریخ میں تنہا نظر آتے ہیں۔"[۲] اگرچہ

---

[۱] Islam in India's Transition to Modernity by Korandikar P. 175

[۲] Islam Vs. West P 97

تعمیر کی وہ اپنی قدروں کے اعتبار سے علٰحدہ علٰحدہ حسب ذیل تھے :

۱۔ تہذیب جدید بحیثیت مجموعی مسلمانوں کے ایمانی و روحانی مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی اس لئے یہ ان کے لئے ہرگز قابل قبول نہیں ہے۔

۲۔ وفاداری طلب کرنے والا ایسا کوئی بھی نظریہ جو مسلمانوں کی آفاقی فطرت سے مغائرت رکھتا ہو اور جس سے مختلف تہذیبی گروہوں میں عصبیت و حسد کے جذبات ابھرتے ہوں، وہ ان کے لئے قابل ترک ہے۔

۳۔ ایک ایسا سماج جس کی اکائیاں ذہنی و مادی آسودگی سے مالا مال ہوں، اسی صورت میں تشکیل پا سکتا ہے جب کہ انسان کسی خارجی و سطحی ہیجان کی بجائے داخلی و مستحکم نتائج کے حامل محرکات کا پابند ہو۔

۴۔ حیات انسانی تفریق سے ماورا، ایک وحدت ہے جو اپنے فکری ارتقاء کے لئے تغیر و تبدل سے عاری کچھ قدروں کی محتاج ہے اور یہ قدریں جب مرکز سے مہبط کی طرف پھیلتی ہیں تو اپنے اندر ان تمام گوشوں کو سمیٹ لیتی ہیں جن کا تعلق اس انسانی زندگی سے ہے۔

۵۔ چونکہ یہ قدریں زمانی و مکانی تغیرات سے متاثر نہیں ہوتیں اس لئے اگر ماضی میں یہ عروج و نافذ رہی ہیں تو مستقبل کی تشکیل کے لئے بھی نافع و ناگزیر ہیں۔ اس سے کائنات کے طبیعی و ماورائے طبیعی حصص میں ہم آہنگی و یکجہتی پیدا ہوگی۔

یہ قدریں اپنی صورت پذیری کے اس زمانہ میں پیچیدہ حالات کی آلودگیوں اور نا مساعدت کے باوجود ابھر کر سامنے آئیں نیز سیاسی مطلع کے صاف ہوتے ہی نئی نسلوں کو اسے زیادہ مرتکز، مربوط اور واضح شکل میں اخذ کر کے اسلامی فکر کی تشکیل کرنا آسان ہو گیا۔ جدید نسل نے جس طرح ان قدروں کو بطور تجربہ حاصل کیا اسی سے موجودہ ہندوستان میں اثر قبول کرنے والی جماعتوں تحریکوں اور اداروں کے طریقہ ہائے کار کا رخ متعین ہوا۔ اشتراکیت عالم تحریکیت اور عوامی جدوجہد کے ذریعہ برسر اقتدار آنے کے تصور نے بھی موجودہ اداروں

جدید نسل کا تجربہ

ایجابی دونوں تھے۔ اسلام نے مختلف قومیتوں اور تہذیبوں سے جو مصالحت وہم آہنگی اپنی بنیادوں کو مجروح کئے بغیر، پیدا کی تھی، اس کے اذعان نے اقبال کو اس نتیجہ تک پہنچایا کہ ایک عالمگیر معاشرہ (جس کی طرف کہ یہ دنیا اپنی سائنسی وٹکنالیجی اسباب کے تحت بڑھ رہی ہے) کی تنظیم کی اساس صرف وہی تعلیمات ہوسکتی ہیں جس کی روح خدا پرستی کی روح ہو اور جو اس انبیائی سلسلہ کو نظر انداز نہ کرتی ہوں جو انسانِ اول سے شروع ہوکر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت پر ختم ہوتا ہے، اور وہ اسے ناقابل عمل بھی نہ سمجھتے تھے۔ ان کا یہی تاثر تھا جس نے ان کو ایک ایسے سماج کا خواب دیکھنے پر مجبور کیا جس میں ان کا روحانی و مذہبی شعور مرکزی مقام پر متمکن ہوکر متنوع حالات کی راہیں متعین کرتا ہے اور انھیں ان کے فطری راستوں پر گامزن کرتا ہے۔ اقبال اس سلسلہ میں شاہ ولی اللہ سے بھی بہت زیادہ متاثر لگتے ہیں۔ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے "اسلام اور پاکستان" کا مصنف لکھتا ہے:

"اقبال اس خاص مسئلہ کا سامنا کرنے کے لئے اپنا ایک سیاسی فلسفہ ترتیب دے رہے تھے جس سے کبھی شاہ ولی اللہ کو اور اس سے بھی پہلے کبھی تیمور لنگ کے خلفاء کو واسطہ پڑا تھا۔ یعنی یہ کہ مسلمانوں کو ہندوستان میں ایک صحت مند مذہبی ماحول کس طرح میسر ہو۔ ولی اللہ نے ۱۷۶۱ء میں احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان آنے اور پانی پت کے میدان میں مراٹھا افواج کو شکست دینے کی دعوت دی تھی۔ اس فتح سے ولی اللہ کو مسلم استحکام کے دوبارہ حاصل ہونے کی توقع تھی۔ سر محمد اقبال نے اپنے زمانہ میں اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے شمال مغربی ہند میں ایک علٰحدہ مسلم ریاست بنانے پر زور دیا۔[۵۵]"

اقبال، آزاد اور جوہر کی فکری مناسبتوں و مخالفتوں نے جن غیر واضح و مختلط اثرات

۵۵؎ Islam & Pakistan by Freeland Abbott P. 165

سیاسی و مذہبی حالات کی رہینِ منت ہے ۔ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں جب مولانا مودودیؒ نے اسے پہلی مرتبہ استعمال کیا تھا تو اس پس منظر سے اس کا خاص تعلق تھا ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ جمہوری اور اشتراکی

جمہوری اور اشتراکی نظام زندگی

دو نظام ہائے زندگی اپنی اپنی جگہوں پر مستحکم ہو چکے تھے ۔ جمہوریت کا فلسفہ ابتدائً سیاسی استبداد اور مطلق العنانیت سے بغاوت کے طور پر ایجاد کیا گیا تھا جس کا مقصد شہنشاہی نظام کو ختم کر کے ایک جمہوری معاشرہ کا قیام عمل میں لانا تھا ۔ لیکن بعد میں مفکرین نے اسے پوری زندگی کا فلسفہ بنا دیا ۔ یہ فلسفہ بنیادی طور سے خدا بیزاری ، انکارِ آخرت ، بے قید معاشی آزادی وغیرہ جیسی منفی قدروں پر مشتمل تھا ۔ چنانچہ جب یہ یورپ میں پھیلا تو اس کے اثر سے آہستہ آہستہ سماج میں ایک بورژوا طبقہ کا جنم ہوا جس نے انفرادی آزادی اور آزاد تجارت وغیرہ کی آڑ میں غریب مزدوروں اور کسانوں کو لوٹنا شروع کیا ۔ سماج کے اسی مستحصل ~~نظام~~ طبقہ کے دکھوں کے شدید احساس نے مارکس کو نظامِ جمہوریت جس کے محافظ سرمایہ دار تھے ، کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا اس نے نظام سرمایہ داری کے خلاف اشتراکیت کو بطور ایک دوسرے نظام زندگی کے پیش کیا ۔ مگر یہ نظام بھی انسان کو ہمہ گیر آسودگی فراہم کرنے نا کام رہا ۔

یہی وہ زمانہ ہے جب کہ دیگر مسلم ممالک کی طرح ہندوستانی مسلمان بھی اپنے مذہب کی جامعیت اور ہمہ گیری کا تصور کھو بیٹھے تھے تجدد پسند اور تحفظ پسند دونوں طبقے اسلام کی امتیازی شان کو ۔ (درجہ کے اختلاف سے قطع نظر) سمجھنے میں ناکام تھے ۔ اوّل الذکر نے تو کھل کر اس بات کا اظہار کیا کہ اسلام مسیحیت کی طرح کا ایک مذہب ہے جو صرف انفرادی اخلاق سے بحث کرتا ہے اور حکومت و سیاست سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے (سرسید) ۔ ثانی الذکر کے ساتھ صورت حال یہ تھی کہ وہ جدید علوم اور تبدیل شدہ حالات سے عدم واقفیت کے باعث اسلام کو نئی اصطلاحوں کے پس منظر میں نہیں سمجھ سکتا تھا ۔ متحدہ قومیت کے نظریہ کا اثبات دراصل نئی اصطلاحات کے اصلی مفہوم سے بے خبری کی ایک معمولی مثال ہے (مولانا حسین احمد مدنی) ۔

کی صورت گری میں غیر معمولی رول ادا کیا اور اس سے اشتراکی اصطلاحوں کے Parallel ایک نیا نظام اصطلاح مرتب ہوا جو مندرجہ بالا قدروں کی نمائندگی کرتا ہے مثلاً تحریک اسلامی، اسلامی ادب وغیرہ اس بات سے انکار اب ممکن نہیں رہا ہے کہ اسلامی فکر کے حامل ان گروہوں نے بحیثیت مجموعی اپنا دباؤ شعوری و غیر شعوری طور پر قبول کروایا ہے نیز حالات کو نیا موڑ دینے میں کامیابی حاصل کی ہے آج کا ذہین نوجوان جو فکری طور پر ناآسودہ ہے، جب کسی خیال کو منظم اور مربوط شکل میں پاتا ہے اور اس کے ذریعہ ماضی وحال کے واقعات کی تعبیر و تشریح میں آسانی محسوس کرتا ہے تو بلا جھجک اسے قبول کر لیتا ہے۔ اس عمل میں اس کا مذہب پسند خاندانی و معاشرتی ماحول بھی بہت سہارا بنتا ہے، نیز اس کے اکتساب سے اس میں جو پختگی آتی ہے وہ اس کی روزمرہ کی زندگی کو متاثر و منقلب کئے بغیر نہیں رہتی وہ ہر لمحہ اپنی عملی زندگی کو اس نئی فکر سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتا ہے بے کرداری و منافق شخصیتیں، غیر معتدل سماجی حالات، عالمگیر انسانی کرب وغیرہ اس کے نئے ولولوں اور نئے عزائم کو زبردست غذا پہنچاتے ہیں اور اسے اپنا وجود پھیلتا ہوا محسوس ہوتا ہے جسے کبھی وہ انکسار کے پردوں میں چھپانے کی کوشش بھی کرتا ہے۔

بیسویں صدی کے نصف اول کے اختتام یعنی تقسیم ہند کے بعد سے یہ اسلامی فکر اپنی بنیادی قدروں قدروں کے اعتبار سے خواہ کیسی بھی موزونیت و ربط کی حامل ہو لیکن پس پردہ کچھ ایسے میلانات ملتے ہیں جو اندرونی تضاد کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مثلاً ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ گروہ جس میں کہ اسلامی فکر نے خود کو سب سے بہتر طور پر ظاہر کیا تھا، اس نے اس دوسری صورتحال میں جب کہ سماجی تعلقات کو متعین کرنے والے اصول و ادارے بالکل بدل گئے ہیں، خود کو تنظیمی طور پر تو بدل لیا ہے لیکن اپنی اس فکر کو آگے بڑھانے نیز اسے نئے حالات کے لئے معقول (Relevent) بنانے میں ناکام رہا ہے۔

یہ واضح ہے کہ اسلام کے مکمل نظام زندگی ہونے کا تصور شعوری طور پر قرآن مجید کی آیتوں مثلاً اُدْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّة (بقرہ ۲۰۸) فَفِرُّوا إِلَى اللهِ (الذاریات ۵۰) هُوَ الَّذِي .... وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وغیرہ سے لیا گیا تھا لیکن خود یہ اصلاح اپنے وجود کے لئے اس وقت کے

اور ایسی نئی اصطلاحیں لائی ہوں گی جو کہ اس کے لئے قابل فہم ہوں۔

یہ بات حد درجہ افسوس ناک ہے کہ جن لوگوں نے اسلام کی دعوت کا بیڑہ اٹھا رکھا ہے وہ اس نئی صورت حال سے بے خبر ہیں۔ وہ اب بھی اسی پرانی زبان میں بات کرتے ہیں جس میں ان سے پچھلی نسل کے لوگ کیا کرتے تھے۔ فکر اسلامی کو آگے بڑھانے نیز اسے نئے حالات سے ہم آہنگ کرنے کی کسی جدوجہد کا کوئی سراغ ان میں نہیں ملتا۔ اس وقت فکری دائروں میں جمود ہے اور اس جمود کے اسباب بھی ہیں۔ ذیل میں ہم خاص طور پر دو اسباب کا ذکر کریں گے جو فکرِ اسلامی کو آگے بڑھانے میں خصوصی رکاوٹ ہیں۔ ان کا مزید تفصیلی تجزیہ کر کے ان کو دور کرنا انتہائی ضروری ہے۔

اصولیت اور مسلم قوم پروری کی کشمکش

زیر تذکرہ گروہ کے قریبی منابع نے اپنا جو ورثہ چھوڑا تھا، اس کے ذریعہ ان کے لئے یہ تو ممکن ہو گیا کہ وہ اسلام کو ایک آئیڈیالوجی کی حیثیت سے اٹھائیں جس کا تعلق مجرد انسانیت کی مشترک فطرت سے ہو اور وہ زوق جو مکانی بنیادوں پر پیدا ہوتے ہیں، ان سے محدود طور پر بحث کرے لیکن مسلمانوں کے قومی تشخص کا تصور جو کہ تقریباً تیس سال تک ایک مضبوط و موثر تصور رہا تھا، اس پر حد درجہ اثر انداز ہوا ہے اور اس سے مطلق علٰحدگی اس کے لئے ممکن نہیں ہو سکی ہے۔ حد سے بڑھی ہوئی سیاست پسندی (Politicalism) اس کا ایک اہم تناقض ہے۔ خصوصاً پاکستان میں تو ہندو دشمنی اور ہندوستان دشمنی کو بطور سیاسی و انتخابی نعرہ کے استعمال کیا گیا۔ ہندوستان میں بھی ایک طبقہ کی سرگرمیاں غیر شعوری طور پر ایسا رخ اختیار کر چکی ہیں کہ اصل دعوتی کام تنظیمی طور پر متاثر ہو رہا ہے۔ اشتراکی مابعد الطبیعیات میں خود ان کی اصطلاحوں کے مطابق ایک طبقاتی سماج میں استحصالی طبقہ کو جو مقام حاصل ہے وہ عملاً اس میں صلیبیوں، صیہونیوں یا ان دوسری قوموں کو دے دیا گیا جن کے ساتھ ان کا کوئی ثقافتی یا سیاسی مناقشہ ماضیِ قریب یا ماضیِ بعید میں رہا ہے اور اس سے اشتراکیت ہی کی طرح اس کی بھی ایک اہم قدر جو بالکل انسانیت کے درد میں اپنا اظہار کرتی ہے، اسی طرح متاثر ہوئی ہے۔ مسلم قوم کا بوجھ ان کی اپنی فکر آزاد تخلیق پرواز میں ایک اہم رکاوٹ

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اس وقت اسلام کو دو طرح کے چیلنج درپیش تھے۔ ایک طرف تو پورا عالم انسانی تھا جو جمہوری اور اشتراکی نظام ہائے زندگی سے بیزار اور کسی نئے نظامِ زندگی کی تلاش کر رہا تھا۔ دوسری طرف مسلمان تھے جو اپنے مذہب کی اصل روح سے ناآشنا تھے۔ اسلام کو ایک مکمل نظام زندگی کہکر ان دونوں چیلنجوں کا مقابلہ کیا گیا۔ ایک طرف تو یہ کہا گیا کہ "جمہوری اور اشتراکی" نظامِ زندگی کے بجائے "اسلامی" نظام زندگی ہی کے ذریعہ انسان دکھوں اور پریشانیوں سے نجات پاسکتا ہے اور دوسری طرف ایسا کہہ کر اسے مسیحیت یا دوسرے رہبانوی اور منفی مذاہب سے الگ کیا گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جو نئی نسل پیدا ہوئی تھی وہ ایک تیسرے نظام زندگی کے ذریعہ امن حاصل کرنے سے مایوس نہ تھی لیکن کچھ ہی سالوں میں حالات بالکل تبدیل ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ فکری دائروں میں فلسفہ کے دو نئے نظام یعنی تحلیلی فلسفہ اور فلسفہ وجودیت اپنے آپ کو مستحکم کر رہے تھے۔ ان دونوں فلسفوں نے زندگی کو ایک وحدت ماننے سے انکار کر دیا جس سے کسی مکمل ضابطہ حیات کی بات ہی بے معنیٰ ہو کر رہ گئی۔ ان دونوں فلسفوں کے زیر اثر یورپ میں جو نئی نسل اٹھی ہے وہ کسی ضابطہ حیات کی طرف سے مایوس اور ادعائیت کی مخالف ہے۔ حقیقت کو وہ منتشر شکل میں دیکھتی ہے اور کسی مطلق حقیقت کی بات اس کے لئے ناقابل تصور ہے۔ اسلام کو ان نئے چیلنجوں کا جواب دینا ہے۔ عصری انسان کے مطالبات بالکل دوسرے ہیں۔ عالمگیر انسانی کرب، سرد جنگیں، بین الاقوامی پیمانوں پر فریب، دھوکہ دہی اور منافقت جدید انسان کے اکتسابات ہیں۔ بھاری بھرکم مشینوں نے جو انسان کشی De Personalisation کی ہے اس نے انسانی وجود کو عدم میں تبدیل کر دیا ہے۔ جدید انسان کو ایک خلا کا احساس ہے جسے وہ کپڑے پھاڑ کر، بال بڑھا کر اور طرح طرح کی مضحکہ خیز حرکتوں کے ذریعہ پُر کرنا چاہتا ہے لیکن یہ خلاء اپنا احساس شدید تر کراتا جاتا ہے۔ یہ صورت حال اس بات کا مطالبہ کرتی ہے کہ اسلام کو اس طرح پیش کیا جائے جس سے انسان یہ یقین حاصل کر سکے کہ وہ اس کے ذریعہ دوبارہ اپنے عدم کو وجود میں تبدیل کر سکے گا۔ اس کے لئے نظامِ زندگی کی اصطلاح تبدیل کرنی پڑے گی

ہمہ گیر ترویج کرنا مغرب کا ہی کارنامہ ہے۔ اہل مغرب کو ان کی مادیت پرستی کی بنا پر برا بھلا کہتے ہوئے اس بات کا خیال نہیں کیا کہ ان کو اس رویہ کی طرف لے جانے میں سائنس دانوں اور فلسفیوں کی مذہب بیزاری کو کم اور اہالیان مذہب کی مذہب پسندی کو زیادہ دخل تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سائنس دانوں اور فلسفیوں کی پوری تحریک محرکات و مقاصد کے اعتبار سے سرتاسر حق جوئی و خلوص پر مبنی تھی۔

گہرائی سے دیکھا جائے تو جدید تہذیب سے اس نفرت اور اپنے قدیم ماضی سے محبت میں ایک شکست خوردہ ذہنیت کارفرما نظر آئے گی جس نے خود کو اپنے رقیب کے مقابلہ میں کمتر پاکر ظاہر کیا تھا۔ دوسری قوموں کی طرح انھوں نے بھی بجائے حقائق کا سامنا کرنے اور ان عناصر کی تلاش کرنے کے جنھوں نے ان کو اس انجام تک پہنچایا تھا، اپنے بوسیدہ ماضی میں پناہ ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ انھوں نے ان انبیائی تعلیمات کو بھی فراموش کر دیا جو آباپرستی، شخصیت پرستی اور ماضی پرستی پر گہری ضرب لگاتی ہیں نیز حال کی سچائیوں کا احساس دلا کر مستقبل کی طرف ایجابی پیش رفت کی راہ دکھاتی ہیں۔

بیان ملکیت و تفصیلات متعلقہ برہان دہلی

فارم چہارم قاعدہ ۸

۱۔ مقام اشاعت: اردو بازار جامع مسجد دہلی

۲۔ وقفہ اشاعت: ماہانہ

۳۔ طابع کا نام: حکیم مولوی محمد ظفر احمد خاں
قومیت: ہندوستانی
سکونت: اردو بازار جامع مسجد دہلی

۴۔ ناشر کا نام: حکیم مولوی محمد ظفر احمد خاں

۵۔ اڈیٹر کا نام: مولانا سعید احمد اکبرآبادی ایم اے
قومیت: ہندوستانی
سکونت: تغلق آباد۔ نئی دہلی

۶۔ ملکیت: ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی

میں محمد ظفر احمد خاں ذریعہ ہذا اقرار کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و اطلاع کے مطابق صحیح ہیں

محمد ظفر احمد خاں
۲۸ فروری ۷۵ء

ہے اور اس سے دانستہ کنارہ کشی کے میلانات بھی بالکل مفقود نہیں ہیں۔

مشرق بنام مغرب

سطور بالا میں تاریخی تواتر کے ذریعہ ظاہر ہونے والی جن قدروں کا ذکر کیا گیا تھا ان میں بیشتر ایسی تھیں جو بنیادی طور پر اپنا سبب تہذیب جدید کے ہمہ گیر غلبہ میں رکھتی ہیں۔ دیگر مسلم ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی اہل مغرب کی سیاسی و تہذیبی فتح سے انفعالی اور تحفظ پسندی کے دو ردِ عمل ظاہر ہوئے لیکن دیگر ممالک کے برعکس یہاں دونوں گروہ زیادہ مدت تک الگ الگ نہیں رہ سکے۔ صورت حال نے یہاں بہت جلد مثبت شکل اختیار کرلی اور مصالحت پسندی غالب آگئی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ یہاں مسلم قوم نے ماضی قریب میں ہی چند انتہائی ذہین اور تجدیدی شخصیتیں پیدا کی تھیں اور ان کی کاوشیں اور کوششیں مسلمانوں کے ذہن سے بالکلیہ محو نہیں ہوگئی تھیں مسلم قوم کو اپنے ماضی کی طرف متوجہ کرنے میں بھی ان بزرگوں کی چھوڑی ہوئی روایتوں کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ بہرحال ماضی کے مطالعہ میں جہاں اپنی ہمہ گیر سیاسی ثروت و معاشی خوشحالی کی یاد تازہ ہوئی وہیں انھیں یہ بھی معلوم ہوا کہ جس مغرب نے ان کو سیاسی طور پر محکوم اور ثقافتی طور پر مغلوب کرلیا ہے نیز جس سے وہ اس درجہ خائف ہیں اس کو اس حیثیت تک پہنچانے میں دراصل ان کا اپنا ہاتھ ہے۔ اقوام مغرب نے جن علوم و فنون کے مطالعہ کے بعد عروج و برتری حاصل کی تھی وہ دراصل ان کی اپنی قوم کے واسطہ سے ان تک پہنچے تھے۔ اس خیال نے کہ ہم نے ہی اہل مغرب کو جہالت کی تاریکی سے نکال کر انھیں مہذب بنایا ہے اور ہمارے ہی ذریعہ علم کی روشنی ان تک پہنچی ہے، مسلمانوں کو بے جا طور پر خود اعتمادی میں مبتلا کردیا۔ انھوں نے اس تہذیب کو نہایت حقیر سمجھتے ہوئے اس کے ان کارناموں کو بھی رد کردیا جن سے خود ان کا دامن خالی تھا۔ وقت گذرنے کے ساتھ اپنی برتری کے خیال خام میں غلو ہی ہوتا گیا اور پھر تو یہ صورت حال ہوگئی کہ مشرق اچھا، مغرب برا، مشرق مخاطب، مغرب مخاطَب، نیز مشرق روحانیت اور مغرب مادّیت کا نمائندہ بن گیا۔ بلاشبہ عقلیت پسندی، انسان دوستی روشن خیالی، عقائدی رواداری اور سماجی و معاشی عدل کی قدریں مسلمانوں کی اپنی قدریں تھیں لیکن اس بات کا اعتراف انھیں بہرحال کرنا چاہئے تھا کہ ان اقدار کو دوبارہ زندہ کرنا اور ان کی

جمیلۃً واسعۃ العلم، وافرۃ العقل — وجمیلہ تھیں، اور وسیع علم اور وافر عقل رکھتی تھیں۔

انھوں نے اپنے شوہر حضرت ابودرداء، حضرت سلمان فارسی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم سے بہت زیادہ احادیث کی روایت کی ہے، اور ان سے مکحول شامی، سالم بن ابوالجعد، زید بن اسلم، اسمٰعیل بن عبید اللہ، ابوحازم مدینی، عطاء کیخارانی، اور کئی دیگر حضرات نے روایت کی ہے[1]، ابن عبدالبر نے لکھا ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اپنے شوہر ابودرداء سے روایت کی ہے، اور ان سے تابعین کی ایک جماعت نے روایت کی ہے جس میں صفوان بن عبداللہ بن صفوان، میمون بن مہران، زید بن اسلم، اور ام درداء الصغریٰ شامل ہیں[2]۔

(۱۶) حضرت زینب بنت ابوسلمہؓ

حضرت زینب بنت ابوسلمہ رضی اللہ عنہا کی والدہ ام المومنین حضرت ام سلمہ ہیں اس لئے ان کو زینب بنت ام سلمہ بھی کہتے ہیں، حضرت اسماء بنت ابوبکر صدیق ان سے بے انتہا محبت کرتی تھیں، انھوں نے ان کو دودھ پلایا تھا۔

حضرت زینب بنت ابوسلمہ فقہائے مدینہ میں ممتاز مقام ومرتبہ رکھتی تھیں، مشہور تابعی عالم ابورافع کا بیان ہے:

کنتُ اذا ذکرتُ امرأۃً بالمدینۃ فقیھۃً ذکرت بنت ابی سلمۃ — میں جب بھی مدینہ منورہ کی کسی فقیہہ عورت کو یاد کرتا تھا تو زینب بنت ابوسلمہ کو یاد کرتا تھا۔

ان ہی کا بیان ہے کہ ایک دن کسی بات پر میں اپنی بیوی پر غصہ ہوا، اور باتوں باتوں میں زینب بنت ابوسلمہ کا نام میری زبان پر آگیا تو بیوی بے ساختہ بول اٹھی:

زینب بنت ام سلمۃ ھی یومئذٍ! — زینب بنت ام سلمہ اس زمانہ میں مدینہ منورہ کی

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۵۰ [2] استیعاب ج ۲ ص ۷۹۲

طبقۂ صحابہؓ میں

فقیہات ومفتیات اور محدّثات

(۲)

(از مولانا قاضی اطہر مبارک پوری، ایڈیٹر البلاغ بمبئی)

(۱۵) حضرت ام الدرداء الکبریٰ رضؓ | حضرت ام درداء رضی اللہ عنہا کا نام خیرہ بنت ابو حدرد اسلمی ہے، ان کی نسبت ہجیمیہ اوصابیہ ہے، حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کی زوجہ ہیں، نہایت عالمہ، فقیہہ، اور عاقلہ، فاضلہ اور عابدہ زاہدہ خاتون تھیں، امام ابن عبدالبر نے لکھا ہے:

وکانت من فضلاء النساء وعقلائھن وذوات الرای منھن، مع العبادۃ والنُسک[1]

وہ نسک وعبادت کے ساتھ طبقۂ نسواں میں عاقلہ، فاضلہ اور صاحب الرائے تھیں۔

امام ذہبیؒ نے حضرت ام درداء کو طبقۂ صحابہ کے حُفّاظ حدیث میں شمار کیا ہے اور تذکرۃ الحفاظ میں ان کے بارے میں لکھا ہے:

کانت فقیھۃً، عالمۃً، عابدۃً، ملیحۃً،

وہ فقیہہ، عالمہ، عابدہ، حسینہ،

---

[1] استیعاب ج ۲ ص ۷۹۲

کا کہنا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حضرت سہلہ بنت سہیل کو اس بارے میں خاص رخصت و اجازت تھی۔

حضرت سالم مولی ابی حذیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے قبا میں پہنچ گئے تھے اور اب تک جتنے صحابہ ہجرت کر کے وہاں آگئے تھے ان سب کی امامت وہی کرتے تھے[۱]۔

(۱۹) حضرت غامدیہ ازدیہ رض

حضرت غامدیہ رضی اللہ عنہا قبیلہ ازد کی شاخ بنی غامد سے تھیں، صحیح مسلم وغیرہ میں ان کے رجم کئے جانے کا واقعہ درج ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی اور ان کے بارے میں فرمایا: لقد تابت توبۃ لو تابھا صاحب مکس لغفر لہ[۲]۔

(۲۰) حضرت ام سلمہ بنت ابوحکیم رض

حضرت ام سلمہ بنت ابوحکیم رضی اللہ عنہا کی کنیت ام سلیم ہے، ام سلیمان بھی بیان کی گئی ہے، نام معلوم نہیں، انھوں نے ان مُعمرہ صحابیات کی علمی اور دینی صحبت اٹھائی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نمازوں میں شریک رہا کرتی تھیں[۳]۔

(۲۱) حضرت ام یوسف برکہ حبشیہ رض

حضرت ام یوسف برکہ حبشیہ رضی اللہ عنہا، حضرت اُم المومنین ام حبیبہ رض کی خادمہ ہیں، ام حبیبہ اپنے پہلے شوہر کے ساتھ ہجرت حبشہ میں شریک رہیں، واپسی پر حضرت ام یوسف وہیں سے ان کی خادمہ بن کر آئیں، اور جب حضرت ام حبیبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت میں آئیں تو ام یوسف بھی ان کے ساتھ چلی آئیں[۴]۔

---

[۱] طبقات ابن سعد ج ۸ ص ۲۷۰ [۲] تجرید اسماء الصحابہ ذہبی ج ۲ ص ۳۴۵

[۳] استیعاب ج ۲ ص ۸۰۳، اسد الغابہ ج ۵ ص ۵۸۹ [۴] اصابہ ج ۸ ص ۲۷ و ص ۲۹۰۔

افقہ امرأۃ بالمدینۃ سب سے بڑی فقیہہ عورت ہیں۔

انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور امہات المومنین حضرت ام سلمہؓ، حضرت عا
حضرت زینب بنت جحشؓ، حضرت ام حبیبہؓ سے روایت کی ہے، اوران سے ان کے صاحبزاد
ابو عبیدہ بن عبد اللہ بن زمعہ، محمد بن عمرو بن عطار، حمید بن نافع مدنی، عراک بن مالک، عر
ابن زبیر، ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن، کلیب بن وائل، علی بن حسین بن علی زین العابدین، ابوقلابہ جر
وغیرہ نے روایت کی، ۷۳ھ میں مدینہ منورہ میں انتقال کیا۔[۱]

(۱۷) حضرت لیلیٰ بنت قانفؓ

حضرت لیلیٰ بنت قانف ثقفیہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ
کی صاحبزادی حضرت ام کلثوم کے انتقال پر ان کے غسل وکف
میں شریک تھیں۔ ان کا بیان ہے کہ ہم حضرت ام کلثوم کو غسل وکفن دے رہے تھے اور رسو
صلی اللہ علیہ وسلم دروازے پر کھڑے ہوکر ہم کو کفن کا ایک ایک کپڑا دے رہے تھے[۲]، ان
داؤد بن عاصم بن عروہ بن مسعود ثقفی نے روایت کی ہے[۳] بعض کتابوں میں قائف ہمزہ
ہے، مگر حافظ ابن حجر نے اصابہ میں قانف بقاف ثم نون ثم فاء سے تصریح کی ہے[۴]۔

(۱۸) حضرت سہلہ بنت سہیلؓ

حضرت سہلہ بن سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہا ابتدائی دور میں مکہ
میں مسلمان ہوئیں اور اپنے شوہر حضرت ابو حذیفہ بن عقبہ کے
ساتھ ہجرت حبشہ میں شریک رہیں، ان کے شوہر ابو حذیفہ کے غلام حضرت سالم تھے جن کو ا
نے اپنا متبنّٰی بنالیا تھا، اور وہ اندر آنے جانے لگے تھے۔ اسی زمانہ میں رسول اللہ صلی ا
علیہ وسلم نے رضاعت کی صورت بتائی اور سالم ان کے رضاعی لڑکے بن گئے، بعد میں حض
عائشہ اس زمانہ کی رضاعت پر رشتۂ رضاعت کا فتویٰ دیا کرتی تھیں مگر دوسری ازواج

---

[۱] تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۴۲۲ [۲] اسد الغابہ ج ۵ ص ۵۴۳
[۳] تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۴۵۰ [۴] اصابہ ج ۸ ص ۱۸۲

كتب عمر بن عبد العزيز الى ابي بكر بن محمد بن حزم ان انظر ما كان من حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم او سنة ماضية او حديث عمرة فاكتبه فاني خشيت دروس العلم وذهاب اهله[1]

حضرت عمر بن عبد العزیز نے ابوبکر بن محمد بن حزم کے پاس لکھا کہ تم تلاش کرو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حدیث یا سنت جاریہ، یا عمرہ بنت عبد الرحمٰن کی حدیث دیکھو اسے لکھ لو، کیونکہ مجھے علم دین کے مٹنے اور اہل علم کے ختم ہونے کا ڈر ہے۔

عمرہ بنت عبد الرحمٰن نے حضرت عائشہ، ام ہشام بنت حارثہ، حبیبہ بنت سہل، ام حبیبہ بنت جحش سے روایت کی ہے، اور ان سے صاحبزادے ابوالرجال، بھائی محمد بن عبد الرحمٰن انصاری، بھتیجے یحییٰ بن عبد اللہ بن عبد الرحمٰن، پوتے حارثہ بن ابوالرجال، ابوبکر محمد بن حزم، عبد اللہ بن ابوبکر ابن محمد بن حزم، یحییٰ بن قیس انصاری، سعد بن سعید بن قیس انصاری، عبد ربہ بن سعید بن قیس انصاری، عروہ بن زبیر، سلیمان بن یسار، امام زہری، عمرو بن دینار وغیرہ نے روایت کی، ۹۸ھ، یا ۱۰۶ھ یا ۱۰۲ھ میں انتقال ہوا[2]

یہ ان بائیس فقیہات و مفتیات کا تذکرہ ہے جو عہد صحابہ میں فقہ و فتویٰ میں مرجع تھیں اور ان کے فتاوے، مسائل اور فقہی آراء پر اعتماد کیا جاتا تھا، اور یہ سب بنات اسلام کتاب و سنت کا معتبر و معتمد علم رکھتی تھیں۔

ان کے علاوہ اس دور میں ایسی عالمات و محدثات بھی تھیں جو خاص طور سے حدیث میں امامت کا درجہ رکھتی تھیں اور ان کی احادیث و مرویات کتب حدیث میں بہت زیادہ پائی جاتی ہیں، محدثین نے عہد صحابہ کی محدثات کے نام اور حالات بیان کئے ہیں، جن میں مذکورہ بالا فقیہات و مفتیات کے علاوہ دیگر صحابیات بھی شامل ہیں، چنانچہ امام ذہبیؒ

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۸ ص ۳۸۷ [2] تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۴۳۸

(۲۲) حضرت عمرہ بنت عبدالرحمٰن انصاریہ رحمۃ اللہ علیہا

حضرت عمرہ بنت عبدالرحمٰن بن اسعد بن زرارہ انصاریہ رحمۃ اللہ علیہا مدینہ منورہ کی عالمات تابعیات میں سے ہیں، ان کی تربیت ام المؤمنین نے فرمائی ہے، زبردست فقیہہ محدثہ اور عالمہ فاضلہ خاتون تھیں، خاص طور سے حضرت عائشہ کی احادیث وفقہی آرار کا علم سب سے زیادہ رکھتی تھیں ابن حبّان نے لکھا ہے:

کانت من اعلم الناس بحدیث عائشۃ — ان کے پاس حضرت عائشہ کی احادیث کا علم سب سے زیادہ تھا۔

محمد بن عبدالرحمٰن کا بیان ہے کہ مجھ سے حضرت عمر بن عبدالعزیز نے کہا:

مابقی احد اعلم بحدیث عائشۃ من عمرۃ[1] — اب کوئی شخص ایسا نہیں رہ گیا جو احادیث عائشہ کو عمرہ سے زیادہ جانتا ہو۔

امام زہری کا بیان ہے کہ مجھ سے قاسم بن محمد بن ابوبکر صدیق نے فرمایا کہ تم طلب علم کے حریص معلوم ہوتے ہو! کیا میں تم کو اس کی جگہ بتادوں؟ میں نے عرض کیا ضرور بتائیے تو کہا:

علیك بعُمرۃ بنت عبدالرحمٰن فانها کانت فی حجر عائشۃ فاتیتها فوجدتها بحرًا لا ینزف[2] — تم عُمرہ بنت عبدالرحمٰن کے پاس جاؤ، وہ حضرت عائشہ کی آغوش کی پروردہ ہیں، چنانچہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، اور ان کو علم کا ایسا سمندر پایا جو کم نہیں ہوتا۔

حضرت عمرہ کے پاس احادیث رسول کا ایک نادر مجموعہ تھا، حضرت عمر بن عبدالعزیز نے احادیث کی تدوین کے سلسلہ میں اس مجموعہ کو خاص طور سے نقل کرایا۔ ابن سعد کا بیان ہے:

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۴۳۸ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۶

تعظیم و تکریم فرماتے، امام عبد البر کا بیان ہے:

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یکرمھا، ویزورھا فی بیتھا، ویقیل عندھا ودعالھا بالشھادۃ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ام حرام کا احترام فرماتے، ان کے گھر جاکر ملاقات کرتے، دوپہر میں ان کے یہاں سوتے اور آپ نے ان کو شہادت کی دعا دی۔

صحیح بخاری وغیرہ میں اس سلسلے میں ان کے یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب دیکھنا اور حضرت ام حرام کی اپنی شہادت کی خواہش پر آپ کا ان کو اس کی دعا دینا اور غزوۂ قبرص میں شہادت پانا مذکور ہے، وہ خلافتِ عثمانی میں ۲۷ھ میں قبرص کی بحری مہم پر اپنے شوہر حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے ساتھ شریک ہوئیں، ساحل قبرص پر جہاز سے اتریں اور سواری سے گر کر شہید ہوگئیں اور وہیں دفن کی گئیں[1]

انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے اور انس بن مالک، عمیر بن اسود عنسی، یعلی بن شداد بن اوس، عطا بن یسار نے روایت کی ہے[2]۔

حضرت ام سلیم بنت ملحان انصاریہ رضی اللہ عنہا

حضرت ام سلیم بنت ملحان رضی اللہ عنہا، حضرت ام حرام کی بہن اور حضرت انس بن مالک کی والدہ ہیں، ابتدائے اسلام میں اپنی قوم کے ساتھ مسلمان ہوگئیں مگر ان کا شوہر مالک بن نضر ان کی دعوت اسلام پر خفا ہو کر شام چلا گیا، اس کے بعد ابو طلحہ انصاری نے ان کو شادی کا پیغام دیا تو ان سے کہا کہ

یا ابا طلحۃ الست تعلم ان الھک الذی تعبد ینبت من الارض ینجرھا حبشی بنی فلان قال بلی، قالت افلا تستحی تعبد	ابو طلحہ! کیا تم کو معلوم نہیں ہے کہ جس معبود کی تم عبادت کرتے ہو، وہ زمین سے اگتا ہے اور فلاں قبیلہ کے حبشی غلام نے اسے تراشا ہے؟

---

[1] استیعاب ج ۲ ص ۷۹۰		[2] تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۴۶۲

نے تذکرۃ الحفاظ کے طبقۂ اولیٰ میں ۲۳ کبار صحابہ کے حالات لکھے ہیں جن میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا حال بھی ہے، اور طبقۂ ثانیہ میں کبار تابعین کے ذکر ہیں حضرت ام درداء الکبریٰ کو شامل کیا ہے، نیز طبقۂ اولیٰ کے حفاظ حدیث میں ۲۳ حضرات کا مفصل تذکرہ کرنے کے بعد ان ۶۴ نبلاء صحابہ کے نام درج کئے ہیں جن کی مرویات واحادیث عام طور سے کتب حدیث میں موجود ہیں، اس کے بعد چودہ[1] حافظات حدیث کے نام یوں دیئے ہیں: حضرت اسماء بنت ابوبکر صدیق رضؓ، ام المومنین حضرت جویریہ بنت حارث مصطلقیہ رضؓ، ام المومنین حضرت حفصہ بنت عمر بن خطاب عدویہ رضؓ، ام المومنین حضرت ام حبیبہ رملہ بنت ابوسفیان امویہ رضؓ، ام المومنین حضرت زینب بنت جحش اسدیہ رضؓ، حضرت زینب بنت ابوسلمہ مخزومیہ رضؓ، حضرت فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہاشمیہ رضؓ، حضرت ام الفضل لبابہ بنت حارث ہلالیہ رضؓ، ان کی بہن ام المومنین حضرت میمونہ رضؓ، حضرت ام عطیہ نسیبہ انصاریہ رضؓ، ام المومنین حضرت ام سلمہ ہند مخزومیہ رضؓ، حضرت ام حرام بنت ملحان انصاریہ رضؓ، ان کی بہن حضرت ام سلیم رضؓ، حضرت ام ہانی بنت ابوطالب رضی اللہ عنہن۔ ان چودہ حافظات حدیث میں دس کے تذکرے گزشتہ بیان میں ہو چکے جو کتاب وسنت کی عالمہ فاضلہ ہونے کے ساتھ فقہ وفتویٰ میں امتیازی حیثیت رکھتی تھیں، باقی چار یعنی ام الفضل لبابہ بنت حارث ہلالیہ، ام حرام بنت ملحان انصاریہ، ام سلیم بنت ملحان انصاریہ، اور ام ہانی بنت ابوطالب کا مختصر تذکرہ موقع محل کے اعتبار سے مناسب معلوم ہوتا ہے۔

حضرت ام حرام بنت ملحان انصاریہ رضؓ

حضرت ام حرام بنت ملحان بن خالد انصاریہ رضی اللہ عنہا حضرت ام سلیم کی بہن، حضرت انس بن مالک کی خالہ اور حضرت عبادہ بن صامت کی زوجہ ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے بہت مانوس تھے اور ان کی بڑی

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۴۵

ن کے یہاں تشریف لے جاتے اور آرام فرماتے تھے۔

روت عنه احادیث کثیرة وکانت ن المنجبات[1]

انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت زیادہ احادیث کی روایت کی ہے، وہ ان عورتوں میں سے تھیں جن کی اولاد نجیب و شریف تھی۔

ک مرتبہ صحابہ کو شک ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم عرفہ کو روزہ رکھا ہے یا نہیں، سے معلوم کرنے کے لئے حضرت ام الفضل لبابہ نے آپ کی خدمت میں دودھ کا پیالہ ا جسے آپ نے نوش فرمایا اور معلوم ہوگیا کہ آپ نے روزہ نہیں رکھا ہے[2]

جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے حضرت لبابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سی حدیثیں یت کی ہیں اور ان سے ان کے صاحبزادے عبداللہ بن عباس، کریب مولیٰ عبداللہ بن عباس، ان کے مولیٰ عمیر بن حارث، انس بن مالک، تابوس بن ابو مخارق، عبداللہ بن حارث وفل نے روایت کی ہے[3]

ت ام ہانی بنت ابوطالب رض

حضرت ام ہانی بنت ابوطالب رضی اللہ عنہا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حقیقی بہن ہیں، فتح مکہ کے وقت اسلام لائیں اور ان کا شوہر ہ بن ابو وہب نجران کی طرف بھاگ گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو شادی کا بھیجا تو ان الفاظ میں معذرت کردی:

ول اللہ لانت احب الیّ من سمعی
ن وحق الزوج عظیمٌ اخشی

یا رسول اللہ! آپ مجھے میری ذات سے بھی زیادہ محبوب ہیں مگر شوہر کا حق بڑا ہے،

---

[1] ستیعاب ج ۲ ص ۷۷۹
[2] اصابہ ج ۸ ص ۲۶۷
[3] تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۴۴۹

خشبة، ان انت اسلمت فانی لا ارید منك الصداق غیرہ

ابوطلحہ نے جب اسے مان لیا تو ام سلیم نے کہا کہ تم کو شرم نہیں آتی کہ تم لکڑی کی پوجا کرتے ہو؟ اگر تم اسلام قبول کرلو تو یہی میرا مہر ہوگا۔

یہ سن کر ابوطلحہ نے کچھ غور کرنے کے بعد اسلام قبول کرلیا اور حضرت ام حرام نے اپنے صاحبزادے انس بن مالک سے کہا کہ تم ابوطلحہ سے میرے نکاح کا انتظام کرو، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوات میں شریک ہوئی تھیں۔

وکانت من عقلاء النساء[1] اور عقلمند عورتوں میں سے تھیں۔

حضرت ابوطلحہ انصاری سے حضرت عبداللہ بن ابوطلحہ انصاری پیدا ہوئے جن کی اولاد میں بڑی برکت ہوئی، ان کے دس لڑکے تھے، سب کے سب عالم دین اور محدث وفقیہ تھے اور ان سب سے علم پھیلا، حضرت ام سلیمؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی، اور ان سے صاحبزادے انس بن مالک، عبداللہ بن عباس، عمرو بن عاصم انصاری، ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوف نے روایت کی[2]

حضرت ام الفضل لبابہ بنت حارث ہلالیہؓ

حضرت ام الفضل لبابہ الکبریٰ بنت حارث بن حزن ہلالیہ رضی اللہ عنہا ام المومنین حضرت میمونہ کی حقیقی بہن، حضرت عباس بن عبدالمطلب کی زوجہ اور حضرت خالد بن ولید کی خالہ ہیں، ایک روایت کے مطابق ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے بعد وہ دوسری عورت ہیں جنھوں نے اسلام قبول کیا، منجبات میں سے ہیں، ان کے بطن سے حضرت عباس کے چھ نجیب وشریف لڑکے پیدا ہوئے، فضل، عبداللہ فقیہ، معبد، قثم، عبدالرحمٰن، فضل سے حضرت لبابہ کی کنیت ام الفضل اور حضرت عباس کی کنیت ابوالفضل ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چچی تھیں۔ آپ خاص طور سے

---

[1] اسد الغابہ ج ۵ ص ۵۹۱، واستیعاب ج ۲ ص ۸۰۳ [2] تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۴۷۱

تذکرہ اشاراتِ بینش

(۲)

ڈاکٹر شریف حسین قاسمی، دہلی یونیورسٹی

اشاراتِ بینش، انیسویں صدی عیسوی کے نصف اول کے اکثر فارسی شعرا کا تذکرہ ہے۔
اس تذکرہ میں سید مرتضیٰ متخلص بہ بینش نے ان بیشتر شعرا کا تذکرہ کیا ہے جو دربار کرناٹک سے وابستہ تھے۔ یہ تذکرہ ایک بار ۱۲۶۸ھ میں مدراس سے چھپ چکا ہے۔ اس طباعت کے بارے میں نواب غوث خان اعظم نے اپنے تذکرہ "گلزار اعظم" میں ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ مطبوعہ تذکرہ دستیاب نہ ہو سکا۔ اس لیے اس کی پچھلی اشاعت کے بارے میں کچھ کہنا محال ہے بہر حال اس تذکرہ کے صرف ایک قلمی نسخہ کا علم ہے جو ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی ملکیت ہے۔ یہ مخطوطہ بہت اچھی حالت میں ہے کاغذ دبیز اور ہلکا نیلا ہے۔ اس کا سائز ۸×۵ ½ ہے اور اس میں ۵۵ ورق ہیں۔ ہر صفحہ پر ۱۱ سطریں ہیں۔ شروع میں ۲۶ ورق خوش خط نستعلیق میں لکھے گئے ہیں اور باقی خط شکستہ میں۔ بیشتر صفحات پر نظم و نثر میں رد و بدل کی گئی ہے۔ حاشیہ میں اضافے کئے گئے ہیں۔ کچھ شعرا کا حال بھی حاشیہ پر ہی لکھا گیا ہے۔ حاشیہ کی عبارتوں کا خط اور اصل متن کا خط شکستہ ایک ہی ہے۔ کہیں کہیں شعروں پر نمبر ڈال دیئے گئے ہیں جو ترتیب میں نہیں ہیں۔ بہت سے شعر قلم زد کر دیئے گئے ہیں۔ مثلاً مؤلف نے اپنے ۱۴۳ شعر نقل کیے تھے لیکن بیشتر قلم زد کر دیئے اور صرف ۶۰ شعر انتخاب کیے ہیں۔ ان حالات کے تحت یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ نسخہ ہذا مؤلف کا اصلی مسودہ ہے۔ اس بیان کی مزید تائید میں کوئی تحریری

ا۔ شمارہ: ۶۰

ان اضیع حق الزوج — میں ڈرتی ہوں کہ کہیں شوہر کا حق ادا نہ کر سکوں۔

حضرت ام ہانی حضرت علی کے بعد تک زندہ رہیں، صحاح ستہ وغیرہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی روایات موجود ہیں، ان سے ان کے صاحبزادے جعدہ بن ہبیرہ، پوتے یحییٰ بن جعدہ بن ہبیرہ، دوسرے پوتے ہارون، دونوں غلام ابومرہ اور ابوصالح، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن حارث بن نوفل ہاشمی، عبداللہ بن عبداللہ بن حارث بن نوفل ہاشمی، عبدالرحمٰن بن ابویعلی، مجاہد، عروہ[1]۔ ان کے علاوہ شعبی، عطاء، کریب، محمد بن عقبہ بن ابومالک نے روایت کی ہے[2]

ان محدثات و فقیہات اور مفتیات کے علاوہ طبقۂ صحابہ و تابعین و تبع تابعین میں بے شمار ایسی بناتِ اسلام تھیں جن کے علم و تفقہ کا شہرہ عام تھا، اور ان سے محدثین نے روایت کی ہے، حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب کی آخری جلد میں کتاب النسار کے تحت اسمار و کُنیٰ اور مبہمات سمیت تقریباً سوا تین سو محدثات و فقیہات کا ذکر کیا ہے اور تقریب التہذیب میں ان کی تعداد ساڑھے تین سو کے قریب بتائی ہے، نیز روایۃ النسار عن النسار کے ماتحت انیس نامعلوم محدثات کا حال لکھا ہے۔

---

[1] اصابہ ج ۸ ص ۲۸۷ [2] تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۴۸۱

اور متذکرہ بالا تذکرے اس کے پیش نظر رہے۔

عربی جملوں، ترکیبوں اور الفاظ کی بھرمار کے باوجود اشاراتِ بینش کی زبان عام طور پر سادہ اور آسان ہے یہ تذکرہ، نثر میں حمد و نعت سے شروع ہوتا ہے۔ مصنّف نے اپنی زندگی کے ابتدائی دور کی سیاسی اور اقتصادی زبوں حالی کا ذکر کیا ہے۔ نواب محمد غوث خاں بہادر کی تخت نشینی کی روداد بیان کی ہے، نواب اعظم نے ایک 'مجلسِ مشاعرہ' ترتیب دی تھی۔ اس کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ مؤلف کی خواہش تھی کہ وہ مجلسِ مشاعرہ میں شامل شعراء کی آپسی نوک جھونک قارئین کی دلچسپی کے لیے قلمبند کرے۔ لیکن مصلحتاً ایسا نہیں کیا گیا۔ اس سلسلے میں بینش نے اپنا عذر ان الفاظ میں بیان کیا ہے جو مؤلف کی دانش مندی اور محتاط رویہ کا ثبوت ہے۔

میخواستم کہ سوال و جوابیکہ میان اہل مشاعرہ رو دادہ، با دخل و جرحی کہ درکلام یک دیگر واقع شدہ بہ جہت تفنن خاطر بینندگان بزبان قلم وہم امّا نظر بقول مرزا ابو طالب کلیم:

خسیس از ہنر پیشگان عیب بیند مگس بیشتر بر جراحت نشیند

بخیہ از روی عیب کسی بر گرفتن، و زخم لب بہم آوردہ را بناخن بے رحمی تازہ کردن، عکس آئین مروت و خلاف طریق فتوت پنداشتہ، ازان داعیہ دست باز داشتہ[1]

بینش نے اس تذکرہ کی وجہ تالیف ان الفاظ میں بیان کی:

روزی بخاطرم گذشت کہ شعرائی کہ قبل ازیں بودند، برائے آنہا تذکرہ ہای متعددہ تالیف و در دست زمانہ یادگار است۔ امّا صاحب سخنانیکہ ادراک سعادت عصر پرنصر نواب بندگان عالی نمودہ اند، تذکرہ مختص احوال اینان تا حال کسی ننوشتہ۔ اگر بسر انجام این، کمر سعی بر بیان جان بندم

[1] اشاراتِ بینش: مقدمہ

ثبوت ہمارے پاس موجود نہیں۔ خاتمہ پر تاریخ کتابت اور نام کاتب بھی درج نہیں۔ اس کے باوجود تذکرہ کا یہ مخطوطہ مصنف کا خود نوشت ہے اس کی تصدیق اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ ہمارا مؤلف ایک کاتب بھی تھا اور اس نے حافظ محمد انوار الحق فاروقی گوپاموی کا دیوان خود لکھ کر صاحبِ دیوان کو پیش کیا تھا[1]۔

متذکرہ حالات اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ جب مؤلف نے تقریباً آدھا تذکرہ نستعلیق میں لکھ لیا اور نظرِ ثانی کے بعد اسے ردو بدل کی گنجائش کا احساس ہوا تو اس نے بقیہ تذکرہ جلدی سے مکمل کرنے کی خاطر شکستہ میں لکھ لیا اور حاشیہ پر بھی شکستہ خط ہی استعمال کیا۔ چوں کہ ممکن ہے مصنّف نے سوچا ہو کہ بہر صورت تذکرہ کی کتابت دوبارہ ہونا لازمی ہو اس لیے فی الحال خط کی اچھائی یا برائی کو نظر انداز کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

دوسری بات اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا ہے کہ کہیں اگر یہ نسخہ کسی کاتب نے تحریر کیا ہوتا تو وہ املا میں غلطیاں کرنے اور الفاظ کو کچھ کا کچھ لکھ کر دخل در معقولات کی روایت ضرور نبھاتا لیکن موجودہ نسخہ میں ڈھونڈنے سے بھی ایسی غلطی نظر نہیں آتی۔

اشاراتِ بینش ۱۲۶۵ھ[2] ۹۔ ۱۸۴۸ء میں مکمل ہوا۔ لیکن مولف نے اسے کب لکھنا شروع کیا، معلوم نہیں ہو سکا۔ البتہ اس کے بعض مندرجات کی مدد سے ایک حد تک اس تاریخ کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ حالاں کہ مؤلف نے اپنے مراجع کا ذکر نہیں کیا لیکن سرخوش کے کلمات الشعرا، رایق کے گلدستہ کرناٹک تک، واصف کے معدن الجواہر، نواب محمد غوث خاں اعظم کے صبحِ وطن اور قدرت کے نتائج الافکار کا ذکر کیا ہے گلدستہ کرناٹک ۱۲۴۰ھ[3] ۱۸۲۴ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچا صبح وطن ۱۲۵۸ھ[4] ۱۸۴۲ء میں مکمل ہوا۔ نتائج الافکار کے تکمیل کی تاریخ ۱۲۵۸ھ[5] ۱۸۴۲ء ہے اس وجہ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ بینش نے اپنا تذکرہ ۱۲۵۸ھ/ ۱۸۴۲ء میں لکھنا شروع کیا۔

---

[1] اشارات بینش: ترجمہ انوار۔ [2] اشاراتِ بینش تاریخی نام ہے

[3] مادہ تاریخ: گلدستۂ زیبائی کرناٹک [4] صبحِ وطن۔ [5] نتائج الافکار میں تاریخی قطعات موجود ہیں۔

تقلید نمی توانند کشود[۱]

انوار الحق کی شاعری پر مؤلف کا تبصرہ یہ ہے۔

شعر سادہ و صاف و روان می گوید[۲]

بینش نے دوسروں کے کلام کی صرف تعریف ہی نہیں کی بلکہ اس پر ایک ناقدانہ نظر بھی ڈالی ہے اپنے ایک شاگرد کے ذوقِ شاعری کی تعریف کی ہے مگر انھیں ڈر تھا کہ ممکن ہے لوگ اس تعریف کو خود ستائی اور محض شاگرد کی حوصلہ افزائی پر محمول کریں، اس لیے وضاحت سے لکھا ہے:

حقیر از روی انصاف می گویم، نہ بپاس شاگردی کہ فی زماننا، عدیلش نمی بینم[۳]

بے ہوش کے ترجمے میں لکھتے ہیں کہ وہ چوں کہ فارسی محاورات سے واقف نہیں اس لیے ان کے اشعار اہل سخن کی نظر میں کسی قابل نہیں، اسی طرح رُسا، جو بینش اور ان کے بڑے بھائی ثاقب کے شاگرد تھے، ایک اچھے شاعر تھے۔ ظہوری کا تتبع کرتے اور بڑی دقتِ نظری اور تلاش و جستجو کے بعد شعر کہتے، لیکن ان کی مشکل پسندی مؤلف کو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ ان کے ضمن میں بینش نے ایک استادانہ مشاہدہ، بیان کیا ہے کہ نازک و لطیف معانی کو شعر کا سادہ لباس عطا کرنا، ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اس عمل کے لیے بڑی مہارت اور پختگی کی ضرورت ہے۔ رسا میں یہ خوبی موجود نہیں تھی اس لیے بینش نے لکھا ہے:

ہمچو استاد خود (ثاقب) بہ تتبع ظہوری حرف می زند و نزاکت ہا می برد۔ و تلاش ہای باریک می کند۔ اما گاہ گاہ بندش الفاظ او، معنی را باغلاق می اندازد[۴]

یعنی معنی نازک را، بصفائی لبستن، موقوف بر مشاقی بسیار است۔

اسی طرح بینش نے اپنے ایک شاگرد، علیم اللہ خاں علیم کے اشعار نقل کرنے کے بعد اسی ردیف و قافیہ اور وزن میں اپنا ایک مطلع بھی نقل کیا ہے۔ لیکن انتہائی صراحت و دیانت سے اعتراف کیا ہے کہ:

---

[۱] اشارات بینش: ترجمہ اعظم [۲] ایضاً۔ ترجمہ انوار الحق [۳] ایضاً ترجمہ ذکا۔

بخیہ نگزاری این تلا میذالرحمٰن پر دازم، رایگان نخواہد بود[1]

مؤلف کے بقول، یہ تذکرہ اس کے ہمعصر فارسی شعراء کے حالات پر مشتمل ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ چند کو چھوڑ کر اس میں شامل تمام شعراء وہ ہیں جو نواب محمد غوث خاں اعظم کی مجلس مشاعرہ میں شرکت کرتے تھے۔ صرف چند ایسے ہیں جو مدراس آئے ہی نہیں یا جن سے مؤلف مل نہ سکا۔ اس لیے مولف کا یہ بیان مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے:

تمامی غزلیات مشاعرہ و اشعارِ دیگر سخنوران این عہد از ہر شہر و دیار، بکمال تلاش بہم رسانده، بعد انتخاب بقدر استعداد خویش، آن را ترتیب دادم[2]

'اشارات بینش' میں شاعروں کا حال ان کے تخلص کے لحاظ سے، حروف تہجی کے مطابق بیان کیا گیا ہے۔ نواب محمد غوث خان اعظم کا ذکر سب سے پہلے ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، چوں کہ نواب موصوف نہ صرف مؤلف تذکرہ کے مربی اور محسن تھے، بلکہ اس تذکرہ میں شامل بیشتر شعرا ان ہی کے خوانِ نعمت کے ریزہ خوار تھے۔ اسے مؤلف کی احسان مندی کا جذبہ کہیئے کہ نواب موصوف کا ذکر سب سے طویل ہے۔ اسی طرح مؤلف کے بڑے بھائی ثاقب اور خود مؤلف کے حالات زندگی بھی کچھ مفصل ہیں، ورنہ باقی شعراء کا حال دوسرے ہم عصر تذکروں کے مقابلے میں مختصر بلکہ نامکمل ہے۔ یعنی مؤلف نے اس تذکرہ کی ترتیب میں کوئی قابلِ قدر کاوش اور جستجو نہیں کی بلکہ جو کچھ آسانی سے دستیاب ہوگیا اسے قلمبند کر دیا۔

مؤلف کا طرز تذکرہ نگاری محققانہ ہے۔ لیکن بعض تذکرہ نگاروں کی طرح بینش نے بھی دوسروں کے کلام پر مختصر مگر جامع تبصرہ کیا ہے۔ نواب اعظم کی شعر گوئی کے بارے میں مؤلف نے اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

اکنوں پایۂ سخنش بہ تتبع شیخ ناصر علی سہرندی (سرہندی) رحمتہ اللہ، بجائی رسیدہ کہ موشگافانِ دقایق معانی و رموز دانانِ لطائف سخندانی، راھی بغرق تحقیق و

---

[1] اشارات بینش: مقدمہ [2] ایضاً: مقدمہ

ہندوستانی فارسی شاعروں کے علمی تبحر اور استادی سے خوش ہوکر انھیں خطاب و القاب سے سرفراز کرتے تھے۔

بینش نے حسین محی الدین مست کا ذکر کیا ہے۔ یہ ارکاٹ کے رہنے والے اور انگریزی حکومت میں صوبہ داری کے منصب پر فائز تھے۔ مست اپنے انگریز افسر کے ہمراہ سیاحی کی غرض سے ایران گئے اور وہاں پہونچ کر فتح علی شاہ قاچار (۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء - ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء) کے دربار سے انھیں خان کا لقب عطا ہوا۔ اسی طرح ایک دوسرے شاعر مولوی تراب علی متخلص بہ نامی، کپتان لاکٹ کے ساتھ ایران گئے اور وہاں ایرانی علمار فضلار و شعرا سے ان کے ادبی معرکے رہے۔

اشارات بینش میں دو ایرانی شعرار کا ذکر بھی ملتا ہے۔ مرزا حسن علی متخلص بہ وفا مرزا بزرگ شیرازی کے لقب سے مشہور تھے[1]۔ دوسرے وصال شیرازی[2] وفا انگلستان

---

[1] ولادت: ۱۲۲۴ھ/ ۱۸۰۹ء، وفات: ۱۲۷۶ھ/ ۶۰-۱۸۵۹ء۔ ان کے والد کا نام مرزا سید علی متخلص بہ نیاز تھا۔ وفا نے اپنے والد سے تعلیم حاصل کی۔ اس کے علاوہ خطاطی میں مہارت حاصل کی۔ وفا ۱۲۵۴ھ/ ۹-۱۸۳۸ء میں ہندوستان آئے یہاں سے مکہ معظمہ اور مصر کے راستے، یورپ پہونچے۔ عرصہ تک لندن اور پیرس میں طب کی تعلیم میں مصروف رہے۔ بعد ازاں دوبارہ ہندوستان آئے اور کچھ عرصہ تک کلکتہ میں طب کی تدریس کی اور مطب کیا۔ ۱۲۷۶ھ/ ۶۰-۱۸۵۹ء میں ایران لوٹنے اور مشہد کی زیارت کی غرض سے گئے اور بیمار پڑ گئے اور فوت ہو گئے وفا کا دیوان تقریباً پندرہ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ دانش مندان و سخن سرایانِ فارس (چاپ تہران) ج ۴ (قسمت دوم)، ص۔ ۸۱۵ — ۸۱۸ صبح گلشن، ص ۵۹۵۔

[2] ولادت: ۱۱۹۳ھ/ ۱۷۷۹ء، وفات: ۱۲۶۲ھ/ ۱۸۴۵ء۔ وصال غزل سرائی میں کمال رکھتے تھے۔ ماہر و ہنرمند خطاط تھے۔ پندرہ ہزار سے زائد اشعار پر مشتمل دیوان

(باقی اگلے صفحہ پر۔

اگر انصاف پرسند، بمطلع علیم نمی رسد۔

اشاراتِ بینش میں جن شعراء کا ذکر ہے ان میں سے اکثر کو مؤلف شخصی طور پر جانتے تھے۔ اس لیے بینش نے ان کے اخلاق و عادات اور شخصی مشاغل کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ نہ صرف اہم ہے بلکہ قابلِ بھروسہ بھی ہے۔ شرف الدین حیدرآبادی متخلص بہ سعید کے بارے میں مؤلف کا نظریہ ہے:

مرد لفّاظی بود و در علم بیان و معانی و قواعد شعریہ چیزی میدانست۔

قادر علی متخلص بہ قادر کے متعلق مؤلف نے اپنی رائے کا ان الفاظ میں اظہار کیا ہے:

مرد خلیق و آشنا پرست و رنگین صحبت است۔

انیسویں صدی عیسوی وہ دور ہے جب فارسی کا چلن کم ہو چلا تھا اور شمالی ہندوستان میں اردو کا دور دورہ تھا۔ بیشتر شاعر، وقتی ضرورت کے تحت اردو میں شعر کہنے لگے تھے اور ادبی محفلوں میں اردو کی حکومت تھی۔ ایسے دور میں جنوبی ہند میں نواب اعظم کی سرپرستی میں فارسی شاعری کی قدر دانی قابلِ ستائش ہے۔ اس وقت یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ جنوبی ہندوستان میں اردو کا رواج شمالی ہند کی طرح تو نہ تھا، لیکن وہاں کے شعراء بھی اس لسانی انقلاب سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اشاراتِ بینش سے بہت سے ایسے شعراء کے حالات معلوم ہوتے ہیں جنہوں نے اردو میں بھی طبع آزمائی کی اور نہ صرف دیوان مرتب کئے بلکہ مثنویاں اور دیگر نثری آثار بھی ان کی یادگار ہیں۔ ایسے شعراء میں جو اردو و فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور اشاراتِ بینش میں ان کا حال موجود ہے، حشمت، ذکا، فاروق اور نامی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ بینش نے موخر الذکر کی دو اردو مثنویوں قصہ لیلیٰ و مجنوںؑ اور شیرین خسروؑ کے نام درج کئے ہیں۔ اس کے علاوہ ذکار کے اردو دیوان کا ذکر کیا ہے۔

بینش کے تذکرہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں، ہندوستانی فارسی شاعر ایران کے سفر پر جاتے تھے۔ وہاں کے شعراء سے ان کے بحث و مباحث ہوتے اور ایرانی بادشا

دانش مندان و سخن سرایانِ فارس۔ جلد چہارم قسمت دوم۔ محمد حسن رکن زادہ آدمیت چاپ اول۔ کتاب فروشی خیام۔ ۱۳۴۰ شمسی
دائرۃ المعارف یا فرہنگ دانش و ہنر۔ چاپ سوم۔ ایران۔ سازمانِ انتشاراتِ اشرفی۔
سخنورانِ بلند فکر (اردو) مولوی محمد منور بہادر گوہر۔ مدراس۔ ۱۹۳۶ء
صبحِ گلشن۔ سید علی حسن، مطبع شاہجہانی ۱۲۹۵
صبحِ وطن۔ نواب محمد غوث خاں بہادر۔ مطبع کشن راج۔ مدراس ۱۸۴۳
گلزار اعظم۔ نواب محمد غوث خان بہادر۔
مجمع الفصحاء۔ ج ۶۔ رضا قلیخان ہدایت چاپخانۂ موسوی تہران۔ ۱۳۴۰ شمسی
مجلّہ یغما۔ شمارہ نہم۔ آذر ماہ۔ ۱۳۵۰ء
محبوب الزمن۔ (حصہ دوم) مولوی عبدالجبار آصفی۔ ۱۳۲۹ شمسی
نتائج الافکار۔ محمد قدرت اللہ قدرت گوپاموی۔ بمبئی۔ ۱۳۳۶ء شمسی۔

گئے اور وہاں سے ۱۲۵۸ھ/ ۱۸۴۲ء میں مدراس پہنچے۔ اور چند ماہ قیام کرنے کے بعد بنگال منتقل ہو گئے۔ وصال شیرازی ہندوستان نہیں آئے لیکن یہ اپنے دور کے ملک الشعراء تھے۔

اشاراتِ بینش سے اس حقیقت کا علم بھی ہوتا ہے کہ اس دور میں اہم اور کمیاب کتابوں کی تدوین و ترتیب کی طرف اہل علم متوجہ ہو چکے تھے۔ بینش نے فرحت کے ترجمے میں لکھا ہے کہ چراغِ ہدایت، جو مشکل سے دستیاب ہوتی تھی، اسے فرحت نے بہت محنت احتیاط اور دوسرے دستیاب نسخوں کی مدد سے ترتیب دیا اور شائع کرایا۔

مراجع

اشاراتِ بینش: قلمی۔ ایشیاٹک سوسائٹی، شمارہ ۶۰

ایشیاٹک سوسائٹی کٹیلاگ ایوانف۔ ج ۲۔ کلکتہ۔ ۲۶-۱۹۲۴ء۔

پرشین لٹریچر۔ اسٹوری۔ ج ۱۔ لندن ۱۹۲۷

تاریخ ادبیاتِ فارسی۔ ہرمان اتہ۔ ترجمہ ڈاکٹر رضا زادہ شفق۔ تہران۔

تذکرہ نویسی در ہند و پاکستان۔ علی رضا نقوی۔ تہران ۱۹۶۴

موجود ہے۔ وصال کے قاآنی سے تعلقات تھے۔ وصال کی شہرت اور مقبولیت ہی کی وجہ ہے کہ تہران میں ایک بازار اس کے نام سے منسوب ہے وصال کے تفصیلی حالات کے لیے رجوع کریں:۔ مجمع الفصحا، ج ۶، ص ۱۰۹۱-۱۰۹۲، دائرۃ المعارف، ص ۶۵، تاریخ ادبیات فارسی تالیف ہرمان اتہ ترجمہ ڈاکٹر رضا زادہ شفق، ص ۸۴، مجلّہ یغما۔ شمارہ نہم آذرماہ ۱۳۵۰، ص ۵۱۷۔

البیان والتبیین ج ۱ ص ۳۹ ۔ الحیوان ج ۵ ص ۵۸۷

جاحظ نے یہ اثر البیان میں محمد بن سلام جمحی م ۲۳۱ سے اور الحیوان میں عبداللہ بن ابراہیم بن قدامۃ جمحی سے نقل کیا ہے۔ دونوں میں نہایت خفیف سا اختلاف ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ عمر فصیح اللسان تھے ۔ الف ۔ اور یہ کہ اللہ جامع الاضداد ہے ۔

ب ۔ اور بقول شیخ ابراہیم ذوق ؎

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوق اس جہان کو زیب اختلاف سے

سعدی نے شاکلات وتابلیات کے فرق کو جس فن کارانہ اسلوب میں بیان کیا ہے وہ قابل دید وشنید ہے ۔ دو بیتیں بطور نمونہ حاضر ہیں:

یکے مقبل وعاقل وہوشیار یکے مدبر وجاہل وشرمسار
یکے رابروں رفتہ اندازہ مال یکے درغم نان وخرچ عیال

اردو میں نظیر اکبر آبادی کی نظم "آدمی" بھی اس سلسلہ میں دیکھی جاسکتی ہے ۔

۲ عرب قبل اسلام میں قبیلہ اوس کی ایک عورت اپنے حسنِ ذوق وخردمندی میں مشہور تھی۔ اس سے پوچھا گیا کہ باعتبار خوبی وزیبائی کونسا منظر بہتر ہے ؟ اس نے جواب دیا: سرسبز و شاداب باغ میں سفید حویلی (اجلی مہاڑی)

جب یہ خبر عمرؓ کو سنائی گئی تو آپ نے دورِ جاہلی کے ایک شاعر عدی بن زید عبادی کا شعر سنایا ۔ عدی نے عورتوں کی مدح میں جو شعر کہے تھے ان میں سے عمرؓ نے جو شعر سنایا اردو میں اس کا مطلب غالباً اس طرح ادا ہو سکے : وہ ایسی ہے جیسے کمانی دار محراب میں ہاتھی دانت سے ترشی ہوئی گڑیا سجی ہوئی ہو ۔ یا (وہ ایسی ہے) جیسے کسی ایسے سبزہ زار میں رکھا ہوا انڈا جس میں سرخی مائل (یا مائل بسفیدی) پھول کھلے ہوں ۔

البیان والتبیین ۔ ج ۱ ص ۴۵

ادبی مصادر میں آثار عمرینؓ

آثار عمرؓ

جناب ڈاکٹر ابو النصر محمد خالدی صاحب پروفیسر شعبۂ تاریخ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو برہان ماہ جولائی ۱۹۷۳ء

۱ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں تن آسان گزران سے ناواقف ہوں؟ یہ ہے لیلا کے قورمہ کے ساتھ میدہ کی روٹی۔ البیان والتبین۔ ج ۱ ص ۱۸

الحیوان ج ۵ ص ۴۸۱ اور البخلاء ج ۲ ص ۱۶۲ جاری

توضیح: ایک جگہ رقیق العیش کے بجائے طیّبات ہے۔ مطلب یہ کہ تم سمجھتے ہو کہ میں خوش رنگ سگندو لذیذ کھانوں سے ناواقف ہوں؟ یہ ہے لیلا کے قورمہ کے ساتھ چھنے ہوئے باریک آٹے کی روٹی۔

اس پر جاحظ کا تبصرہ ہے: خلفاء۔ حکمرانوں کی بوجھ سوجھ اور ان کے فیصلہ کی قوت عام لوگوں (رعیت) کی فراست وفہم سے زیادہ دوربیں اور گہری ہوتی ہے۔ وہ خوش گزران زندگی سے واقف ہوتے ہیں۔ چاہیں تو اختیار کریں۔ چاہیں تو ترک کریں۔ عمرؓ تن آسان زندگی کی طویل مدتی معزتوں سے واقف تھے۔ اس لئے عمداً ایسی اشیاء کا استعمال نہیں کرتے تھے۔

۲ عمرؓ جب کسی شخص کو دیکھتے کہ وہ ژولیدہ بیان و کج مج زبان ہے تو کہتے: اللہ تعالیٰ ہی میں یہ قدرت ہے کہ وہ عمر جیسے خوش بیان و زیرک اور اس جیسے گنگ سا کو پیدا کرسکے۔

عمرؓ کے یہاں حاضر ہونے کی اجازت دینے والے نے انتظارگاہ میں آکر پوچھا: صُہیب ہیں؟ سلمان کہاں ہیں؟ عمّار کدھر ہیں؟ یہ سن کر غصّہ سے عرب سرداروں کے چہروں کا رنگ بدل گیا۔ ہم سے فروتر لوگوں کو امیرالمومنین کے یہاں داخل ہونے کی اجازت مل رہی ہے اور ہم بایں سرداری بیٹھے انتظار کی گھڑیاں گن رہے ہیں۔

یہ حال دیکھ کر سہیل نے کہا: تمھارے چہرے کیوں بدل رہے ہیں؟ اسلام کی دعوت ہماری طرح انھیں بھی دی گئی۔ ان لوگوں نے دعوت قبول کرنے میں جلدی کی۔ ہم نے دیر لگائی۔ تم یہاں عمرؓ کے دروازہ پہ بیٹھے ان پر حسد کر رہے ہو کہ انھیں تم پر ترجیح دی جا رہی ہے (تمھیں معلوم ہونا چاہئے کہ) اللہ نے ان کے لئے جنت میں جو کچھ تیار کر رکھا ہے وہ اس شرف سے کہیں زیادہ ہے۔ البیان والتبیین ج ۱ ص ۵۸، ۳۱۷

ملحوظہ: جاحظ نے سہیل کی بابت درج بالا قول اس واقعہ کی شہادت میں پیش کیا ہے کہ جس کے اگلے دانت گر جاتے ہیں اس کی زبان سے الفاظ ٹھیک طور سے ادا نہیں ہو سکتے۔ اسی ضمن میں وہ عمرؓ کا یہ عمل بھی درج کر گئے ہیں کہ وہ اسلام لانے میں جن لوگوں نے پہل کی تھی ان کو بعد میں اسلام لانے والوں پر ترجیح دیتے تھے۔

"اگر معاملہ ٹھیک طور پر انجام نہ پائے تو میں اپنا مال دے دوں گا۔" سہیل کے اس قول کا مطلب راقم الحروف پر اچھی طرح واضح نہیں ہو سکا۔ نظر بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اشارہ زکاۃ ادا کرنے کا ارادہ کرنے والوں کی طرف ہے ــــ اِنّی اسألُ الخبیر ولہ الجزاء ــــ

(لکنت ـ تھوتھلا کی ایک قسم یہ ہے: بعض لوگ شینِ نقطہ دار کو ادا نہیں کر سکتے اس کی بجائے سین دندانہ دار بولتے ہیں۔ ایسے افراد میں شاعر سُحیم بھی ہے)

۵ سُحیم نے عمرؓ کو ایک قصیدہ سنایا۔ اس کے مطلع کا مطلب یہ تھا: تو اب اپنی محبوبہ عُمیرۃ سے لہو و لعب ترک کر دے۔ میں نے اب (برائے جہاد) صبح خیزی کی عادت ڈال لی

عمرؓ نے جو بیت سنائی اس کے بعد والی بیت بھی قابل توجہ ہے۔ اس کے لئے ملاحظہ ہو

رغبۃ الآمل من کتاب الکامل۔ سید بن علی مرصفی۔ مصر ۱۳۴۷ھ۔ ج ۶ ص ۱۷۸۔

اس کا مطلب ہے: ان کے جسم کو ایسے لباس نے زینت دی ہے (جس کے اندر سے ان کے متناسب اعضاء جھلک رہے ہیں) ان کے ریشمی کپڑے مشک میں بسائے گئے ہیں۔ ان کی پرورش خوشبودار، خوش رنگ و خوش مزہ غذا سے ہوئی ہے۔

۴ ابوزید سہیل اسلام قبول کرنے سے پہلے رسول اللہ صلعم کے مخالف تھے۔ ابوزید کا نیچے کا ہونٹ کٹا ہوا تھا۔ یہ قریش کے ایک زباں آور خطیب تھے۔ (رسول اللہ صلعم کے مخالف ہونے کی وجہ سے) عمرؓ نے کہا: یارسول اللہ! آپ سہیل کے نیچے کے دو اگلے دانت اکھڑوا دیجے کہ اس کی زبان باہر نکل آئے اور وہ آپ کے خلاف تقریر کرنے کے لئے کھڑا نہ ہو۔ اس پر آپ صلعم نے فرمایا: میں کسی شخص کے ٹکڑے ٹکڑے نہیں کروں گا۔ ایسا کروں تو اللہ مجھے بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا خواہ میں نبی ہی کیوں نہ ہوں۔ عمر! تم اس وقت سہیل سے تعرض نہ کرو کیا عجب کہ تم اس کو ایسے مقام پر خطبہ دیتے دیکھو جس سے تم کو خوشی ہو۔

(رسول اللہ صلعم کی یہ پیش بینی درست ثابت ہوئی چناں چہ) جب رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد اہل مکہ میں امارت کے بارے میں ہیجان برپا ہوا تو سہیل مجمع میں کھڑے ہوئے خطبہ دیا۔ اس میں کہا: لوگو! اگر محمد صلعم وفات پاگئے تو کیا ہوا۔ اللہ تو زندہ ہے۔ وہ کبھی نہیں مرے گا۔ تم جانتے ہو کہ خشکی میں میرے اونٹ اور تری میں میری کشتیاں جاری ہیں۔ (تم لوگ میری ثروت و دولت سے واقف ہو) اپنے امیر کو حسب سابق برقرار رکھو میں ذمہ داری لیتا ہوں کہ اگر معاملہ بخیر و خوبی انجام نہ پائے تو اپنا سارا مال تمھیں دے دوں گا۔

سہیل کے اس خطبہ کا یہ اثر ہوا کہ اہل مکہ میں ہل چل باقی نہیں رہی اور سکون ہوگیا۔

جاحظ نے اس ضمن میں سہیل کا ایک اور قول بھی نقل کیا ہے یہ بھی کچھ کم اہم نہیں۔ لکھا ہے: عمرؓ کے قیام گاہ کے باہر کئی عرب سردار بغرض ملاقات اجازت کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔

غالباً محفلِ عقد میں سبھوں کا ایک دوسرے کے آمنے سامنے روبرو ہونا اور باہم دیدوں میں دیدے ڈالنا ہوگا۔ جب وہ سب کے ساتھ بیٹھتے تو وہ بھی سب کے برابر سراہا اور ہر ایک کے ہم درجہ و ہم مرتبہ ہو جاتے لیکن جب منبر پر چڑھتے تو سب حاضرین کی حیثیت عامیوں اور پیروؤں کی ہو جاتی یہ ان کے حاکم ورائی ہوتے۔

مجھے تو سوائے اس کے اور کوئی توجیہہ سمجھ میں نہیں آتی۔

ابن المقفع کی اس توجیہ کو نقل کرنے کے بعد جاحظ نے اس پر اپنا اضافہ اس طرح نقل کیا ہے:

بعض لوگ قول عمرؓ کی اس (غلط) تاویل کی طرف نکل گئے ہیں کہ نکاح کے خطیب کو اس بات سے گریز کرنا ممکن نہیں کہ وہ دُلہا کی پاک بازی و نیک منشی بیان کرے۔ اس لئے شاید عمرؓ اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ وہ دُلہا کی خوبی بیان کریں جو اس میں نہیں ہے۔ اگر ایسا کرتے تو اس طرح آپ ایک بات بول جاتے اور جس کی مدح کرتے اس کی قوم کو اس کے متعلق دھوکے میں ڈال دیتے۔

اس کے بعد جاحظ لکھتے ہیں: واللہ! یہ تاویل تو اس صورت میں درست ہوتی کہ خطیب صرف خطبہ نکاح کے لئے ہو۔ رہے عمرؓ یا آپ جیسے ہدایت یافتہ امام تو انھوں نے کبھی کسی کی ستائش کرنے میں ایسا تکلف نہیں کیا کہ جو صفت جس میں نہیں پائی گئی اس کی مدح کریں۔ انھوں نے اسی کی مدح کی جس کا وہ فی الواقع مستحق تھا۔

جاحظ نے اس سلسلہ میں غالباً اپنا یہ مشاہدہ بھی ثبت کیا ہے کہ نکاح کا خطبہ دینے والے اپنے خطبوں میں اکثر اٹک جاتے ہیں اور رکاوٹ محسوس کرتے ہیں۔

البیان والتبیین۔ ج ۱ ص ۱۱۷، ۱۳۴

خالد بن ولید کی وفات پر (سنہ ۱۹ انیس ہجری) عورتیں آہ وزاری کرنے لگیں تو عمرؓ نے کہا اگر وہ آہ وزاری میں غلو کر کے باآواز بلند ہائے وائے کریں، سینہ کوبی کریں اور نہ اپنا

ہے۔ یوں بھی بڑھاپا لہو ولعب سے روکنے کے لئے کافی ہے۔ اس کے لئے کسی اور مانع کی ضرورت نہیں: کفی الشیب والاسلام للمرء ناھیا۔

اس پر عمرؓ نے فرمایا اگر تم اسلام کو بڑھاپے پر مقدم کرتے تو میں تمھیں انعام دیتا۔

یہ سن کر سحیم نے کہا: مجھے اس کا احساس نہیں ہوا۔ "ما شعرتُ" کی بجائے "ما سعرت" کہا۔ البیان والتبیین۔ ج ۱ ص ۱۷ جاری

توضیح: جاحظ نے عمرؓ کا قول ضمناً نقل کیا ہے۔ اصل مقصد لکنت کی وہ قسم بتانا ہے جس میں شین معجمہ کو بعض لوگ سین دندانہ دار کی طرح ادا کرتے ہیں۔

یہاں قول عمرؓ کے سلسلہ میں یہ خیال رہے کہ عربی بلاغت کی رو سے تحریر یا تقریر میں کسی بات کو پہلے بیان کرنے میں اس کی اہمیت جتانا ہوتا ہے۔ یہ عربی بلاغت کا اکثریہ ہے کلیہ نہیں۔

۶ عمرؓ سے کہا گیا: فلاں شخص برائی جانتا ہی نہیں۔ آپ نے فرمایا: نادانستگی کی وجہ سے اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ وہ برائی میں گر پڑے۔

البیان والتبیین۔ ج ۱ ص ۹۹ و ج ۲ ص ۳۲۷

الحیوان ج ۷ ص ۲۵۹

تنبیہ: یہاں برائی۔ شر سے مراد شرعی حرمت نہیں کہ وہ ظاہر ہے۔ اس سیاق میں شر سے مراد باصطلاح شرع غالباً مکروہات ہیں۔

واقفیت کے لئے معتبر سماعی شہادت یا ٹھیک مشاہدہ کافی ہے۔ واقفیت کے لئے ذاتی تجربہ لازمی نہیں۔

۷ عمرؓ نے کہا: مجھے کسی موضوع پر کچھ بولنے میں اتنی دشواری نہیں ہوتی جتنی کہ نکاح کا خطبہ دینے میں ہوتی ہے۔

عبداللہ بن المقفع سے اس قول کی توضیح چاہی گئی تو اس نے کہا: اس سے عمرؓ کی مراد

تبصرے

خطبات آزاد مرتبہ جناب مالک رام صاحب، کتابت طباعت بہتر، ضخامت ۴۳۶ صفحات، تقطیع متوسط، قیمت مجلد -/18 پتہ: ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم انشا اور خطابت دونوں کے بادشاہ تھے، خطابت کے لئے فنی طور پر جو ظاہری حسن وجمال اور صوری رعنائی و دلکشی درکار ہے قدرت نے انھیں اس تک سے حصۂ وافر نوازا تھا، ان کی خطابت جادو جگاتی اور طوفان اٹھاتی تھی، وہ کبھی رعد وبرق کی گرج تھی اور کبھی نسیم سحر کی موج حیات آفریں، وہ صور اسرافیل بھی تھی اور زعفران زار کشمیر بھی، ساہتیہ اکاڈمی نے مولانا کے تمام سرمایۂ تحریر وتقریر کو نہایت اہتمام اور کمالِ حسن سلیقہ سے اشاعت پذیر کرنے کا جو پروگرام بنایا ہے اور جس پر بڑی سرگرمی اور پابندی سے وہ عامل ہے اب اس نے مولانا کے خطبات شائع کرنے شروع کئے ہیں، یہ کتاب اس سلسلہ کی پہلی جلد ہے جو پندرہ خطبات پر مشتمل ہے، اور ان میں تقریباً وہ سب خطبات جنھوں نے ایک زمانہ میں پورے ملک میں مولانا کی خطابت کی دھوم مچا دی تھی، مثلاً مجلس خلافت آگرہ، جمعیت علمائے ہند لاہور، انڈین نیشنل کانگریس، دلّی ورام گڈھ، عربی نصاب کمیٹی لکھنؤ، تقسیم کے فوراً بعد جامع مسجد دہلی میں تقریر، یہ سب خطبات آگئے ہیں۔ حسنِ ترتیب کے لئے فاضل مرتب کا نام سب سے بڑی ضمانت ہے، چنانچہ اعلیٰ کتابت وطباعت اور کاغذ اور صحت کے اہتمام کے ساتھ کتاب کے آخر میں آیات قرآنی، احادیث، اعلام، بلاد واماکن، کتب ورسائل کی الگ الگ

منہ نوچیں تو کوئی حرج نہیں۔

البیان والتبیین۔ ج ۱ ص ۱۲۵ جاری

تنبیہ: کسی کی وفات پر رونا حرام یا مکروہ نہیں ہے البتہ سینہ پیٹنا، منہ نوچنا یا ایسے ہی خود آزاری کی حرکتیں کرنا جائز نہیں۔

۹ ابو بحر صخر احنف م ۶۷ھ بصرہ سے روایت ہے: عمرؓ کہا کرتے تھے: سرداری کی خواہش کرنے سے پہلے سوجھ بوجھ سیکھو۔

عمرؓ یہ بھی کہتے تھے کہ: سرداری سیاہی کے ساتھ خوب ہے۔

البیان والتبیین۔ ج ۱ ص ۱۹۷ و ج ۲ ص ۲۸۶

الحیوان۔ ج ۱ ص ۸۷ و ج ۳ ص ۴۶۷

توضیح: دوسری روایت کا مطلب ہے: جب بال سیاہ ہوں یعنی جوانی کے زمانہ میں علم کی طلب یا فن میں مہارت حاصل کرلینا چاہیئے۔ بالفاظ دیگر زندگی کے کسی نہ کسی شعبہ کا علم و فن حاصل کرنے کا بہترین زمانہ نوجوانی ہے۔ بڑھاپے میں اس کا حاصل کرنا نہایت دشوار ہے۔

۱۰ ہرم فزاری گاڑھے موٹے کپڑے کی چادر اوڑھے لپیٹے مسجد کے ایک کونے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ عمرؓ نے دیکھا کہ وہ ایک ٹھینگنے بدہیئت و بے رُو آدمی ہیں۔ آپ کو معلوم تھا کہ اہل عرب ہرم کو جھگڑے چکانے کی صلاحیت اور دانائی میں اپنا پیشوا مانتے تھے۔ عمرؓ کو ہرم کی ہیئت سے تعجب ہوا۔ آپ نے چاہا کہ حقیقت حال دریافت کریں اور اندازہ کریں کہ ان کی بوجھ سوجھ کا کیا حال ہے۔ اس غرض سے آپ نے پوچھا: ہرم! بتاؤ۔ اگر آج بھی عامر و علقمہ منافرت کریں اور تمھیں حکم بنائیں تو تم کیا حکم لگاؤ گے؟

ہرم نے فوراً جواب دیا: امیر المومنین اگر ان دونوں کی بابت ایک لفظ بھی زبان سے نکالوں تو ٹھنڈی پڑی ہوئی دبی آگ کو از سرِ نو بھڑکا دوں گا۔

یہ سن کر عمرؓ نے فرمایا: ٹھیک ہے۔ اسی دانائی کی وجہ سے اہل عرب اپنے ٹنٹے جھگڑے چکانے میں تم کو ثالث بناتے رہے ہیں۔ البیان والتبیین ج ۱ ص ۲۳۷ (باقی)

ونات، خاندان ومذہب، ممدوحین ومعاصرین سے متعلق تذکرہ نویسوں کے بیانات
تنقیدی جائزہ لینے میں جو داد تحقیق دی ہے وہ بے حد دلچسپ اور لائق مطالعہ ہے۔ اس
بعد چند صفحات میں استدراکات واضافات بھی ہیں جو بجائے خود مفید ہیں۔ آخر میں اعلام
خاص، امکنہ وکتب وغیرہ کی حسب معمول طویل فہرستیں ہیں، غرض کہ پوری کتاب تحقیق و
ش اور دقت و وسعت نظر کا شاہکار ہے، لیکن نہایت افسوس کی بات ہے کہ ایسی بلند
کتاب اور اغلاط کتابت سے بھرپور، یہ اغلاط فارسی، عربی اور انگریزی تینوں کے ٹائپ
ہیں اگرچہ غلط نامہ درج ہے لیکن قاری کو جو الجھن ہوتی ہے اس کی تلافی نہیں ہوسکتی،
ارے ہندوستان کی قسمت ہے۔

روستان میں تیرھویں صدی عیسوی کی } (انگریزی) ازجناب ڈاکٹر ممتاز علی خاں،
ن اہم فارسی نثری تصنیفات } تقطیع متوسط، ضخامت ۱۸۲ صفحات،
ب جلی اور روشن قیمت درج نہیں۔ پتہ: شعبۂ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔

ہندوستان میں تیرھویں صدی عیسوی کا زمانہ سیاسی، سماجی اور علمی وادبی حیثیت
نہایت اہم ہے، اس دور میں ایران کے بڑے بڑے ارباب علم وفضل کثرت سے
دستان آئے اور ان کی وجہ سے یہ ملک علم وادب، شعر وسخن اور سلوک وتصوف
لزار بن گیا، اس دور کی تاریخ اور ادب پر انگریزی اور اردو میں مسلم اور غیرمسلم
قین ومورخین نے بہت کچھ لکھا ہے، لیکن اس کے نثری سرمایۂ تحریر کی طرف زیادہ
نہیں کی گئی تھی، اس کتاب میں جو دراصل فارسی میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا منظور
پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے، لائق مصنف نے اسی کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے اور
ہے کر ریسرچ کا حق ادا کردیا ہے، اصل موضوع کی مناسبت سے پہلے دور زیر بحث
ان ایران اور ہندوستان کے باہم روابط کا ایک جائزہ لیا گیا ہے اور پھر کتاب کے

فہرستیں بھی ہیں، پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ مرتب نے ساٹھ صفحوں میں خطبات پر حواشی بھی لکھے ہیں اور آخر میں ان حواشی کے مآخذ کی فہرست بھی دی ہے، علمی اور ادبی حیثیت سے یہ بجائے خود نہایت مفید اور معلومات افزا کام ہے، جس پر ساہتیہ اکاڈمی اور جناب مالک رام صاحب دونوں مبارکباد کے مستحق ہیں۔

دیوان سید سراج الدین خراسانی مرتبہ پروفیسر نذیر احمد صدر شعبہ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، تقطیع کلاں، ضخامت سات سو صفحات، کاغذ اعلیٰ، ٹائپ جلی اور روشن، قیمت مجلد =/40 پتہ: مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

سراجی چھٹی ساتویں صدی ہجری کا ہندوستان کا مشہور بلند پایہ شاعر ہے اس کے دیوان کے دو ہی مخطوطے، ایک علی گڑھ میں اور دوسرا طہران میں موجود تھے، پروفیسر نذیر احمد صاحب جو فارسی زبان اور اس کے ادبیات کے نہایت بلند پایہ محقق اس درجہ کے ہیں کہ ایران کے ارباب علم و تحقیق بھی معترف و مداح ہیں اور جن کو نوادر کی ہمیشہ جستجو رہتی ہے، آپ نے ان دونوں مخطوطوں اور بعض اور جزوی مآخذ کی اساس پر اپنے خاص ذوق کے مطابق اس دیوان کو مرتب کیا ہے جو ایک سو بارہ قصائد پر مشتمل ہے، پروفیسر صاحب نے حاشیہ میں دونوں نسخوں کے اختلافات کا ذکر کیا ہے اور جو الفاظ یا اشعار مشکل ہیں ان کی تشریح کی اور مطلب بتایا ہے، اس کے علاوہ اس سلسلہ میں موصوف کا سب سے بڑا علمی اور تحقیقی کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے پورے دیوان پر جو ۳۵۲ صفحات پر آیا ہے ۲۱۰ صفحات پر نہایت پر از معلومات تعلیقات لکھے ہیں جن میں تلمیحات کی تخریج کی ہے دوسرے شعراء کے کلام سے ہم معنی اشعار نقل کئے ہیں یا کوئی اور ادبی اور لغوی تحقیق کی ہے پھر انگریزی اور فارسی دونوں زبانوں میں مقدمہ لکھا ہے جن میں شاعر کے حالات زیادہ تر دیوان سے ہی مستنبط کر کے لکھے ہیں، اس سلسلہ میں شاعر کے تخلص، تاریخ پیدائش

سنہ ۱۹۵۴ء حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ۔ العلم والعلماء ۔ اسلام کا نظام عفت و عصمت ۔
تاریخ صقلیہ ۔ تاریخ ملت جلد ہشتم

سنہ ۱۹۵۵ء اسلام کا زرعی نظام، تاریخ ادبیات ایران، تاریخ علم فقہ، تاریخ ملت حصہ دہم سلاطین ہند اول
تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی

سنہ ۱۹۵۶ء ترجمان السنۃ جلد ثالث ۔ اسلام کا نظام حکومت (طبع جدید، جدید ترتیب) جدید بین الاقوامی
سیاسی معلومات جلد دوم خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات

سنہ ۱۹۵۷ء لغات القرآن جلد پنجم صدیق اکبر، تاریخ ملت حصہ یازدہم سلاطین ہند دوم انقلاب ۱۸۵۷ء سے پہلے اور انقلاب کے بعد

سنہ ۱۹۵۸ء لغات القرآن جلد ششم سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ۔ تاریخ گجرات جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد سوم

سنہ ۱۹۵۹ء حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، مصائب سرور کونینؐ

سنہ ۱۹۶۰ء تفسیر مظہری اردو پارہ ۲۹ ۔ ۳۰ ۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے سرکاری خطوط
امام غزالی کا فلسفہ مذہب و اخلاق ۔ عروج و زوال کا الٰہی نظام ۔

سنہ ۱۹۶۱ء تفسیر مظہری اردو جلد اول مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط ۔ اسلامی کتب خانے عرب دنیا ۔
تاریخ ہند پر نئی روشنی

سنہ ۱۹۶۲ء تفسیر مظہری اردو جلد دوم ۔ اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں معارف الآثار ۔
نیل سے فرات تک

سنہ ۱۹۶۳ء تفسیر مظہری اردو جلد سوم ۔ تاریخ ردہ سرکشی ضلع بجنور ۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی اول

سنہ ۱۹۶۴ء تفسیر مظہری اردو جلد چہارم حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط عرب و ہند عہد رسالت میں ۔
ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں ۔

سنہ ۱۹۶۵ء ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اول ۔ تاریخی مقالات
لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر ایشیا میں آخری نوآبادیات

سنہ ۱۹۶۶ء تفسیر مظہری اردو جلد پنجم ۔ رموز عشق ۔ خواجہ بندہ نواز کا تصوف و سلوک ۔
ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں

سنہ ۱۹۶۷ء ترجمان السنۃ جلد چہارم، تفسیر مظہری اردو جلد ششم حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کی فقہ

سنہ ۱۹۶۸ء تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم ۔ بزم تذکرے ۔ شاہ ولی اللہؒ کے سیاسی مکتوبات
اسلامی ہند کی عظمت رفتہ ۔

سنہ ۱۹۶۹ء تفسیر مظہری اردو جلد ہشتم ۔ تاریخ الفخری حیات ذاکر حسین ۔ دین الٰہی اور اس کا پس منظر

سنہ ۱۹۷۰ء حیات عبدالحی تفسیر مظہری اردو جلد نہم ۔ مآثر و معارف ۔ احکام شرعیہ میں حالات زمانہ کی رعایت

سنہ ۱۹۷۱ء تفسیر مظہری اردو جلد دہم بیماری اور اس کا روحانی علاج خلافت راشدہ اور ہندوستان

سنہ ۱۹۷۲ء فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر ۔ انتخاب الترغیب والترہیب ۔ اخبار التنزیل
عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان

چار ابواب میں سے پہلے باب میں عہد غزنوی کے فارسی لٹریچر اور دوسرے باب میں تیرھو
صدی کے سیاسی، سماجی، ثقافتی اور ادبی حالات کا ایک مختصر مگر جامع خاکہ پیش کیا گیا ہے
تیسرے باب سے اصل موضوع پر گفتگو شروع ہوتی ہے، چنانچہ اس میں فخر مدبر، حسن نظا
نیشاپوری، محمد عوفی، اور منہاج سراج، ان سب کے حالات وسوانح، ان کی نثری تصنیفات
ان کے مضامین ادبی اور لسانی ولغوی خصوصیات اور شاعری۔ اور اس کی خصوصیات
تجزیاتی اور تنقیدی گفتگو کی گئی ہے، چوتھا باب تراجم اور چشتی بزرگان کرام کے ملفوظات
کے ذکر کے لئے مخصوص ہے، اول الذکر کے ماتحت چچ نامہ، ترجمۂ احیاء العلوم امام غزا
اور البیرونی کی کتاب الصیدنہ کا تنقیدی مطالعہ کیا گیا ہے اور موخرالذکر کے سلسلہ میں چار
ملفوظات کا تذکرہ ہے جو کچھ لکھا ہے کمال تحقیق، ژرف نگاہی اور تنقیدی شعور کے سا
لکھا ہے جس کا اندازہ مآخذ کی اس طویل فہرست سے ہوسکتا ہے جو حسب قاعدہ کتاب کے
آخر میں شامل ہے، اس کے بعد اعلام واشخاص، اور امکنہ کی فہرست ہے، امید ہے ارباب
ذوق اس کے مطالعہ سے شادکام ہوں گے۔

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

مرتبہ
سعید احمد اکبرآبادی

Regd. No. D. (D) 231 Phone 262815 MARCH 1975

حکیم مولوی محمد ظفر احمد خاں پرنٹر پبلشر نے یونین پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کراکر
دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶ سے شائع کیا۔

No. 4 Vol 74

جلد ۷۴	ماہ ربیع الاول ۱۳۹۵ھ مطابق اپریل ۱۹۷۵ء	شمارہ ۴

فہرست مضامین

مسلمان آج کل کے حالات میں حضرت مجدد کی تعلیمات اور آپ کے افکار سے کیا فائدہ حاصل کرسکتے ہیں اور کیونکر؟" حقیقت یہ ہے کہ وائس چانسلر مسعود حسین خاں صاحب نے یہ سوال اٹھاکر آج کل کے قومیت زدہ مسلمانوں کی ذہنیت بے نقاب کردی، اس لئے ہمارے نزدیک یہ سوال بہت اہم تھا اور ہم نے اسی وقت تجویز کی تھی کہ اس پر سمینار ہونا چاہیئے۔

بدقسمتی سے ذہنی مرعوبیت یا حقائق و واقعات کو ان کی اصل شکل وصورت میں نہ دیکھ سکنے کے باعث ہندوستان کے نیشنلسٹ مسلمانوں کے ایک طبقہ کا ذہن یہ بن گیا ہے کہ اکبر کا نام لینے میں انھیں فخر محسوس ہوتا ہے اور حضرت مجدد کا ذکر کرتے ہوئے ان پر محجوبیت طاری ہوجاتی ہے، جہانگیر کا تذکرہ مسرت سے کرتے ہیں اور اورنگ زیب عالمگیر کا نام لینے میں جھجک محسوس ہوتی ہے، ذہن وفکر کی یہ تبدیلی تقسیم کا عطیہ ہے، ورنہ اس سے پہلے یہ بات نہیں تھی۔ چنانچہ ایک "علامہ" نے تو مستقل انگریزی میں ایک کتاب ہی لکھ ماری ہے جس میں حضرت مجدد کے افکار و آرا کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کے ساتھ تنقیص و توہین کا کوئی دقیقہ نہیں ہے جسے فروگذاشت کردیا گیا ہو، اسی طرح ندوۃ المصنفین، دہلی سے ڈاکٹر محمد اسلم (پنجاب یونیورسٹی، لاہور) کی کتاب "حضرت مجدد الف ثانی کی تحریک کا تاریخی پس منظر" شائع ہوئی تو یہاں اور وہاں ہر جگہ کے ارباب علم ونظر نے اس کو پسند کیا اور تعریف کی، لیکن قومی آواز، لکھنؤ نے اس پر ایک طویل تنقید لکھی اور اس میں اکبر کو سراہا گیا، اس کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ماہنامہ جامعہ میں مسلسل کئی ماہ تک اس پر تنقید شائع ہوتی رہی اور پھر اسی مقالہ کو ایک مقدمہ کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کردیا گیا، اس پوری تنقید کا حاصل یہ تھا کہ کتاب میں اکبر پر جو الزامات لگائے گئے ہیں اُن سب کا مآخذ ملّا عبدالقادر بدایونی ہیں اور ملا صاحب کو چونکہ اکبر سے ذاتی رنجش اور بیر تھا اس لئے اکبر سے متعلق ان کے تمام بیانات قابل رد اور ناقابل التفات ہیں۔ حالانکہ انصاف اور سلامت روی کا تقاضا یہ تھا کہ ایک طرف اسلام کی تعلیمات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

پچھلے دنوں مولانا شاہ ابوالحسن زید فاروقی (درگاہ شاہ ابوالخیر صاحب، دہلی) نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح حیات اور کارناموں پر ایک مبسوط اور فاضلانہ مقالہ پڑھا۔ مولانا حضرت مجدد الف ثانی کے ہی خاندان سے تعلق رکھتے اور اسی سلسلہ کی ایک درگاہ کے سجادہ نشین ہیں اور ورع وتقویٰ کے علاوہ نہایت کثیر المطالعہ اور دقیق النظر عالم ہیں اور حق گوئی میں مصلحت اندیشی سے طبعاً نفور ہیں اس بنا پر آپ کا مقالہ جہاں محققانہ تھا حضرت مجدد الف ثانی کی تعلیمات اور آپ کے افکار و آرا کا بیباک ترجمان بھی تھا، مقالہ کے ختم ہونے کے بعد اسی موضوع پر ایک مختصر مذاکرہ بھی ہوا جس میں جامعہ کے اساتذہ اور بعض بیرونی اصحاب علم نے حصہ لیا، آخر میں پروفیسر مسعود حسین خاں وائس چانسلر جامعہ ملیہ نے بحیثیت صدر جلسہ ایک مختصر تقریر کی جس میں انھوں نے مقالہ کی تعریف میں کہا: "مجھے بڑی خوشی ہے کہ آج ایک عرصہ کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ کی فضا میں اس درجہ محققانہ اور فاضلانہ مقالہ پڑھا گیا ہے، پھر علامہ اقبال کے حوالہ سے حضرت مجدد کی ذات کے ساتھ اپنی عقیدت و ارادت کا اظہار فرمایا، لیکن آخر میں ہندوستان کے "نیشنلسٹ" مسلمانوں کی دکھتی ہوئی رگ پر انگلی رکھتے ہوئے انھوں نے اپنے خاص انداز میں کہا: لیکن اس موقع پر میرے دماغ میں ایک سوال پیدا ہو رہا ہے ـــــ اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ حضرات میں سے بہت سے لوگوں کے دماغ میں بھی یہ سوال پیدا ہوا ہوگا ـــــ میں یہ سوال آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں تاکہ آپ اس پر غور فرمائیں اور اس کا جواب تلاش کریں، اور وہ یہ ہے کہ ہم ہندوستان کے

...ں سے جاتا رہا ہے ، ان میں سے ہر شخص اپنی ہوا و ہوس کا غلام ہے ، مذہب کی حقیقی روح
...ں کی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے ، آخرت اور یوم حساب کا کسی کو دھیان نہیں
...چند روزہ زندگی کے عیش و آرام کو ہی مطمح نظر بنا لیا گیا ہے ، تصوف ، علم دین اور دین معرفت و
...ی یہ سب دام تزویر کی طرح استعمال ہو رہے ہیں ، بادشاہ نے دین کو مغلوب اور مفلوج کر دیا
...ین کے شعائر کا مذاق اڑاتا ہے ، حق کے بالمقابل اباطیل و خرافات کی پشت پناہی کر رہا
...یہ وہ حالات ہیں جن کے باعث فتنہ عام ہے ، انسانیت برباد ہے ، زندگی کے اقدار
...اک بسر اور ہوا و ہوس کا بازار گرم ہے ، اب تاریخ سے پوچھو کہ یہ سب کچھ اُس سوائی
...نہ تھا یا نہیں ، مسلمانوں کا کیا ذکر ! ابوالفضل اور فیضی نے اکبر کے نام سے دین الٰہی کا جو
... رچایا تھا اُس سے ہندو بھی بیزار اور نالاں تھے ، کیونکہ وہ تو ایک ایسا سیلاب عظیم تھا
...ب کو ہی بہا لے جانا چاہتا تھا ۔ ملا عبدالقادر بدایونی کو اگر آپ نہیں مانتے نہ مانیے لیکن
...فضل کی تحریروں سے ، حضرت مجدد کے مکتوبات سے اور حضرت خواجہ کلاں کے ملفوظات سے
...تاریخوں میں اس عہد کے نامور لوگوں کے جزئی واقعات سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے ، کیا اُس
...ناممکن ہے ، اگر نہیں اور یہ حالات واقعی اور حقیقی تھے تو اب اسلام کی تعلیمات کی روشنی
...یا چاہیئے کہ ایک علمبردار اصلاح کا اس وقت فرض کیا ہونا چاہیئے تھا ، اگر حضرت مجدد
...تکلیفیں اور مصیبتیں برداشت کر کے اس سیلاب بلا کو روکا تو اس میں کوئی شبہ نہیں
...ور مسلمانوں پر تو ان کا احسانِ عظیم ہے ہی مگر ساتھ ہی ان کا احسان ہندوؤں اور دوسرے
...کے لوگوں پر بھی ہے اور پورے اس ملک پر بھی ہے ، کہ اس طرح حضرت مجدد نے اس
...طوائف الملوکی سے ملک کو بچا لیا جو دین الٰہی کے فروغ اور مختلف سماجی طبقات کی حد سے
...ہی اور بے راہ روی کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ، جہاں تک اقدار عالیہ کا تعلق ہے ان میں من و تو
...ا ہوتا ، اگر میں اپنے لئے اچھا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں سب کے لئے اچھا ہوں اور
...ا خود اپنا دشمن ہوں تو پھر میں کسی کا بھی دوست نہیں ! یہ چند سطور نظرات کی حد سے

رکھی جاتیں جو ابدی ہیں، عالمگیر ہیں اور جو زمان و مکان اور سلطنت کے تغیر و تبدل سے نہیں بدلتیں اور آفتاب کی شعاعوں کی طرح ہمیشہ یکساں رہتی ہیں اور دوسری جانب عہدِ زیر بحث کے تاریخی واقعات کا معروضی مطالعہ کرکے ایمانداری سے جائزہ لیا جاتا۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ عہد اکبر و جہانگیر کی مسلم سوسائٹی کا کوئی طبقہ ایسا نہیں ہے جس کو حضرت مجدد نے اپنی سخت اور کڑی تنقید کے ناوک کا نشانہ نہ بنایا ہو، بادشاہ، اعیان و امراء سلطنت، شیعہ، سنی علماء، صوفیاء، مشائخ، اربابِ درس و تدریس، عمالِ حکومت، اصحابِ تجارت، عوام اور خواص ان میں سے کونسا طبقہ ہے جس کا ماتم حضرت مجدد نے نہیں کیا اور جس کا نوحہ کمال دلسوزی و جگر برشتگی سے نہیں پڑھا۔ اس بنا پر یہ تو ظاہر تھا کہ ہر طبقہ میں ان کی مخالفت ہوئی، اعیان و امراء نے بادشاہ کو ان سے بدظن کرکے انھیں گوالیار میں قید کرایا، علماء نے ان کے خلاف رسالے لکھے (جو مخطوطہ کی شکل میں مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں اور بعض اور کتب خانوں میں محفوظ ہیں) صوفیا میں شیخ محب اللہ الہ آبادی جو وحدت الوجود کے مسئلہ میں شیخ ابن عربی کے نہایت غالی پیرو اور ترجمان تھے اور جنھوں نے شیخ کی فصوص الحکم کی شرح عربی اور فارسی دونوں میں لکھی تھی انھوں نے حضرت مجدد کی مخالفت میں سب سے زیادہ سرگرمی دکھائی اور کتابوں پر کتابیں تصنیف کر ڈالیں، بہرحال اس میں نہ کوئی بات حیرت اور اچنبھے کی ہے اور نہ استعجاب و استغراب کی، دنیا میں ہمیشہ معرکۂ حق و باطل اسی طرح بپا رہا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ اچھے اور برے کس طبقہ میں نہیں ہوتے اور کب نہیں ہوئے ہیں، فرق صرف کثرت اور قلت کا ہے، کسی طبقہ میں کثرت اچھوں کی ہوتی ہے تو وہ اچھا کہلاتا ہے اور برے کثرت سے ہوتے ہیں تو وہ طبقہ برا کہا جاتا ہے، اب حضرت مجدد نے مختلف طبقات پر جو تنقید کی ہے اس کا تجزیہ کیا جائے تو اس کا حاصل یہی نکلتا ہے کہ ان لوگوں پر دنیا غالب آگئی ہے، خوف خدا ان

نظرات کی کتابت ہو چکی تھی کہ شاہ فیصل رحمۃ اللہ علیہ کے حادثہ فاجعہ کی اطلاع ملی۔ بلاشبہ یہ حادثہ اس وقت پورے عالم اسلام کے لئے بہت بڑا اور ناقابل تلافی المیہ ہے۔ آئندہ اشاعت میں اس پر تفصیل سے اظہار خیال کیا جائے گا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی مدظلہ العالی کا مکتوب گرامی

پچھلے دنوں صدق جدید میں پہلے ہی صفحہ پر "صدق کا مستقبل" کے عنوان سے خود مولانا کا لکھا ہوا نوٹ نظر سے گذرا تو طبیعت سخت بے چین اور مضطرب ہوئی اور فوراً مولانا کی خیریت وعافیت مزاج اور صحت کی رفتار معلوم کرنے کے لئے حکیم عبدالقوی صاحب کے نام ایک خط لکھا۔ الحمد للہ کہ اس عریضہ کا جواب مولانا نے خود اپنے قلم سے لکھا ہے؛ ہم ذیل میں اس مکتوب گرامی کو شائع کرنے کا شرف حاصل کرتے ہیں۔

بسم اللہ

مورخہ ۱۹ مارچ ۱۹۷۵ء صدق دریاباد ضلع بارہ بنکی

برادرم وعلیکم السلام

اپنے مردہ خط کا نمونہ دکھانے کے لئے ایک دو سطریں اپنے ہاتھ سے لکھے دیتا ہوں، غلطیاں کثرت سے ہوتی ہیں، بولنے میں بھی اور لکھنے میں بھی، اخبار، رسالے، کتابیں سب کے مطالعہ میں بڑی ہی دشواریاں ہوتی ہیں، پیشاب کے لئے رات میں تین چار بار اٹھنا پڑتا ہے، ذاتی کتب خانہ (......؎......) الگ کر دیا ہے، ندوہ اور علی گڑھ کے درمیان چلنے میں زیادہ تھکن نہیں ہوتی، کھڑے ہونے میں البتہ ہوتی ہے۔ آپ کا مضمون

؎ یہاں ایک پرائیویٹ بات لکھی تھی، ہم نے اسے حذف کر دیا ہے۔

نکل کر مقالہ بن جائیں گی، ورنہ جی چاہتا تھا کہ اس کو اور پھیلا کر بیان کیا جاتا۔

بہرحال پروفیسر مسعود حسین خاں صاحب نے جو سوال اٹھایا تھا اُس کا جواب یہ ہے کہ یہ حالات پر موقوف ہے، حضرت مجدد سے ہم کو یہ روشنی ملتی ہے کہ اگر کسی ملک میں پھر وہی حالات پیدا ہو جائیں جو اُن کے زمانہ میں پیدا ہوئے تھے تو اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں ان کی اصلاح کے لئے مسلمانوں کو عزم و حوصلہ کے ساتھ وہی کرنا چاہیے جو حضرت مجدد نے کیا تھا اور اسلام کی تعلیم کا تقاضا بھی یہی ہے۔ اس پر ہم کو نہ شرمانے کی ضرورت ہے اور نہ جھجک اور خوف کی، اس سلسلہ میں ایک واقعہ سن لیجیے جو شاید آپ کے لئے دلچسپی کا اور مذکورہ بالا نقطۂ نظر کی مزید وضاحت کا سبب ہو، میرے قیام کلکتہ کے زمانہ میں وہاں ایک مرتبہ انسداد گاؤکشی کے لئے ایجی ٹیشن شروع ہوا۔ روزانہ شام کو جلوس نکلتے تھے اور عجیب بات یہ ہے کہ اس جلوس میں بعض مسلمان بھی شریک ہوتے تھے، کیونکہ مارواڑی اس تحریک کی پشت پناہی کر رہے تھے اور وہ جلوس میں ہر شریک ہونے والے کو پانچ روپیہ فی جلوس دیتے تھے، اس تحریک کے زمانہ میں ایک دن مجکو شری سین نے بلایا جو چیف منسٹر کے ڈپٹی تھے اور پوچھا کہ اسلام میں گاؤکشی کا کیا حکم ہے؟ میں نے کہا: اسلام میں یہ مباح ہے، نہ واجب اور نہ ممنوع۔ اگر مسلمان خود کسی مصلحت سے اسے ترک کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں، لیکن اگر کوئی گروہ مسلمانوں سے پوچھے بغیر اس حکم کو مسلمانوں پر زبردستی نافذ کرے اور خصوصاً مسلمانوں کے ساتھ دشمنی کے جذبہ سے تو اب مسلمانوں کے لئے اس کا حکم دوسرا ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ اگر مسلمانوں کے لئے ممکن ہے تو انھیں اس کی مقاومت کرنی چاہیئے، ورنہ جبر تو بہرحال ہوگا ہی! شری سین نہایت معقول اور کھلے دماغ کے انسان تھے، انھوں نے میرا شکریہ ادا کیا اور میری بات کی معقولیت کو تسلیم کیا، چنانچہ ایجی ٹیشن چلتا رہا، مگر گورنمنٹ ٹس سے مس نہ ہوئی اور آج بھی وہاں گاؤکشی ممنوع نہیں ہے۔

عہد نبوی کے غزوات وسرایا
اور
ان کے ماخذ پر ایک نظر

(۸)

سعید احمد اکبر آبادی

روایات میں اضطراب اور ناہمواری کے اسباب

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اصل حقیقت یہی ہے جو بیان کی گئی تو پھر آخر اس کے وجوہ واسباب کیا ہیں کہ تمام مورخین وارباب مغازی وسیر یہ لکھ رہے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خروج عن المدینہ کاروانِ ابوسفیان سے تعرض کرنے کے ارادہ سے تھا۔ اگرچہ روایات کی اس نوعیت پر گفتگو کا اصل موقع وہ ہوگا جب ہم ماخذ پر کلام کریں گے، تاہم موقع اور محل کی مناسبت سے مختصراً یہاں بھی چند معروضات پیش کر دینا بے محل نہیں ہوگا۔ اس سلسلہ میں امور ذیل پر غور کرنا چاہئے۔

(۱) احادیث جن کا مرتبہ بہرحال مغازی وسیر کی روایات سے باعتبار استناد وثقاہت بہت اونچا اور بلند ہے۔ جہاں تک ان کا تعلق ہے، مولانا شبلی نے تو یہ دعویٰ کیا ہے کہ "حضرت کعب بن مالک والی حدیث کے سوا اور کسی حدیث میں یہ واقعہ میری نظر سے نہیں گذرا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بدر میں قریش کے قافلۂ تجارت کے لوٹنے کے لئے نکلے تھے" (سیرت النبی ج ۱ ص ۳۵۰) ہم یہ دعویٰ تو نہیں کرسکتے کیونکہ اس وقت حدیث کی سب کتابیں (جن میں

سیرت نبوی کے ماخذوں پر بڑی دلچسپی اور شوق سے پڑھ رہا ہوں، مہینوں سے داد دیے
لئے تڑپ رہا ہوں، جزاک اللہ و ماشاء اللہ، بشرط زندگی کانووکیشن میں آؤں گا،
ان شاء اللہ، سفریات کی گاڑی سے نہیں کر سکتا، والسلام

دعاگو دعاخواہ

عبدالماجد

سلسلہ میں واقعہ کے جن اجزا کی حیثیت درحقیقت ایک گپ یا افواہ کی ہوتی ہے کثرت نقل و روایت کے باعث وہ بھی سب کے نزدیک نہیں تو ایک فریق متعلق کے نزدیک یقیناً ایک تاریخی حقیقت ہوتے ہیں اور یہ لوگ اسے اسی طرح نقل کرتے ہیں، یہ سب کچھ نفسیاتی عوامل کی کرشمہ سازی کا نتیجہ ہوتا ہے۔

(۴) ان نفسیاتی عوامل میں سب سے زیادہ موثر چیز وہ ہوتی ہے جسے نفسیات کی اصطلاح میں انگریزی میں obsession of mind کہتے ہیں یا وہ چیز ہوتی ہے جسے Auto suggestion کہتے ہیں، اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ مثلاً کسی واقعہ کے سلسلہ میں اس کے وقوع سے قبل کسی وجہ سے کوئی ایک خیال آپ کے ذہن میں پہلے سے موجود ہوتا ہے، اب اس کے بعد واقعہ ظہور پذیر ہوتا ہے تو آپ اس کی روایت کرتے ہیں یا اُس سے کوئی اثر لیتے ہیں تو یہ دونوں آپ کے اسی خیال کے مطابق ہوتے ہیں جو آپ نے پہلے سے ہی دماغ میں قائم کر رکھا تھا۔ اگرچہ واقعہ کی اصل حقیقت اس سے جدا تھی مثلاً ابھی حال کا واقعہ ہے، جیساکہ برہان میں اس کا ذکر آچکا ہے، مجھے ۲ر فروری کو گوہاٹی کی ایک تقریب میں شامل ہونا تھا، اس سلسلہ میں ایک روز جناب محمد مسلم صاحب اڈیٹر روزنامۂ دعوت دہلی نے فون پر مجھ سے کہا کہ آپ کے سفر گوہاٹی کے موقع پر آسام کی جماعت اسلامی آپ کو استقبالیہ دینا چاہتی ہے، ازراہ کرم اسے منظور کرلیجئے، میں نے پوچھا کب؟ انھوں نے تو غالباً ۳ر فروری ہی کہا ہوگا، مگر میں نے ۴ر فروری سنا۔ اب لطف کی بات یہ ہے کہ اس گفتگو کے چند روز کے بعد آسام کی جماعت اسلامی کا بھی باقاعدہ دعوت نامہ آگیا اور اس میں صاف طور پر ۳ر فروری کی تاریخ لکھی تھی، لیکن چونکہ میرے دماغ پر ۴ر فروری کی تاریخ مسلط تھی اس لئے میں نے ۳ر کو ۴ر ہی پڑھا اور اسی تاثر کے ساتھ گوہاٹی گیا۔ وہاں جب معلوم ہوا کہ استقبالیہ ۴ر کو نہیں ۳ر کو ہے تو میں نے پوچھا کیا آپ نے تاریخ بدل دی ہے؟ ان حضرات نے فرمایا: جی نہیں! یہ تاریخ وہی ہے جس کا ذکر مسلم صاحب نے فون

سے بعض حال کی مطبوعہ ہیں، مثلاً مصنف عبدالرزاق) ہمارے پاس موجود نہیں ہیں اور نہ ہم نے ان کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے، البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ صحیحین یعنی بخاری اور مسلم شریف میں حضرت کعب بن مالک والی روایت جو صحیح بخاری میں غزوۂ بدر اور غزوۂ تبوک کے ذکر میں دو جگہ منقول ہے اس کے علاوہ کوئی اور روایت اس مضمون کی صحیحین میں یا بعض اور احادیث کی متداول کتابوں میں ہماری نظر سے نہیں گذری، اور حضرت کعب بن مالک کی روایت کا بھی مطلب کیا ہے؟ اسے ہم پہلے بیان کر آئے ہیں۔

(۲) یہ معلوم ہے کہ محدثین نے مغازی کے ساتھ زیادہ اعتنا نہیں کیا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں امام احمد بن حنبل کا قول مشہور ہی ہے کہ وہ ان کو ساقط الاعتبار قرار دیتے تھے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مغازی کے سلسلے میں جہاں کہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول یا عمل کسی نے اگر بیان کیا ہے تو اس کی حیثیت چونکہ حدیث کی ہو جاتی تھی اس لئے محدثین نے اپنے اصول نقد و جرح پر اس کی جانچ پڑتال کر کے اسے قبول کیا یا رد کر دیا۔ اس کے علاوہ جو اور واقعات ہوتے تھے اسے لوگ اپنے مشاہدہ یا سمع کی بنا پر نقل کرتے تھے، اور چونکہ اس زمانہ واقعات کو عین موقع پر یا اس کے فوراً بعد قلمبند کرنے کا رواج نہیں تھا اس بنا پر ان واقعات کی حیثیت سنی سنائی اور بعض کے لئے دیکھی دکھائی باتوں کی ہوتی تھی،

(۳) جب کبھی کوئی اہم واقعہ پیش آتا ہے جس میں اشخاص و افراد کی بڑی تعداد شریک ہوتی ہے تو وہ خود یا دوسرے حضرات جب اس واقعہ کو بیان کرتے ہیں تو اس میں چند نفسیاتی عوامل ہوتے ہیں جو غیر شعوری طور پر اس میں کام کرتے ہیں۔ اور یہ نفسیاتی عوامل اس درجہ قوی ہوتے ہیں کہ اگر ان کے زیر اثر کچھ لوگ خلاف واقعہ بھی کوئی بات نقل کر دیتے ہیں تو رفتہ رفتہ یہی بات تاریخ بن جاتی ہے، اور لوگ اسے ایک تاریخی واقعہ کی حیثیت سے نقل کرنا شروع کر دیتے ہیں چنانچہ ہمارے ملک میں بدقسمتی سے آئے دن فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہتے ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ اصل واقعہ کیا ہوتا ہے اور فریقین کے لوگ اسے کس کس رنگ میں بیان کرتے ہیں، اس

سایہ نظر آیا، آپ نے پوچھا "کون ہیں" معلوم ہوا کہ اسماء بنت عمیس ہیں جو حضرت فاطمہ کی دلجوئی کے خیال سے ساتھ چلی آئی تھیں، حضور اس سے بہت مسرور ہوئے اور اُن کو دعائیں دیں، اس روایت میں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ راوی نے ان خاتون کا نام اسماء بتایا ہے، لیکن جیسا کہ حافظ ابن حجر نے المطالب العالیہ میں لکھا ہے حضرت اسماء ان دنوں میں مدینہ میں سرے سے موجود ہی نہ تھیں اور اپنے شوہر کے ساتھ حبشہ میں مقیم تھیں، راوی کو دراصل مغالطہ اس سے ہوا کہ عمیس کی دو صاحبزادیاں تھیں ایک جو بڑی تھیں اُن کا نام اسماء تھا اور چھوٹی صاحبزادی کا نام سلمیٰ تھا۔ لیکن چونکہ زیادہ مشہور بڑی بہن ہیں اور زیادہ تر روایات میں نام انھیں کا آتا ہے اس بنا پر راوی نے جب یہ سنا کہ عمیس کی صاحبزادی وہاں موجود تھیں تو لاشعوری طور پر اس کا ذہن حضرت اسماء کی طرف منتقل ہوگیا اور اپنی طرف سے روایت میں اس کا اضافہ کرکے اسے آگے بڑھا دیا یا اصل مروی عنہ نے نام حضرت سلمیٰ کا ہی لیا ہوگا لیکن راوی کے دماغ میں حضرت اسماء کا نام ایسا رچا بسا تھا کہ جب اس نے روایت کی تو اس کی زبان سے بے ساختہ بجائے سلمیٰ بنت عمیس کے اسماء کا نام نکل گیا۔

یہ جو کچھ عرض کیا گیا اس سے معلوم ہوا ہوگا کہ کسی واقعہ کو آنکھ بند کرکے محض اس لئے قبول کر لینا کہ کسی نے اس کو بیان کیا ہے یا وہ کسی کتاب میں لکھا ہوا ہے شیوۂ مردانگی اور طریقۂ علم و تحقیق نہیں، بلکہ اس کو قبول کرنے سے پہلے یہ معلوم کر لینا چاہیئے کہ واقعہ کب پیش آیا، کہاں پیش آیا کس کس نے اُسے دیکھا، یہ دیکھنے والے کس مشرب اور خیال کے لوگ تھے، ان کی عقل اور ان کی قوتِ اظہار مافی الضمیر کا کیا حال ہے، جس شخص کی نسبت وہ واقعہ اور جس زمان و مکان اور جس ماحول میں اس کا وقوع بیان کیا جاتا ہے وہ عقلاً، عرفاً یا عادۃً ممکن بھی ہے یا نہیں اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس باب میں محتاط رہنے کی تاکید کی اور فرمایا ہے:

وکفیٰ بالمرءِ کذباً ان یحدث بکل ماسمع — ایک شخص کے جھوٹا ہونے کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ جو کچھ سنے نقل کر دے۔

پرکیا تھا اور دعوت نامہ میں بھی یہی تاریخ درج تھی، گھر واپس آکر میں نے یہ دعوت نامہ دوبارہ پڑھا تو اُس میں بجائے ۴ر کے ۳ر فروری کی ہی تاریخ لکھی تھی۔

Auto Suggestion کی ایک دلچسپ مثال سنئے! قیام کلکتہ کے زمانہ میں ایک مرتبہ وطن آیا ہوا تھا، جب واپس پہونچا تو کلکتہ کے مشہور روز نامۂ امروز کا ایک پرانا پرچہ میری میز پر رکھا ہوا تھا۔ میں اسے اٹھا کر پڑھنے لگا تو یہ دیکھکر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اُس میں سیرت النبی کے ایک مقامی جلسہ کی روئداد چھپی تھی اور اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ آخر میں سعید احمد اکبر آبادی پرنسپل کلکتہ مدرسہ کی تقریر ہوئی اور انھوں نے یہ کہا وہ کہا اور خوب کہا۔ چند روز کے بعد امروز کے اڈیٹر سے ملاقات ہوئی تو میں نے کہا: بھئی! آپ بھی کمال کرتے ہیں اس دن میں سرے سے کلکتہ میں موجود ہی نہیں تھا اور اس کے باوجود آپ نے یہ چھاپ دیا کہ میں نے اس روز کے جلسہ میں تقریر کی ہے۔ یہ سن کر موصوف نے حسب عادت ایک زور کا قہقہہ لگایا اور بولے: اصل بات یہ ہے کہ اُس جلسہ میں نہ میں گیا اور نہ اخبار کا کوئی اور رپورٹر گیا۔ لیکن خبر دینا ضروری تھا اور جلسہ کے اشتہار میں آپ کا نام دیا ہوا تھا اور پھر مجھے یہ معلوم تھا کہ (۱) آپ ہمیشہ آخر میں تقریر کرتے ہیں (۲) تقریر اچھی کرتے ہیں اور (۳) یہ بھی معلوم تھا کہ سیرت کی تقریروں میں آپ کیا کہتے ہیں! ان مفروضات کی بنا پر آپ کے متعلق میں نے وہ خبر تصنیف کرلی اور اخبار میں دے دی۔

(۵) یہ نفسیاتی عوامل ہر انسان میں غیر شعوری یا نیم شعوری طور پر کام کرتے ہیں، کسی راوی کا ثقہ اور معتبر ہونا اُن کے منافی نہیں ہے، احادیث کی روایات میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں، چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ جب حضرت فاطمہ کا نکاح حضرت علی سے ہوگیا اور رخصتی کے بعد حضرت علی ان کو لیکر کاشانۂ نبوت سے روانہ ہونے لگے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی سے فرمایا: "تم ذرا میرا انتظار کرنا" تھوڑی دیر کے بعد آپ پہونچ گئے، دولھا اور دلہن دونوں کو برکت دی اور تلقین خیر سے نوازا۔ اسی اثنا میں آپ کو گھر میں ایک انسانی

"بدر ایک بیضوی شکل کا میدان ہے، کوئی ۱/۲ ۵ میل لمبا اور تقریباً چار میل چوڑا، اطراف میں بلند پہاڑ ہیں، مکہ، شام اور مدینہ جانے کے راستے جو وادیوں میں سے گذرتے ہیں یہیں ملتے ہیں، ترکی دور میں شریف عبدالمطلب نے اس میدان میں ایک مضبوط قلعہ تعمیر کیا تھا، اب وہ ٹوٹ پھوٹ گیا ہے، یہ میدان سنگلاخ یا ریتیلا ہے، مگر جنوب مغربی حصہ کی زمین نرم ہے، جنگ بدر کے دن بارش ہوئی تو یہ مقام جہاں قریش کا پڑاؤ تھا دلدل بن گیا تھا۔ مگر اب یہاں سرسبز نخلستان ہے، بدر کے اطراف میں جو پہاڑ ہیں ان کے مختلف حصوں کے مختلف نام ہیں، ان میں دور دور تک سفید ریت کے تودے نظر آتے ہیں، آج بھی ان سفید پہاڑیوں میں سے ایک کا نام العدوة الدنیا اور دوسری کا نام العدوة القصوی ہے، ان دونوں کے درمیان جو بہت اونچا پہاڑ ہے اسے اب جبل اسفل کہتے ہیں، کیونکہ اس کے پیچھے دس بارہ میل پر سمندر ہے اور ابوسفیان کا قافلہ راستہ کترا کر ساحل کے کنارے کنارے نکل گیا تھا۔" (عہد نبوی کے میدان جنگ)

جیسا کہ قرآن مجید میں ہے، لشکر اسلام کا پڑاؤ العدوة الدنیا پر تھا، لیکن جنگی نقطۂ نظر سے یہ مقام موزوں نہیں تھا، اس لئے حضرت حباب بن منذر کے مشورہ کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقام سے آگے بڑھکر اس جگہ پر پڑاؤ ڈالا جو آج کل بدر کی موجودہ آبادی میں مسجد عریش کے ارد گرد ہے[1] یہاں ایک چشمہ تھا[2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

[1] اس مسجد کو عریش کہنے کی وجہ یہی ہے کہ یہ ٹھیک اُس جگہ بنی ہوئی ہے جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک جھونپڑی (عریش) بنائی گئی تھی، یہ ایک پہاڑی پر واقع ہے اور یہاں سے پورا میدان جنگ نظر آتا تھا، اگرچہ اب اس کے ارد گرد نخلستانوں کے باعث وہ نظر نہیں آتا۔ [2] یہ چشمہ اب بھی ہے اور اس کا پانی مسجد عریش اور ایک اور مسجد کے صحن سے گذرتا ہے اور اسی سے وضو کرتے ہیں۔

لیکن افسوس ہے ہمارے راویوں نے ان اصول تنقید اور اس فرمان نبوی کا لحاظ کم رکھا ہے یہاں تک کہ بعض کتب حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نجی زندگی سے متعلق چند ایسی باتیں ملتی ہیں جن کی نسبت ایک شخص قسم کھا کر کہہ سکتا ہے کہ آپ کی طرف اُن کا انتساب ناممکن ہے۔

اب ان اصول کو پیش نظر رکھ کر غور کیجئے تو صاف نظر آتا ہے کہ چونکہ کاروان ابوسفیان کا مدینہ میں بہت دنوں سے چرچا تھا اور وہ دماغوں پر چھایا ہوا تھا اور یہ طے تھا کہ وہ ادھر سے واپسی میں گذرے گا تو اس سے تعرض کیا جائے گا، اس فضا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لشکر قریش کے مکہ سے روانگی کی اطلاع ملتی ہے تو (حدیث کعب بن مالک کے مطابق) اس معاملہ میں حسب عادت توریہ سے کام لیتے ہیں مگر ساتھ ہی صحابۂ کرام سے مشورہ اور ان سے گفتگو کے بعد آپ ادبدا کے روانگی کا حکم دے دیتے ہیں، اس بنا پر عموماً obsession of mind کے باعث اندرونی اور بیرونی طور پر محسوس یہی ہوتا تھا کہ مدینہ سے روانگی کا مقصد کاروان ابوسفیان کو جا لینا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو چیزیں ایک لشکر کا مظہر اور علامت ہو سکتی تھیں وہ بھی اسی عام احساس اور مفروضہ کے قالب میں ڈھلتی چلی گئیں فلا عجب ولا غرابۃ فیہا خاص اس ایک مسئلہ پر گفتگو ذرا طویل ہو گئی، لیکن حکایت لذیذ ہوتی ہے تو اس کا بیان دراز تر ہو جاتا ہے، اسی طرح درد دل کو سنانے کا موقع مل جاتا ہے تو کہانی خود بخود پھیلتی جاتی ہے

بدر کا نقشہ

اب جب کہ جنگ شروع ہونے والی ہے آپ بدر کا نقشہ ذہن میں محفوظ کر لیجئے، اس سلسلہ میں قدیم وجدید مورخین نے بہت کچھ لکھا ہے، لیکن ہمارے نزدیک سب سے زیادہ قابل اعتماد ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا بیان ہے جنھوں نے خود وہاں جا کر تاریخ وجغرافیہ کی کتابوں کی روشنی میں اس پورے علاقہ کی پیمائش (Survey) کیا اور غزوہ کے سلسلہ کے ایک ایک جزئی واقعہ کا محل وقوع متعین کیا، کتاب کا یہ پورا باب بیحد دلچسپ اور بصیرت افروز ہے، ہم یہاں موقع کی مناسبت سے اس کا صرف ایک ٹکڑا نقل کرتے ہیں، موصوف لکھتے ہیں:

باقی رہ جاتا ہے، اب جو تمھاری رائے ہو۔

قریش میں اختلاف رائے

عمیر بن وہب الجمحی کی اس تقریر کے بعد قریش میں پھوٹ پڑ گئی، عتبہ بن ربیعہ اور حکیم بن حزام دونوں جنگ کے مخالف ہو گئے، اول الذکر نہایت باا ثر شخص تھا۔ وہ کھڑا ہوا اور مجمع کو خطاب کر کے بولا: "لوگو! تم کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اُن کے ساتھیوں کے ساتھ جنگ کر کے کیا ملے گا؟ اگر تم کو فتح ہو بھی گئی تو کس کام کی؟ ہم میں سے ہر شخص دیکھے گا کہ اُس کا قریبی عزیز اُس کے ہاتھ سے قتل ہوا ہے؛ اور اگر کامیابی اُن لوگوں کو حاصل ہوئی تب بھی یہی ہوگا! اس لئے بہتر یہ ہے کہ لوٹ چلو اور محمد اور باقی عرب کے درمیان حائل نہ ہو۔" ابوجہل نے یہ سنا تو حسب عادت سخت برہم ہوا۔ عمرو بن الحضرمی (جو سریۂ عبداللہ بن جحش کے ہاتھوں قتل ہوا تھا) کے بھائی عامر بن الحضرمی کو ورغلا کر بولا: دیکھتے ہو! ٹھیک اس وقت جب کہ تمھارے بھائی کے خون کا بدلہ آنکھوں کے سامنے ہے تمھارا حلیف عتبہ لوٹ جانا چاہتا ہے، اٹھو! اور اپنے بھائی کا قصاص طلب کرو، عامر نے جب یہ سنا تو عرب کے قاعدہ کے مطابق کپڑے پھاڑ کر ہائے عمر ہائے عمر چیخنا شروع کر دیا۔ مجمع میں اس سے آگ لگ گئی اور لڑائی کا جوش و خروش از سر نو پیدا ہو گیا، ابوجہل نے عتبہ کو بھی بزدلی اور پست ہمتی کا طعنہ دیا تھا۔ عتبہ اس پر بگڑ گیا اور بولا کہ اچھا! اگر یہی ہے تو میدان جنگ گرم ہونے دو پھر سب کو معلوم ہو جائے گا کہ بزدل اور نامرد کون ہے؟ تم یا میں! یہ کہکر اٹھا۔ سر سے کپڑا لپیٹا اور ہتیار سج سجا جنگ کے لئے تیار ہو گیا۔

ابوجہل اور اخنس کی گفتگو

اس موقع پر بعض مورخین نے یہ واقعہ بھی لکھا کہ اخنس بن شریق جو اپنے قبیلہ بنو زہرہ کے لوگوں کے ساتھ لشکر سے الگ ہو کر درمیان راہ سے واپس ہو گیا تھا۔ اس موقع پر پھر ابوجہل سے ملا اور اس سے کہا: "ابو الحکم! (ابوجہل کی اصل کنیت) کیا تم سمجھتے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جھوٹ بولتے ہیں!" ابوجہل نے جواب دیا: یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ کے بارہ میں کذب بیانی کریں، جب کہ ہم نے ان کا نام امین رکھ چھوڑا تھا

اس چشمہ پر قبضہ کر لیا اور حکم دیا کہ ایک بڑا حوض بنا کر اس چشمہ کا پانی جمع کر لیا جائے تاکہ مویشیوں کے کام آئے اور ایک لشکر کی ضرورتیں اس سے پوری ہوں، صحابہ کرام نے اس میدان میں ایک بلند مقام پر آپ کے لئے ایک جھونپڑی بھی بنائی جسے عربی میں عریش یا عرلشیہ کہتے ہیں، پھر اس کی حفاظت کے لئے ایک دستہ جو انصار کے چند نوجوانوں پر مشتمل تھا قیام گاہ نبوی کے لئے مقرر ہوا حضرت سعد بن معاذ اس دستہ کے امیر تھے، علاوہ ازیں حضرت ابوبکر صدیق آپ کی معیت میں تھے اور ساتھ ہی ایک سانڈنی متعین کر دی گئی تاکہ حضور کو کہیں جانا ہو یا مدینہ کوئی خبر پہونچانی ہو تو اس سے کوئی کام لیا جائے، اسی سلسلہ میں حضور نے گھوم پھر کر پورے میدان کا جائزہ لیا اور فرماتے رہے کہ اس جگہ قریش کا فلاں سردار اور اُس جگہ فلاں سردار مارا جائے گا۔ (صحیح بخاری غزوۂ بدر)

قریش کی حرکت

اب لشکر قریش نے بھی حرکت کی اور اُس نے العدوة القصوی سے روانہ ہو کر لشکر اسلام کے سامنے اپنی پوزیشن سنبھال لی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں فخر اور گھمنڈ کے ساتھ اتراتے ہوئے آتے دیکھا تو دعا کے لئے دست مبارک اٹھائے اور کمال عجز و نیازمندی کی ایک ادائے والہانہ کے ساتھ فتح و کامرانی کی دعا کی اور پھر صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا: فتح نہ کثرتِ تعداد پر موقوف ہے اور نہ ساز و سامان کی بہتات پر! فتح کا دار و مدار صبر و استقامت پر ہے، اس کے بعد آپ نے صحابہ کو صبر و استقامت کی تلقین فرمائی۔ اِدھر یہ ہو رہا تھا اور اُدھر قریش نے ایک شخص عمیر بن وہب الجمعی کو بھیجا کہ وہ اسلامی لشکر کا ایک جائزہ لے کر آئے، اس نے گھوڑے پر سوار ہو کر ایک چکر لگایا اور بتایا کہ ان کی تعداد تو تین سو کے لگ بھگ ہے، لیکن اے قریش! میں نے تمہارے مقابلہ میں ایک ایسی قوم دیکھی ہے جن کے پاس تلواروں کے سوا کچھ نہیں ہے، لیکن اُن کے عزم کا یہ عالم ہے کہ جب تک تم میں سے ایک شخص کو اُن کا ایک شخص ختم نہیں کر دے گا وہ نہیں مرے گا۔ تو اب بتاؤ! اس کے بعد زندگی کا کیا لطف

کی مرہم پٹی کریں[1]۔

ہدایات

صف بندی ہو چکی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند ہدایات دیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمان صف بندی کو نہ توڑیں، لڑائی کا اُس وقت تک آغاز نہ کریں جب تک دشمن پہل نہ کرے، دشمن دور ہو تو تیر چلا کر اسے ضائع نہ کریں، ہاں البتہ دشمن آکر گھیرے تو تیروں سے اس کا مقابلہ کریں، نزدیک آجائے تو پتھر ماریں اور بالکل آمنا سامنا ہو تو نیزے چلائیں[2]۔

صحابہ کا جذبۂ فداکاری وشوقِ شہادت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ہدایات کے ساتھ ایک پرزور و ولولہ انگیز خطبہ بھی ارشاد فرمایا جس میں آپ نے صحابۂ کرام کو جہاد کی اہمیت و فضیلت یاد دلائی اور فرمایا: "قسم ہے اُس ذات اقدس کی جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے، آج جو شخص صبر و استقامت کے ساتھ محض حسبۃً للہ آگے بڑھ کر جنگ کرے گا اور پشت نہیں دکھائے گا جنت بے شبہ اس کا مقدر ہو گی۔" عمیر بن الحمام جو انصاری تھے اس وقت صف میں کھڑے تھے اور ان کے ہاتھ میں کچھ کھجوریں تھیں جن کے کھانے کا وہ ارادہ کر ہی رہے تھے کہ اب حضور کا یہ ارشاد سنا تو کھجوریں پھینکدیں، تلوار اٹھائی اور صف سے نکل دشمن کی صفوں میں درانہ گھستے چلے گئے، اور شہید ہو گئے، کہتے ہیں غزوۂ بدر میں سب سے پہلے جس نے جام شہادت نوش کیا وہ یہی تھے، بعض حضرات حضرت عمرؓ کے غلام حضرت مہجع کو اس معرکہ کا پہلا شہید بتاتے ہیں۔

دیوانگی عشق

اسی موقع پر ایک عجیب واقعہ یہ پیش آیا کہ جب حضورؐ گھوم پھر کر لشکر کی صف بندی کر رہے تھے آپ نے ایک شخص سواد بن غزیہ کو صف سے باہر دیکھا تو اپنی چھڑی اُس کے پیٹ میں چبھوتے ہوئے فرمایا: "سواد! سیدھے کھڑے ہو"۔ سواد نے حکم کی تعمیل تو کی مگر ساتھ ہی احتجاج کے لہجہ میں بولے: "یارسول اللہ! اللہ نے آپ کو حق اور عدل کے

---

[1] صحیح بخاری [2] واقدی بحوالۂ ڈاکٹر محمد حمید اللہ۔

کیونکہ انھوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا ۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ بنو عبد مناف میں سقایت، رفادہ حجابت اور مشورہ (خانۂ کعبہ اور مکہ سے متعلق اہم اور معزز عہدے) تو پہلے ہی سے موجود تھے، اب اگر نبوت بھی ان میں چلی گئی تو پھر ہمارے لئے کیا رہے گا ؟

لشکر اسلام کی ترتیب، صف بندی اور اس کو ہدایات

اس سے قطع نظر کہ کس نے کس واقعہ کو کہاں لکھا ہے، مندرجہ بالا واقعات کی ترتیب کافی غور و خوض کے بعد ہماری اپنی قائم کی ہوئی ہے، ہمارے نزدیک یہ واقعات روز پنجشنبہ ۱۶ رمضان المبارک ۲ھ کے ہیں، اب درمیان میں صرف ایک شب باقی تھی، اگلا دن معرکۂ کارزار کے گرم ہونے کا تھا۔ جامع ترمذی کی ایک روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فوج کی تقسیم شب میں ہی کرلی تھی، چنانچہ مہاجروں کا علَم حضرت مصعب بن عمیر کو، خزرج کا علَم حضرت حباب بن منذر کو اور اوس کا حضرت سعد بن معاذ[1] کو عطا ہوا، اس طرح فوج تین حصوں میں تقسیم کی گئی، رات کا ایک معتدبہ حصہ آپ نے تسبیح و تہلیل میں بسر کیا ۔ دوسرے دن یعنی بروز جمعہ ۱۷ رمضان کو علی الصباح آپ نے لشکر کی صف بندی کی اس کے بعد ایک چھڑی دست مبارک میں لئے ہوئے ان صفوں کا جائزہ لیا ۔ حکم یہ تھا کہ سب لوگ سرو قامت ایک دوسرے کے ساتھ کاندھے سے کاندھا اور قدم سے قدم ملا کر کھڑے ہوں، کوئی شخص نہ صف سے آگے ہو اور نہ پیچھے ۔

عورتوں کی شرکت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکر اسلام کی خدمت کے لئے رضاکار خواتین کا ایک دستہ بھی مقرر فرمایا تھا۔ اس دستہ کے فرائض یہ تھے کہ سپاہیوں کو پانی پلائیں، دشمن فوج کے جو افراد قتل ہوں یا زخموں کی تاب نہ لاکر گر پڑیں اُن کے ہتھیار، نیزہ یا تلوار وغیرہ جمع کر کے مسلمان تیر اندازوں کے حوالہ کریں اور مسلمان زخمیوں

---

[1] مگر یہ مشتبہ معلوم ہوتا ہے، کیونکہ جیساکہ ابھی گذرا حضرت سعد بن معاذ اُس دستہ کے امیر تھے جو قیام گاہ نبوی کی پہرہ داری کر رہا تھا۔

تھے۔ اس لئے ان کی بے سروسامانی ظاہر ہے، لیکن ان کو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان کامل تھا، حیات مستعار کے عیش و آرام اور دنیا کے مستلذات اور مشتہیات سے انھوں نے صرف نظر کر کے اپنی زندگیاں اعلاء کلمۃ اللہ اور اقامت دین کے لئے وقف کر دی تھیں، یہ حق و صداقت کے داعی ومنادا اور اقدار عالیہ کے علمبردار تھے، یہ انسانیت کی آبرو اور مجد و شرف آدمیت کے لعل شب تاب تھے، دولت ایمان ویقین اور توکل علی اللہ ان کا سب سے بڑا ہتیار اور صاحب ملکوت وجبروت کا وعدۂ فتح ونصرت ان کی خود اعتمادی کا واحد سہارا تھا۔

جب سے انسان عالم وجود میں آیا ہے چشم روزگار نے حق و باطل کے ہزاروں معرکے دیکھے ہیں لیکن یہ معرکہ سب سے نرالا اور انوکھا تھا، کیونکہ تاریخ انسانی میں یہ پہلا موقع تھا جب کہ ایک پیغمبر برحق اور رحمت عالم بن کر آیا تھا وہ "الحق یعلو ولا یُعلیٰ" کی حقیقت کو ثبت کرنے اور اس بات کا سبق دینے کہ کوئی تحریک، خواہ کیسی ہی اعلیٰ اقدار حیات پر مبنی ہو، فطرت انسانی کے پیش نظر، جنگ کے بغیر عظیم، عالمگیر اور موثر انقلاب پیدا نہیں کر سکتی، خود شمشیر بکف میدان جنگ میں آگیا اور اپنے بے سروسامان ساتھیوں کی ایک جماعت کو ایک طاقتور اور صاحب جاہ وحشم فوج کے مقابلہ میں کھڑا کر دیا تھا۔ اس لئے طبل جنگ پر تھاپ پڑنے کا وقت آیا تو کائنات عالم کا ذرہ ذرہ دم بخود ہو گیا۔ وقت کے مورخ نے قلم سنبھالا۔ پردہ نشینان حریم قدس کی ٹکٹکی بندھ گئی، سیارگان فلک نے اپنی آنکھیں بدر کے میدان پر گاڑ دیں، نبض دوراں رک گئی، گردش لیل ونہار ٹھٹک کر رہ گئی، یہ سب کچھ تھا مگر حسن ازل تبسم زیر لب تھا اور غیب سے آواز آرہی تھی:

حدیث حسن ومشتاقی درون پردہ پنہاں بود
برآمد شوق از خلوت نہاد ایں راز بر صحرا

(نظیری)

ساتھ مبعوث فرمایا ہے، اور آپ نے مجکو تکلیف پہونچائی ہے، اس لئے میں آپ سے بدلہ لینا چاہتا ہوں" حضورؐ نے فرمایا: اچھا! اس کے بعد فوراً کرتہ اٹھایا اور ارشاد کیا: لو تم مجھ سے اپنا بدلہ لے لو اب سواد نے شکم مبارک کے پے در پے بوسے لئے اور الگ ہو گئے۔ حضور نے پوچھا: یہ کیا؟ سواد نے جواب دیا: "حضور! آپ دیکھ رہے ہیں کہ جنگ سر پہ تلی کھڑی ہے معلوم نہیں میرا کیا انجام ہو! اس لئے میری تمنا ہوئی کہ اگر میں جنگ میں کام آجاؤں تو زندگی میں آپ سے میرا آخری سابقہ یہ ہو کہ میری جلد آپ کی جلد سے شرف اندوز و شادکام ہم آغوشی ہو" اللہ اکبر! یہ کمال عشق و محبت! ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سنا تو دعائیں دیں۔ اپنا ایک بہت پرانا شعر یاد آیا:

سر کٹ کے گرے ان کے قدم پر دمِ آخر
یوں حسرتِ پابوس نکل جائے تو اچھا!!

دو فریق متحارب

اس وقت دو لشکر ایک دوسرے کے ساتھ صف بستہ کھڑے تھے، ایک وہ تھا جس کو اپنی طاقت و قوت، مال و متاع پر گھمنڈ تھا، جس نے باطل پرستی کے زعم میں کلمۂ حق سننے سے انکار کر دیا تھا جو خاندانی وقار (Prestige) اور قبائلی عظمت کی حفاظت کے لئے سربکف میدان جنگ میں آیا تھا۔ جو اللہ رب السمٰوٰتِ والارض کے بجائے لات و ہبل کا پرستار تھا اور جس نے سچائی، عدل و انصاف اور انسانیت کے اقدارِ عالیہ سے بغاوت کر کے اباطیل و اکاذیب، اوہام و خرافات اور رذائل اخلاق و اعمال کے ساتھ پیمان وعہد وفا استوار کر رکھا تھا۔ اس کے مقابلہ میں ایک دوسرا لشکر کھڑا تھا جسے جنگی اصطلاح میں نہتّا کہنا چاہیئے، اس کے پاس لے دے کے دو گھوڑے تھے اور وہ بھی بغیر زین کے، تلواریں تھیں تو نیام سے محروم، نیزے تھے مگر ڈھال نہ تھی، تیر و کمان تھے مگر خود و مغفر نہ تھے، علم تھے بوق و طبل کا نام و نشان نہ تھا۔ پھر لشکر میں ایک خاصی تعداد اُن لوگوں کی تھی جو ابھی دو برس پہلے لٹ کھسٹ اور اپنے وطن سے اُجڑ کر اِدھر آئے تھے اور باقی جو تھے وہ زراعت پیشہ

تک کہ درس نظامی کے مرتب ملا نظام الدینؒ (م۔ ۱۱۶۱ھ) بھی اسی خاک سے تعلق رکھتے تھے۔ اب
اخیر دور میں علامہ ابوالحسنات محمد عبدالحی صاحب فرنگی محلیؒ (م ۱۳۰۴ھ) کی ذات گرامی ایسی پیدا ہوئی
جس نے اپنی علمی و دینی خدمات سے عوام و خواص اور بالخصوص اپنے شاگردوں میں ایک نئی روح
پھونک دی، علامہ موصوف نے دینی بیداری پیدا کرنے کے لئے انتھک محنت و کاوش کی، درجنوں
کتابیں، رسالے اور حواشی تحریر فرمائے اور یہ یقین کامل تھا کہ اگر علامہؒ کی عمر وفا کرتی تو ضرور خواص
اور اہل علم کے علاوہ عوام میں بھی پیغام رشد و ہدایت پہونچتا مگر افسوس! انھوں نے عمر بہت کم
پائی اور کل چالیس سال کی مدت حیات پا کر یہ آفتاب علم و عمل غروب ہو گیا مگر ساتھ ہی ساتھ وہ
اپنے پیچھے بعض ایسے شاگرد چھوڑ گئے جن سے علم دین اور عام مسلمانوں کو بہت فائدہ پہونچا جن میں
سے ایک مخصوص شاگرد اور ان کے صحیح علمی جانشین مولانا عین القضاۃ صاحب حیدر آبادیؒ تھے
جن کے بارے میں ہم اس وقت کچھ لکھیں گے۔ آپ نے لکھنؤ میں مستقل قیام فرما کے وہاں مسندِ
درس و تدریس آراستہ کی اور لوگوں کے دلوں میں علوم دینیہ کی طرف رغبت اور شوق پیدا کیا
خاص طور سے قرآن مجید اور فن تجوید قراءت کی نشر و اشاعت کے لئے ایک ایسی عظیم درسگاہ
قائم کر گئے جس کی بدولت نہ صرف لکھنؤ کے گلی کوچے کلام ربانی سے گونج اٹھے بلکہ ہند و پاک کا
چھوٹا بڑا شہر و قصبہ یہاں کے قراء اور حفاظ کی دلنواز اور روح پرور آوازوں سے معمور ہو گیا۔

پیدائش و ابتدائی حالات مولاناؒ کے آباء و اجداد ابتداءً ریاست بیجاپور میں مقیم تھے پھر حیدر آباد
آ کر سکونت پذیر ہوئے اور آپ وہیں ۱۲۷۵ھ کو چہارشنبہ کے روز
پیدا ہوئے[1] آپ کے والد ماجد سید محمد وزیر بن محمد جعفر الحسنی الحنفیؒ صحیح النسب سادات میں سے
تھے، آپ کا سلسلۂ نسب شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے جا کر ملتا ہے۔ سید محمد وزیرؒ
بڑے متقی اور پرہیزگار انسان تھے اور عملیات میں بڑا تجربہ اور معلومات رکھتے تھے، اس فن

---

[1] مصباح المشائخ، مولفہ حکیم ہادی رضا خاں ماہر ص ۶ مطبوعہ منبع الطب پریس لکھنؤ

مولانا عین القضاۃ حیدر آبادی لکھنویؒ

جناب مولوی عبدالحی صاحب فاروقی ایم اے

لکھنؤ کی سرزمین زبان وادب اور تہذیب وتمدن کا ہمیشہ سے گہوارہ رہی ہے، شاہانِ اودھ کی فیاضانہ سرپرستیوں اور داد ودہش کے نتیجہ میں لیلائے شعر وسخن کے گیسو بہت سنوارے گئے اور چنگ ورباب کی صداؤں میں نا ونوش کی محفلیں خوب خوب آراستہ وپیراستہ کی گئیں۔ عوام تو عوام ہیں خواص کا بھی ایک بڑا طبقہ عیش پسندی اور تن آسانی میں مبتلا تھا، ان حالات کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ معاشرے میں دین سے غفلت اور بے حسی وبے تعلقی کی وبا پوری طرح پھیلی ہوئی تھی، مسجدیں عموماً خالی اور کم آباد رہتی تھیں کہ نمازی نہ تھے اور نماز کا اہتمام نہ تھا، محلہ کے کچھ بوڑھے اور ازکار رفتہ لوگ "عاقبت سنوارنے" کے خیال سے مسجدوں میں آجایا کرتے تھے ورنہ بس۔

یہی حال مدرسوں اور خانقاہوں کا بھی تھا، علمار حق اور خاصانِ خدا ضرور وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے رہے مگر ان کا دائرہ کار تزکیۂ نفس اور اصلاح باطن کی سرگرمیاں ایک مخصوص حلقہ تک ہی محدود رہیں اور عوام تک نہ پہونچ سکیں۔ دینی امور سے غفلت اور لاپرواہی کے جہاں اور بہت سے اسباب ہیں وہاں خاص طور سے اس دور کے سیاسی حالات کا زیادہ دخل تھا، ایک مذہبی مورخ کے لئے اودھ کی تاریخ کا یہ دور کچھ خوش کن نہیں ہے۔

علمار کے طبقہ میں ایک سے ایک صاحبِ علم وفضل اور اپنے فن میں یکتائے روزگار نظر آئے گا، ان میں محدث ومفسر بھی تھے اور صاحبِ تصنیف وتالیف بزرگ بھی تھے، یہاں

مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلیؒ[۱] پر پڑی ۔ لہذا سید صاحب آپ کو لیکر لکھنؤ تشریف لے آئے اور علامہ فرنگی محلیؒ کے حلقہ درس میں داخل کر دیا اس وقت مولانا کی عمر تقریباً پندرہ سال کی تھی ، آپ کے علمی ذوق وشوق اور نیکی و دینداری کو دیکھ کر حضرت علامہؒ بیحد محبت وشفقت فرمانے لگے یہاں تک کہ اپنا آبائی مکان جو کہ فرنگی محل کے پل کے سامنے تھا آپ کو رہنے کے لئے دیدیا[۲] ۔ چند کتب درسیہ حضرت علامہ فرنگی محلیؒ کے بعض منتہی طلباء سے بھی پڑھیں جن میں شاہ محمد حسین الہ آبادیؒ (م ۱۳۲۲ھ) کا نام قابل ذکر ہے[۳] ۔ عربی اور فارسی ادب کی بعض کتابیں شمس العلماً

مولانا عبدالحی بن مولانا عبدالحلیم فرنگی محلیؒ ۱۲۶۴ھ کو باندہ میں پیدا ہوئے جملہ کتب درسیہ اپنے والد ماجد ہی سے پڑھیں ، کچھ عرصہ تک والد کے ہمراہ حیدر آباد میں مقیم رہے مگر والد کے انتقال کے بعد مستقل لکھنؤ آکر درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں مصروف ہوگئے ۔ آپ کو شہرت وقبولیت اپنی زندگی ہی میں حاصل ہوگئی تھی ، تصنیفات آپ کی نہایت اہم اور قیمتی ہیں جن کی تعداد ۱۰۹ تک پہونچتی ہے اور بقول بعض ۱۱۰ تک ہے ، اکثر وبیشتر شائع ہوچکی ہیں ۔ ۱۳۰۴ھ کو لکھنؤ میں صرف چالیس سال کی عمر میں وفات پائی اور باغ مولوی انوار صاحبؒ میں مدفون ہوئے ، رحمۃ اللہ علیہ (تذکرہ علماء فرنگی محل ، مولوی عنایت اللہ فرنگی محلی ص ۱۳۱-۳۲-۳۳)

ماہنامہ النجم لکھنؤ ، مرتبہ مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ ، جمادی الاول ۱۳۴۳ھ

مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادی ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوئے ، مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلیؒ کے مخصوص شاگردوں میں سے تھے ، استاد کے حکم سے لکھنؤ میں کچھ دنوں درس بھی دیا ہے ، صاحب علم وفضل ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب دل بھی تھے ، متعدد تصانیف اور فارسی اشعار کا ذخیرہ چھوڑا ہے ، ۱۳۲۲ھ کو بحالت سماع انتقال فرمایا اور درگاہ خواجہ اجمیریؒ میں مدفون ہوئے تفصیلی حالات کیلئے ملاحظہ فرمائیں "سوانح حیات شاہ محمد حسین الہ آبادی" ، مرتبہ محمد الفاروقی اور نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۲۸-۴۲۵

میں انھیں بڑی شہرت اور قبولیت حاصل تھی، عوام وخواص ہر وقت آپ سے مستفید ہوتے رہتے تھے، میر افضل الدولہ؛ نظام الملک آصف جاہ خامس (م۔ ۱۸۶۹ء) آپ کے بڑے معتقد تھے اور اپنی ولی عہدی کے زمانے میں آپ کے پاس اکثر آیا جایا کرتے تھے، ایک بار حاضر خدمت ہوئے اور دعا کی درخواست کی، سید صاحبؒ نے ان سے فرمایا، جاؤ! فلاں دن اور فلاں وقت تم کو حکومت مل جائے گی چنانچہ اس پیشین گوئی کے مطابق میر صاحب حکمران سلطنت ہو گئے۔ اس کے صلہ میں سید صاحب کو حکومت نظام کی جانب سے ایک پورا موضع بطور معافی کے نذر کیا گیا مگر ان کی خود دار طبیعت نے اسے قبول نہیں کیا۔

ابھی مولاناؒ کی عمر صرف چار سال کی تھی کہ والدہ ماجدہ کا انتقال ہو گیا، اس حادثہ نے والد ماجد کو بہت متاثر کیا اور وہ آپ کو لے کر مکہ معظمہ چلے گئے اور وہاں مسلسل گیارہ سال آپ مقیم رہے[۱]۔

سید صاحب مرحوم کو مولاناؒ سے بیحد محبت تھے اور ان کی جدائی ایک لمحہ کے لئے بھی گوارا نہ تھی وہ خود اپنے ہاتھ سے کھانا پکا کر مولانا کو کھلاتے تھے، آپ نے قرآن کریم کی تعلیم کے لئے ایک چھوٹا سا مکتب بھی قائم کر لیا تھا اور اس کے لئے ایک چھوٹا سا مکان بھی لکھنؤ میں خریدا تھا۔ ۱۹؍صفر ۱۳۳۱ھ کو آپ کا وصال ہو گیا اور اُسی مکان میں مدفون ہوئے[۲]۔

تعلیم وتربیت

مولاناؒ کی ابتدائی تعلیم حیدر آباد میں ہوئی، فارسی کی چند کتابیں قاضی محمد اسماعیل مہری سے پڑھیں[۳] اس کے بعد جب مزید تعلیم حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا تو اس دور کے مختلف علماء وفضلاء کی طرف نظر دوڑائی گئی مگر نگاہِ انتخاب استاذ الاساتذہ علامہ ابوالحسنات

۱؎ مصباح المشائخ، مولفہ حکیم محمد ہادی رضا خاں ماہر ص ۷ مطبوعہ منبع الطب پریس لکھنؤ

۲؎ مصباح المشائخ، مولفہ حکیم محمد ہادی رضا خاں ماہر ص ۸ مطبوعہ منبع الطب پریس لکھنؤ

۳؎ ماہنامہ النجم لکھنؤ، مرتبہ مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ، جمادی الاول ۱۳۴۳ھ

سب سے بڑی دعوت ربیع الاول میں ہوتی جس میں دس بارہ ہزار افراد شریک ہوتے تھے، اس دعوت میں اعلیٰ قسم کا گوشت، منوں چاول اور گھی اور سیروں اصلی زعفران استعمال کی جاتی تھی، اس دسترخوان پر امیر و غریب کا کوئی امتیاز نہ تھا، لکھنؤ کے باورچیوں کا کہنا ہے کہ ہم نے بڑے سے بڑے رئیس اور نواب کے یہاں بھی ایسا کھانا نہیں پکایا اور نہ کہیں دیکھا وسنا ہے۔

ہر سال حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے عرس کے موقع پر لکھنؤ سے ایک قافلہ سرہند روانہ فرماتے تھے، اس قافلہ کے لئے ٹرین کی کئی بوگیاں رزرو کرالی جاتی تھیں، اس قافلہ میں ڈیڑھ سو حفاظِ مدرسہ، پندرہ بیس منتظمین، ایک طبیب مع ضروری سامان ادویہ، باورچی، سقہ، چپراسی اور حجام وغیرہ شامل ہوتے تھے، ان کے علاوہ چالیس علماء و مشائخ مزید ہوتے تھے، لکھنؤ سے جو بھی سرہند جاتا وہ مولانا کا ہی مہمان ہوتا تھا، پورا ایک ماہ یہ قافلہ وہاں ٹھہرتا، سرہند میں بھی ایک بار مولانا کی طرف سے دعوت عام کا اہتمام ہوتا تھا، اس طرح سے اس قافلہ کی آمد اور روانگی کے کل اخراجات مولانا خود ہی برداشت کرتے تھے جو کہ اُس زمانے میں چھ سات ہزار روپیہ سے کم نہ ہوتا تھا۔ عرس میں شرکت کی یہ روش آج بھی قائم ہے مگر اب تعداد چند افراد پر مشتمل ہوتی ہے جن کا بار مدرسہ برداشت کرتا ہے۔

انکساری و خاکساری طبیعت میں بہت تھی، ایک بار حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ (م ۱۳۳۹ھ) مولانا کے پاس تشریف لائے آپ استقبال کے لئے زینہ تک آئے اور خود اپنی نشست گاہ پر بٹھانے کی کوشش کی، حضرت شیخ الہندؒ نے انکار فرمایا، مولانا نے فرمایا یہ فقیر کی کمبلی ہے اس پر تشریف رکھیں، شیخ الہندؒ نے فرمایا "بجائے بزرگاں نشستن خطا است" لیکن مولانا کا اصرار جاری رہا مجبوراً شیخ الہندؒ کو بیٹھنا ہی پڑا۔

طریقِ درس

درس کے اوقات صبح اور شام کو تھے، دو سبق صبح کو بعد نماز فجر اور ایک سبق شام کو بعد مغرب ہوتا تھا، آپ کا حلقہ درس اپنے استاد مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ کے زمانہ ہی سے شروع ہو گیا تھا اور کافی شہرت ہو چکی تھی، سلیقۂ تعلیم اور طریقِ درس ایسا عمدہ اور

مفتی سید محمد عباس شوستری[1] سے بھی پڑھی تھیں جو اپنے عہد میں ادب کے ممتاز افاضل میں شمار کئے جاتے تھے۔ درسیات سے فارغ ہونے کے بعد مولانا مرحوم نے مستقل طور پر لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی اور اپنے والد ماجد کے ہمراہ رہنے لگے۔

روزمرہ کی زندگی

مولانا تمام عمر مجرد رہے اور نکاح نہیں کیا اس کی وجہ بھی خود ہی بیان فرماتے تھے کہ:

"جس عمر میں ضرورت تھی اس عمر میں والد نے نکاح کی طرف
توجہ نہیں کی اور اب اس عمر میں ضرورت باقی نہیں رہی[2]"

آپ اپنے والدین کی تنہا اولاد تھے کوئی بھائی بہن نہ تھا اور نہ کوئی دوسرے رشتہ دار تھے جس کمرہ میں آپ کا قیام رہتا تھا اس میں صرف ٹاٹ کا فرش رہتا تھا، دو کمبل تھے جو اوڑھنے اور بچھانے کے کام آتے تھے، لباس میں کرتہ پائجامہ پنج گوشیہ ٹوپی اور حیدرآبادی رومال تھا، نہایت سادہ غذا استعمال کرتے، عام طور سے شوربا اور پھلکا آپ کو بہت مرغوب تھا۔[3]

مہماں نوازی اور تواضع میں بے مثال تھے، سال میں چار پانچ مرتبہ دعوت کا اہتمام فرماتے

---

[1] مفتی محمد عباس بن علی الموسوی کے اجداد میں جعفر بن ابی طالب ہندوستان آئے اور لکھنؤ میں سکونت پذیر ہوئے، یہیں مفتی صاحب ۱۲۲۴ھ میں پیدا ہوئے آپ کی قابلیت اور درس وتدریس کی بڑی شہرت ہوئی، حکومت اودھ نے "تاج العلماء" اور "افتخار الفضلاء" کے خطابات سے نوازا، پھر شاہی دور ختم ہو جانے کے بعد حکومت برطانیہ نے سب سے پہلے آپ ہی کو "شمس العلماء" کا خطاب عطا کیا۔ ۱۳۰۷ھ میں لکھنؤ میں انتقال ہوا۔

نزہتہ الخواطر ج ۸ ص ۲۰۹

[2] ماہنامہ النجم لکھنؤ، مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی رح، جمادی الاول ۱۳۴۳ھ

[3] قطب دوراں، مولفہ سید اشفاق حسین رضوی ص ۱۳ نامی پریس لکھنؤ

سنا، غلبی تجویز کیا۔[۱]

۱۳۳۲ھ اِس وقت بھی یہ مدرسہ مولانا مرحوم کی ایک جیتی جاگتی یادگار ہے، اس کی وسیع و عریض عمارت لکھنؤ کے وسط شہر میں واقع ہے۔ اس کے متصل ہی مشہور کارخانۂ عطر کی عمارت "حنا بلڈنگ" ہے جہاں سے ہر وقت خوشبویات کی لہریں اٹھا کرتی ہیں، یہاں سے گذرنے والوں کے کان ایک طرف کلام الٰہی کی دلنواز صداؤں سے لذت آشنا ہوتے ہیں تو دوسری طرف عطر حنا اور خس کی بھینی بھینی لہریں مشام جاں کو معطر کرتی رہتی ہیں۔ اس کی صحیح کیفیت کا اندازہ وہی حضرات کر سکتے ہیں جو ایک بار بھی اس مدرسہ میں آ چکے ہوں۔

مولانا کی حیات میں ہر طالب علم کو دونوں وقت کی خوراک اور ضروری اخراجات کے لئے وظیفہ ملتا تھا اور ہر ایک کو سردی و گرمی کے لحاظ سے کپڑے بھی مہیا کئے جاتے تھے۔ جب کوئی بچہ مولانا کے پاس حاضر ہوتا تو آپ اس سے قرأت کی فرمائش کرتے اور سن کر فرماتے:

"ہم کو یہ آوازیں بھلی معلوم ہوتی ہیں اور یہی

بچے ہمارے قوال ہیں[۲]۔"

اب تک ہزاروں کی تعداد میں حفاظ، قراء اور علماء یہاں سے فارغ ہو کر نکل چکے ہیں اور بلا مبالغہ اس برصغیر کے بیشتر حفاظ و قراء کسی نہ کسی حیثیت سے مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ سے نسبت رکھتے ہیں[۳]۔

امداد غیب — مولانا مرحوم بہت فیاض اور مخیر تھے، غربا و مساکین، یتیموں و بیواؤں اور سائلین کے ساتھ بڑی داد و دہش فرماتے۔ نہ جانے کتنے افراد کی تو ماہوار تنخواہیں مقرر تھیں جن کو ان کی وفات تک کوئی نہیں جانتا تھا، پھر ساتھ ہی ساتھ اتنے بڑے مدرسہ کے

۱۔ قطب دوراں؛ سید اشفاق رضوی ص۹ مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ۔
۲۔ مصباح المشائخ، حکیم ہادی رضا خاں ماہر ص۱۵
۳۔ راقم الحروف کو بھی اس مدرسہ سے طالب علمانہ تعلق رہا ہے۔

دلنشیں تھا کہ جو شخص ایک کتاب بھی آپ سے سمجھ کر پڑھ لیتا اس میں ایک قسم کی استعداد پیدا ہو جاتی تھی اور چند ہی اسباق میں مطالعہ دیکھنے کا سلیقہ آجاتا تھا [۱]

بڑے ذوق و شوق سے درس دیا کرتے تھے۔ کتاب کے ہر مقام کو سمجھانے میں لب ولہجہ اور تقریر بالکل علامہ فرنگی محلیؒ کے مشابہ تھی۔ ہر کس و ناکس کو داخل درس ہونے کی اجازت نہ دیتے تھے اگر کوئی طالب علم ناغہ کرتا یا محنت نہ کرتا تو اس کی طرف نظر التفات کم ہو جاتی۔

بیعت و ارشاد آپ کو بیعت کا شرف شیخ موسیٰ جی ترکیسری (۱۲۵۴ھ ــ ۱۳۰۹ھ) سے تھا جو ترکیسر ضلع سورت کے رہنے والے تھے، شیخ موسیٰ جی خلیفہ تھے مولانا نظام الدینؒ (المتوفی ۱۲۸۳ھ) کے اور وہ خلیفہ تھے حضرت شاہ غلام علی صاحب دہلویؒ (المتوفی ۱۲۴۰ھ) کے جو مرزا مظہر جانِ جاناں شہیدؒ کے اجل خلفاء میں سے تھے۔ [۲]

مدرسہ عالیہ فرقانیہ کا قیام اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ مولانا کے والد ماجد نے ایک چھوٹا سا مکتب بچوں کو قرآن مجید پڑھانے کے لئے قائم کیا اسی مکتب کو بعد میں مولانا نے وقت کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے ایک عظیم الشان مدرسہ کی شکل میں تبدیل کر دیا اور اس کا نام "مدرسہ عالیہ فرقانیہ" تجویز فرمایا۔ اس مدرسہ میں ملک کے مشہور حفاظ، قراء اور علماء کو مناسب مشاہرہ پر بلا کر ان کی خدمات حاصل کی گئیں جس میں مولانا عبد الشکور صاحب فاروقی لکھنویؒ، مولانا سید علی زینبی، قاری محمد نظر امروہوی اور استاد القراء قاری عبد المالک صاحب کے نام قابل ذکر ہیں، قرآن مجید کی اعلیٰ اور معیاری تعلیم کا انتظام جب مکمل ہو گیا تو مولاناؒ نے مکمل درس نظامی کے درجات بھی قائم فرمائے اور ایک شاندار دار الحدیث بھی تعمیر فرمایا جس کا تاریخی نام

---

[۱] ماہنامہ النجم لکھنؤ، مولانا عبد الشکور صاحب لکھنویؒ، جمادی الاول ۱۳۴۳ھ

[۲] تفصیلی حالات کے لئے دیکھئے "کرامات موسویہ" مولفہ امام اہل سنت مولانا عبد الشکور صاحب لکھنوی، مطبوعہ عمدۃ المطابع لکھنؤ۔

۱۔ حاشیہ شرح ھدایت الحکمۃ للمیبذی ـــــ ۷۷سہ صفحہ کا یہ رسالہ آپ نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ۱۳۰۲ھ میں عربی میں تصنیف کیا تھا جو بہت مقبول اور مشہور ہوا۔

۲۔ نخبۃ المعارف فی تحریم الاغنیۃ والمعارف ۔ یہ رسالہ بھی عربی زبان میں ہے اس میں غنا کو بہت قوی دلائل و براہین کے ساتھ حرام ثابت کیا گیا ہے ۔ چھپ چکا ہے۔

۳۔ البیان الصائب فی تفسیر علم الغائب ـــــ ۲۴ صفحات پر مشتمل یہ رسالہ بھی عربی میں ہے جس میں مسئلہ غیب پر لاجواب بحث فرمائی ہے اور ہر پہلو سے ثابت کیا ہے کہ علم غیب صرف حق سبحانہ کے ساتھ مخصوص ہے ۔ مطبع مجتبائی سے شائع ہو چکا ہے۔

۴۔ التحقیق المجتبیٰ فی غیب المصطفیٰ ـــــ یہ رسالہ بھی عربی میں ہے اور اس استفتیٰ کے جواب میں ہے جس میں آنحضرتؐ کے متعلق دریافت کیا گیا تھا کہ آپؐ کو عالم الغیب کہنا جائز ہے کہ نہیں ۔ مولانا نے دلائل شرعیہ سے اس کا عدم جواز ثابت کیا ہے ۔ مطبع نامی لکھنؤ سے دوبار شائع ہو چکا ہے۔

۵۔ ازاحۃ الغیب فی مبحث علم الغیب ـــــ ۱۶ صفحات کا یہ رسالہ مسئلہ علم الغیب سے متعلق ہے اور عربی زبان میں ہے ۔ ۱۳۲۶ھ میں جبکہ آپ مکہ معظمہ میں مقیم تھے اس وقت تالیف فرمایا تھا جسے علماء حجاز نے بھی بیحد پسند کیا تھا ۔ پھر بعد میں افادۂ عام کے لئے اردو میں ترجمہ کر کے عمدۃ المطابع لکھنؤ سے بھی شائع ہوا۔

۶۔ ابراز المکنون فی مبحث العلم ما کان و ما یکون ـــــ یہ رسالہ بھی عربی میں ہے، اس میں مولاناؒ نے محققانہ و عالمانہ طور پر اس عقیدۂ فاسدہ کی پر زور تردید کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جمیع ما کان و ما یکون کا علم حاصل تھا ۔ انداز بیان اور طریق استدلال بے نظیر ہے ۔ شائع

---

[۱] نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۳۳۸

اخراجات، سالانہ دعوتیں اور سرہند کے قافلے کے مصارف ان سب پر اتنی کثیر رقمیں صرف ہوتی تھیں جن کا تخمینہ لگانا مشکل ہے مگر یہ آمدنی کن ذرائع سے ہوتی تھی اب تک کسی کو علم نہیں۔ مولانا نے کبھی مدرسہ کے لئے یا اور کسی دوسرے کاموں کے لئے کوئی چندہ وغیرہ نہیں کیا اور نہ ہی کوئی ہدیہ بظاہر قبول کیا اسی وجہ سے ان کے بارے میں طرح طرح کی باتیں مشہور تھیں۔ چنانچہ ایک موقع پر خود ہی فرمایا کہ:

"ہمارے متعلق لوگوں کا عجب خیال ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ ہم کیمیا جانتے ہیں، کوئی سمجھتا ہے کہ ہم کو دستِ غیب حاصل ہے، کسی کا خیال ہے کہ ہم تجارت کرتے ہیں۔ حالانکہ اللہ کے فضل و کرم سے ہم ان سب باتوں سے بری ہیں۔ ہم نے اصل کو اس لئے مخفی رکھا ہے کہ اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے گا تو وہ اس کی تخریب کے درپئے ہو جائیں گے۔ اچھا ہوا کہ ہم کو کیمیا نہ آئی ورنہ ہم سب کو بتلا دیتے۔"[1]

ثقہ اور باخبر حضرات کا خیال ہے کہ مولانا کے بعض مخصوص معتقدین تھے جو پوشیدہ طور پر ان کی خدمت کیا کرتے تھے، واللہ اعلم۔

آپ کی تصنیفات مولانا نے وفات سے بہت عرصہ قبل ہی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا کام موقوف کر دیا تھا اور یک لخت گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی صرف اوقات نماز میں آپ باہر تشریف لاتے اور نماز سے فراغت ہوتے ہی اپنے کمرے میں چلے جاتے اکثر اوقات کمرے کا دروازہ اندر سے بند ہوتا تھا۔ ابتداءً دورانِ درس میں آپ نے چند کتب و رسائل تحریر فرما دیئے تھے وہی آپ کی علمی متروکات ہیں، تمام کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن اب نایاب ہیں سوائے چند کتابوں کے جو مدرسہ کے کتب خانے میں اب بھی موجود ہیں باقی بالکل مفقود ہیں۔

---

[1] مصباح الشائخ، حکیم ہادی رضا خاں ماہر ص۲۲

رتے ہیں جو مولانا مرحوم کے بہت قریبی اور خصوصی شاگرد تھے ، وہ تحریر فرماتے ہیں :

"۳ رجب یوم چہارشنبہ کو بعد نماز عصر حضرت مرحوم کا انتقال ہوگیا، کئی سال سے حوالی قلب میں درد کا دورہ ہوتا تھا جو اب کچھ دنوں سے جلد جلد ہونے لگا تھا اور بعض اوقات تو دن رات کے چوبیس گھنٹہ میں کسی وقت یہ درد مفارقت نہ کرتا تھا۔"

آگے چل کر مزید فرماتے ہیں :

"عوام میں عجائب پرستی کا مادہ بوجہ جہل کے زیادہ ہے اس لئے عجیب عجیب اسباب بیان کئے جاتے ہیں ، آخر وقت میں کچھ عجمی لوگ آ گئے تھے انھوں نے حضرت مرحوم کے سامنے کچھ عربی کے اشعار یا کوئی عربی عبارت نثر کی پڑھی تھی۔ اس واقعہ کو ایسے طریقہ سے شہرت دی جارہی ہے کہ گویا سبب موت یہی ہے اور بھی اس قسم کی بہت سی باتیں مشہور کی جاتی ہیں[۱]۔"

مولانا لکھنوی کی اس عبارت سے یہ معلوم ہوا کہ موت کا اصل سبب مرض تھا کوئی اور وجہ نہ تھی ۔ بہرکیف ۳ رجب ۱۳۴۳ھ کو مولانا سید عین القضاۃ صاحب رح کا ۷۸ سال کی عمر میں وصال ہوگیا اور مدرسہ فرقانیہ چوک لکھنؤ کے چمن میں مدفون ہوئے ۔

مولانا کے تلامذہ

مولانا کے شاگردوں کی تعداد بے شمار ہے کیونکہ آپ نے اپنی ساری زندگی درس و تدریس میں ہی گذاری ، ہم یہاں صرف اُن شاگردوں کے نام لکھیں گے جو اور بھی صاحب تصنیف و تالیف ہوئے ہیں اور آج ان کے بھی ہزاروں شاگرد اور مرید ہیں ۔

۱۔ امام اہل سنت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی سابق مدیر النجم لکھنؤ

---

[۱] ماہنامہ النجم لکھنؤ ، جمادی الاول ۱۳۴۳ھ ص ۳

ہوچکا ہے۔

۷۔ نہایۃ الارشاد الی الاحتفال المیلاد ــــ عربی زبان میں یہ کتاب ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل ہے اس کتاب میں عقلی اور نقلی دلائل سے محفل میلاد اور اس میں قیام کو مستحب ثابت کیا گیا ہے۔ الناظر پریس لکھنؤ سے شائع ہوچکی ہے۔

۸۔ خیر النواھی عن ارتکاب الملاھی ــــ یہ رسالہ اردو میں ہے جس میں غنا کو آیاتِ کریمہ اور احادیثِ نبویہ اور براہینِ قطعیہ سے حرام ثابت کیا گیا ہے۔ ۱۹۱۸ء میں پہلی بار شائع ہوا پھر اس کے بعد متعدد ایڈیشن بھی شائع ہوئے۔

۹۔ الاغناء فی تحریم الغناء ــــ یہ رسالہ بھی اردو میں ہے جس میں آیاتِ قرآنیہ سے غنا کی حرمت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کئی بار شائع ہوچکا ہے۔

۱۰۔ التحقیقات الوثیقہ فی بعض مایتعلق باالعقیقہ ــــ اس رسالہ میں عقیقہ کی اہمیت اور اس کے ضروری مسائل کا ذکر ہے۔ شائع ہوچکا ہے۔

۱۱۔ فتویٰ جماعت نماز تہجد در ماہ رمضان ــــ رمضان المبارک میں نماز تہجد باجماعت ادا کرنے اور اس میں قرآن پاک سننے کو حوالہ کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے۔ آپ خود بھی اپنی زندگی میں اس پر عامل تھے۔ یہ رسالہ بھی شائع ہوچکا ہے۔

وفات مولانا کی پوری زندگی اخفا میں گذری اسی طرح ان کی موت بھی بہت عرصہ تک عجیب وغریب معمہ بنی رہی، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان کی موت کا سبب یہ ہوا کہ ایک ایرانی عالم سید اسد اللہ نجفی ان سے ملنے کے لئے آئے اور عربی میں کچھ معرفت اور فنا کے اشعار سنائے جس کو سنتے ہی مولانا پر ایک وجد کی کیفیت طاری ہوگئی اور اسی عالم میں آپ کا وصال ہوگیا۔

لیکن لکھنؤ کے ثقہ اور باخبر حلقوں کی رائے اس سے مختلف ہے، وہ موت کا سبب یہ واقعہ نہیں بیان کرتے۔ اس سلسلہ میں ہم مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی کی رائے پیش

صعالیک

شعرائے جاہلیت کا ایک نرالا طبقہ

(۲)

از مولانا عبدالحلیم ندوی ایم اے (علیگ) صدر شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ

برہان بابت ماہ دسمبر ۱۹۷۴ء میں مذکورہ بالا عنوان کے تحت "صعالیک الشعراء" میں ممتاز اور پرگو شاعر الشنفری کی زندگی، اس کے کلام کی امتیازی خصوصیات اور مختلف اصنافِ سخن میں اس کے کلام کا نمونہ پیش کیا گیا تھا۔ آج کی صحبت میں اس کے ان دو مشہور قصیدوں کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے جن کا ذکر گذشتہ مضمون میں آچکا ہے۔ ان میں سے ایک کا مطلع ہے:

أَلا أُم عمروٍ أجمعت فاستقلّتِ　　　وما ودّعت جیرانها اذ تولّتِ

جاہلی شعراء کے تذکرہ نگار عام طور سے ان شعراء کے قصیدوں کی شان نزول یا ان کے کہنے کے محرک واقعات اور اسباب ضرور بیان کرتے ہیں۔ شنفری کے اس قصیدہ کی شانِ نزول میں بھی مختلف واقعات بیان کیئے گئے ہیں جن میں سب سے معتبر اور اشعار کی فضا سے مطابق وہ شان نزول ہے جسے ابو محمد القاسم بن محمد لبشار الانباری نے اپنے مرتب کیئے ہوئے دیوان المفضلیات کی شرح میں بیان کی ہے۔ چنانچہ الانباری نے احمد بن علبید وغیرہ سے روایت کی ہے کہ اس قصیدہ کے کہنے کا سبب یہ ہوا کہ شنفری اپنے تیس ہم جولیوں کے ساتھ جن میں تأبّط شرّاً بھی تھا، بنو سلامان بن المفرج پر، جو قبیلہ ازد (شنفری کا قبیلہ) کی ایک شاخ تھا، حملہ کرنے کی نیت سے نکلا۔ یہ لوگ

۲۔ مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی سابق مہتمم مدرسہ نظامیہ لکھنؤ
۳۔ شمس العلماء مولوی عبدالمجید صاحب فرنگی محلیؒ سابق پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی
۴۔ شمس العلماء مولوی عبدالحمید صاحب فرنگی محلیؒ بانی مدرسہ قدیمہ لکھنؤ
۵۔ مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلیؒ خویش مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلیؒ
۶۔ مولانا عبدالباقی صاحب فرنگی محلیؒ مہاجر مدنی
۷۔ مولوی عبدالہادی صاحب فرنگی محلیؒ نبیرہ ملا مبین شارح سُلّم
۸۔ مولوی عظمت اللہ صاحب فرنگی محلیؒ
۹۔ حکیم خواجہ کمال الدین صاحب
۱۰۔ حکیم سید احمد حسن صاحبؒ
۱۱۔ حکیم وہاج الحق صاحب فرنگی محلیؒ ——— اور

اردو کے مشہور و معروف شاعر جناب مرزا محمد ہادی عزیزؔ لکھنوی بھی آپ کے تلامذہ میں سے تھے جن کے متعلق اکبرؔ مرحوم نے کہا تھا ؎

سخن میں اور تو اہلِ تمیز ہی ہیں فقط
شہیدِ جلوۂ معنی عزیزؔ ہی ہیں فقط

چل پڑے تھے اور سن گن پاکر وہ بھی پہاڑ کے دامن تک آگئے اور چاروں طرف سے ان سب کو گھیر لیا۔ جب شنفری اور اس کے ساتھیوں نے دیکھا کہ اب بھاگنے کی کوئی راہ نہیں ہے تو وہ بھی خم ٹھونک کر سامنے آگئے۔ اب کیا تھا دونوں پارٹیوں میں معرکہ گرم ہوگیا اور خاصی دیر تک جم کر مقابلہ ہوتا رہا جس کے نتیجہ میں دونوں فریقوں کو سخت زخم آئے اور بغیر ہار جیت کے فیصلے کے دونوں فریق نے اپنی اپنی راہ لی۔

ان صعالیک کے یہاں یہ رواج تھا کہ جب یہ لوگ غارت گری کرنے کے لئے نکلتے تو تأبّط شرا کو کھانے پینے کی چیزوں کا ذمہ دار بنا دیتے تھے۔ چنانچہ اس معرکہ میں بھی حسب روایت تأبّط شرا یہ ذمہ داری سنبھالے ہوئے تھا۔ تأبّط شرا کی یہ عادت تھی کہ لڑائی کے موقعوں پر کھانا بہت ناپ تول کر دیتا تھا اور کہتا تھا کہ میں یہ حرکت بخل کی وجہ سے نہیں کر رہا ہوں بلکہ صرف اس خیال سے کہ کہیں لڑائی طول کھینچ گئی اور مال غنیمت نہ حاصل ہوا اور اپنا پس انداز بھی ختم ہوگیا تو تم لوگ بھوکوں مر جاؤ گے۔ چنانچہ اس موقعہ پر شنفری نے یہ قصیدہ کہا جس میں تأبّط شرا کی اس مصلحت بینی اور دور اندیشی کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔

شنفری نے یہ قصیدہ جاہلی شعراء کی ریت کے مطابق اپنی محبوبہ ام عمرو سے اظہار تشبیب کے ساتھ شروع کیا ہے۔ اور حسین وچیدہ الفاظ اور بڑے ہی دلنشین انداز اور خوبصورت اسلوبِ بیان میں اس کا ایسا حسین اور دل آویز مرقع کھینچا ہے کہ دشمنِ دین وایمان بنا دیا ہے خود کہتا ہے کہ "لو جُنَّ إنسان من الحسن" یعنی اگر کوئی شخص ایک سراپائے حسن وجمال کو دیکھ کر ہوش وحواس اور عقل وخرد کو خیرباد کہہ سکتا ہے تو میری محبوبہ کا حسن برق پاش ایسا ہی غارت گرِ دین وایمان ہے۔ آگے جب اس کی شرم وحیا، عفت وعصمت کا ذکر کرتا ہے تو ایک بدوی دوشیزہ اپنی تمام رعنائیوں اور سحر خیزیوں کے ساتھ سامنے کھڑی ہوجاتی ہے اور

آشفتہ مزاجوں کو کبھی ناز سے دیکھا
گستاخ نگاہوں کو کبھی آنکھ دکھادی

بنوسلامان کی جائے اقامت کے قریب مشعل نامی ایک وادی میں رات گذارنے کی نیت سے ٹھہرے۔ تھوڑی دیر میں انھوں نے بکری کے میانے کی آواز سنی اور سمجھ گئے کہ آس پاس کوئی آدمی بھی ضرور ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی آنکھیں اس طرف لگا دیں۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بھیڑیا بکری کی آواز سن کر ادھر چلا آرہا ہے۔ پاس آکر اس کو شکار کرنے کی غرض سے اس نے جو جست لگائی تو اس گڑھے میں گر پڑا جسے اس کو شکار کرنے کے لئے کھودا گیا تھا[1] یہ دیکھ کر یہ سب لوگ ادھر دوڑ پڑے۔ گڑھے کے قریب ابھی پہونچے ہی تھے کہ دیکھا کہ ایک آدمی بھی اس طرف دبے پاؤں رینگ رہا ہے۔ آدمی نے جب ان لوگوں کو اپنی طرف آتے دیکھا تو ڈر کے مارے اس کی روح فنا ہوگئی اور گھبراہٹ میں اس نے بھی اسی گڑھے میں چھلانگ لگا دی جس میں بھیڑیا گرا تھا۔ ان صعالیک نے جو یہ منظر دیکھا تو گڑھے کے اندر تیروں کی بارش شروع کر دی۔ آدمی تیروں کے زخم سے بیتاب ہو کر چلانے لگا تو تأبط شراً نے اس سے پوچھا کہ یہ تم چلا رہے ہو یا بھیڑیا۔ ابھی وہ بیچارا کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ ان لوگوں نے تیروں کی باڑھ اور تیز کر دی جس سے بھیڑیا اور آدمی دونوں مر گئے۔ جب گڑھے میں سے اس آدمی کو باہر نکالا گیا تو ان میں سے ایک آدمی نے اسے پہچان لیا اور کہا "ارے یہ تو ابن الافطس ہے"، ابھی خیریت ہے بھاگ نکلو ورنہ اس کے قبیلے والے ابھی ہم لوگوں کو دھر لیں گے اور اس حرکت کا مزہ چکھا دیں گے۔ چنانچہ یہ لوگ وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے اور ایک پہاڑ کے دامن میں جا کر پناہ لی[2]۔ ادھر مقتول کے قبیلہ والے اس کی چیخ سن کر اس طرف

۱۔ عرب شیر اور بھیڑئے کو شکار کرنے کے لئے ایک گڑھا کھود کر اسے گھاس پھوس سے بند کر دیتے تھے اور اس کے کنارے اس طرح بکری کو باندھتے تھے کہ اگر جانور جست لگائے تو سیدھا گڑھے کے اندر چلا جائے۔ عرب اس گڑھے کو "قترۃ" کہتے تھے۔

۲۔ غالباً پہاڑ کا یہ دامن "جبا" تھا جس کا ذکر شنفری نے "مشعل" وادی کے ساتھ اپنے ایک شعر میں کیا ہے۔

لقد أعجبتني لاسقوطا قناعها اذا ما مشت، ولا بذات تلفت

كأن لها في الارض نسيا تقصه على امها وان تكلمك تبلت

اس کے بعد صرف ایک شعر میں اس کا پورا سراپا کھینچ کے رکھ دیتا ہے اور اس طرح سے کہ "جوانی سے طفلی گلے مل رہی تھی" کا ایسا سحر طراز سماں بندھ جاتا ہے کہ انسان اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھتا ہے۔ اور پکار اٹھتا ہے کہ

ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

کہتا ہے کہ اس کا ناک نقشہ بڑا تیکھا ہے اعضا بڑے سبک، اخلاق وعادات بہت ہی پیارے، انداز و اطوار بڑے بانکے اور قد، قد رعنا، بس یوں سمجھو کہ قدرت کے معجز نما ہاتھوں نے نزاکت و بانکپن اور انداز دلربائی سے حسن وجمال کا ایک ایسا انمول مرقع گڑھ کے رکھ دیا ہے کہ اس پر بس ایک نظر پڑ جانا ہی عقل وخرد کھو دینے کے لئے کافی ہے۔

فدقّت وجلّت واسبکرّت واکملت فلو جُنَّ إنسان من الحسن جنت

ان سب صفات کے باوجود وہ سنگدل، سخت کوش و تند خو نہیں ہے۔ بلکہ طرحداری کے ساتھ دلداری کے فن کو اور خاص طور سے میرے جیسے عاشق کے ساتھ خوب نباہنا جانتی ہے۔ چنانچہ اس نے ازراہ دلنوازی میرے ساتھ ایک ایسی مشک بیز اور معنبر و معطر شام گزاری جس سے سارا ماحول خوشبوؤں کی لپٹ میں بس گیا۔

فبتنا كأن البيت حُجّر فوقنا بريحانه ريحت عشاءً وطلّت

بريحانه من بطن حلية نوّرت لها أرج ماحولها غير مسنت

شنفری کے ان اشعار کی، عہد عباسی میں، خاص طور سے اتنی دھوم مچی کہ اس زمانے کا سب سے بڑا نقاد اور شعر و شاعری کا صاحب نظر عالم اصمعی بے اختیار پکار اٹھا کہ "معشوقہ کی شرم وحیا، اخلاق وعادات، حسن وجمال اور دلداری و دلنوازی کا نقشہ اس سے اچھا کسی جاہلی شاعر نے اب تک نہیں کھینچا ہے[1]۔"

(فٹ نوٹ ص ۴۰ کے نیچے)

کاسماں پیدا ہو جاتا ہے۔ اور جب وہ مست خرام ہوتی ہے تو ایسے ہولے ہولے نظریں نیچے گڑوئے کر جیسے کوئی قیمتی شے کھوگئی ہو اور وہ اسے پگ پگ ڈھونڈھ رہی ہو۔ پھر اپنی تعریف میں چند اشعار کہتا ہے اور اس کے بعد تأبط شراً کی تعریف شروع کرتا ہے۔ اور اس کو "اُم عیال" (بچوں کی ماں)[1] سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ اس وجہ سے کہ جس طرح ماں اپنے بچوں کے کھانے پینے اور آرام و آسائش کا خیال رکھتی ہے تأبط شراً بھی ان لوگوں کا ایسا ہی خیال رکھتا تھا قصیدہ کے آخر میں شنفری نے اپنی عادات و اطوار اور خو بو بتائی ہے اور اس پر قصیدہ ختم کر دیا ہے۔

اس قصیدہ میں الانباری کی روایت کے مطابق ۴۳ شعر ہیں۔ اس کا مطلع ہے:

أَلا أُمُّ عمروٍ أَجمعتْ فاستقلّتِ　　　وما ودّعت جيرانها إذ تولّت

یعنی میری محبوبہ ام عمرو نے جب کوچ کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا تو اپنی پڑوسنوں سے رخصت ہوئے بغیر ہی چل کھڑی ہوئی۔

قصیدہ کو جاہلی شعراء کی ریت کے مطابق تشبیب سے شروع کرنے کے بعد چوتھے شعر سے اپنی محبوبہ کا بھرپور ذکر کرتا ہے اور بڑے اچھوتے اور دلنشین انداز سے اس کی پاکدامنی، اعلیٰ کردار، پاکیزہ اخلاق، شرم و حیا اور شوہر سے وفاداری اور اس کی دلداری کا نقشہ کھینچتا ہے۔ اور یہ سلسلہ تیرھویں شعر تک چلتا ہے۔ چنانچہ اس کی شرم و حیا کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتا ہے "جب وہ باہر نکلتی ہے تو اس کے انداز بہت ہی بھلے لگتے ہیں کیونکہ وہ خوب ڈھکی چھپی رہتی ہے اور اِدھر اُدھر تاک جھانک نہیں کرتی بلکہ اس طرح زمین میں نظریں گڑوئے چلتی ہے کہ جیسے کوئی قیمتی چیز کھوگئی ہو اور وہ اسے ہیر رہی ہو۔ اور اگر کہیں کسی سے بات بھی کرتی ہے تو ہکلاتی ہوئی سی، دو ایک جملے، کبھی ادھورے کبھی پورے۔

۱۔ قبیلہ ازد کے افراد اپنے سردار کو "ام عیال" (یعنی بچوں کی ماں) کے لقب سے یاد کرتے تھے شنفری بھی ازدی تھا، اس لئے تأبط شرا کو "ام عیال" کہتا تھا

گا تو کھانا کہیں ختم نہ ہوجائے اور بعد میں ہم سب کو بھوکا مرنا پڑے۔ ذرا دیکھو تو کیا ہی عمدہ ترکیب اس نے نکالی ہے۔

وأُمّ عيالٌ قد شهدت تقوتهم　　إذا أطعمتهم أوتحت وأقلّت

تخاف علينا العيل إن هي أكثرت　　ونحن جياع أي آلٍ تألّتِ

اس کے بعد تأبط شراً کی بہادری، اس کے لڑنے کے ڈھنگ، تلوار بازی کے گر اور اس کی تلوار کی تعریف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تأبط شراً کی تلواریں بڑی تیز اور آبدار ہیں اور ایسے پکے اور نوکیلے لوہے کی بنی ہوئی ہیں کہ معرکہ میں دشمنوں کے خون سے سیراب ہونے کے بعد اس طرح چمچماتی ہیں جیسے ان بچھڑوں کی سفیدد میں چمکتی ہیں جو انھیں اٹھائے اپنی ماؤں کو دیکھ کر بے تحاشہ ان کی طرف کلیلیں کرتے بھاگتے ہیں۔

حُسام کلون الملح صاف حدیدہٗ　　جراز کا قطاع الغدیر المنعّت

تراها كأذ ناب الحسيل صوادراً　　وقد نهلت من الدماء وعلّت

۲۷ویں شعر میں اپنے باپ کے قاتل حرام بن جابر کو قتل کرنے کے واقعہ کا ذکر کرتا ہے اور سلامان بن مفرج نے اس کے ساتھ جو زیادتی کی تھی اس کے انتقام لینے کی طرف اشارہ کرتا ہے[1]۔ چنانچہ کہتا ہے کہ رمی جمرہ کے قریب لبیک، کہنے والے حاجیوں کے بیچوں بیچ ہم نے احرام باندھے ہوئے ایک شخص کو دوسرے محرم کے بدلے میں قتل کر دیا (یعنی اپنے باپ کے بدلے میں کہ اس کو بھی حالت احرام میں مارا گیا تھا) اور سلامان بن مفرج نے ہمارے ساتھ جو زیادتی کی تھی اس کا بھی بھرپور بدلہ ہم نے لے لیا اور انھیں اس زیادتی کا مزہ چکھا دیا۔

قتلنا قتيلاً مهدياً بملبّد　　جمار منى وسط الحجيج المصوّت

جزينا سلامان بن مفرج قرضها　　بما قدمت أيديهم وأزلت

---

[1] تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

پندرھویں شعر سے انیسویں شعر تک اپنی تعریف کرتا ہے جس میں اپنی بہادری جنگ جوئی اور معرکوں میں فتح وشکست کا خیال نہ کرنے کی عادت کا ذکر کرنے کے بعد وادی مشعل کے معرکہ کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھ سے بڑی غلطی ہوگئی کہ صرف مال غنیمت کی لالچ میں آکر اپنے علاقے سے اتنی دور جاکر میں نے اپنے ساتھیوں کو معرکہ کارزار میں جھونک دیا اور اسی وجہ سے انھیں اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوسکی۔

خرجنا من الوادی الذی بین مشعل وبین الجباھیہات أنشات سربتی

اس معرکہ میں وہ پیدل لڑا تھا۔ گھوڑے تو اول میسر کہاں پھر اسے ان کی ضرورت ہی کیا تھی۔ وہ تو ان سے بھی تیز دوڑلیتا تھا۔ چنانچہ وہ اس سرزمین کی طرف باوجود دور ہونے کے صبح وشام پیدل چل کر باوجود تھکن اور پریشانی کے پہونچا تھا اور ننگے پاؤں حریف کے مقابلہ میں سینہ سپر ہوگیا تھا۔

أمش علی أین الغزاۃ وبُعدھا لقربنی فیھا رواحی غدوتی

اس معرکہ میں حسب دستور تابط شراً سامان رسد کا انچارج تھا۔ چنانچہ انیسویں شعر سے اس کی تعریف شروع کرتا ہے اور کہتا ہے میرا سردار جسے "ام عیال" (بچوں کی ماں) کے لقب سے یاد کیا ہے اتنا دور اندیش ہمارا اتنا خیرخواہ اور اتنا منتظم آدمی ہے کہ ہم سب کو کھانا بہت ناپ تول کے دیتا تھا کیونکہ اسے ہر وقت یہ خطرہ لاحق رہتا تھا کہ اگر بے حساب بانٹ دوں

فٹ نوٹ متعلقہ ص ۲۹

۱۔ المفضلیات ص ۲۰۱ اصمعی نے شنفری کے ان اشعار کے مقابلہ میں ابوقیس بن الاسلت کے چند اشعار بھی نقل کیے ہیں جو اپنی جگہ پر بہت خوب ہیں مگر ان اشعار سے محبوبہ کے ناز ونعم سہیلیوں میں اس کی مان دان اور اس سے ان کے تعلق کا صرف اظہار ہوتا ہے۔ شنفری کی محبوبہ میں جو صفات ہیں ان کا اظہار نہیں۔

شنفری کا قصیدہ لامیۃ العرب

شنفری کا دوسرا مشہور قصیدہ وہ ہے جو عربی تاریخ ادب میں لامیۃ العرب کے نام سے موسوم ہے۔ اس قصیدہ میں باتفاق رواۃ ۶۸ شعر ہیں[1]۔ اس قصیدہ میں شنفری نے نہ صرف اپنی بلکہ اپنے جیسے تمام صعالیک الشعرا کی زندگی کا حقیقی نقشہ، بڑے اچھوتے انداز سے کھینچا ہے۔ ایک بے گھر، بے در، بے یار و غمگسار، مگر غیور خود دار، اور بہادر بدوی، کس طرح اپنی زندگی صحراؤں، بیابانوں میں درندوں اور جنگلی جانوروں کے درمیان گزارتا ہے۔ بھوک پیاس اور گرمی کی شدت، راتوں کی ہوش ربا وحشت اور تاریکی، صحرا کی ہولناکی اور اس کی اتھاہ پہنائیوں میں، کس طرح صرف اپنی اونٹنی کے سہارے ایک منزل موہوم کی طرف چلتا رہتا ہے کہ شاید اسے کچھ مال غنیمت ہاتھ آجائے جس سے زندگی کے ڈھکیلنے کے لئے کچھ سہارا میسر آجائے۔ اور اس طرح زندگی صرف اپنے سہارے، بغیر کسی کا احسان لئے، بغیر دست سوال دراز کئے، بیت جائے کہ صعلوک کے لئے کسی کے سامنے دست سوال پھیلانا ننگ ہے، چاہے اسے اس پیٹ کی خاطر اپنی جان ہی کیوں نہ دینی پڑے، کیونکہ ان سرپھروں کا نظریہ تھا کہ

ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

"اور کبھی جان" "اور کبھی تسلیم جان" کے اس پاٹ کے بیچ میں آکر عام طور سے یہ لوگ ہمیشہ کے لئے اپنی زندگی سے بہادرانہ ہاتھ دھو بیٹھتے تھے۔

شنفری کا یہ قصیدہ محض ان آزاد منش سرپھرے نوجوانوں کی داستان حیات اور نظریۂ موت و زلیست ہی نہیں ہے بلکہ دور جاہلی کے شاعرانہ کلام کا بہترین نمونہ، اور ایک بدوی نوجوان کی زندگی کا صحیح مرقع بھی ہے۔ دور جاہلی میں بہت سے شعراء نے ردیف لام میں طویل قصیدے

۱۔ خزانۃ الادب ولب لباب لسان العرب۔ عبدالقادر بن عمر البغدادی ج ۲ ص ۱۵۰

اس کے بعد کہتا ہے کہ میں موت سے نہیں ڈرتا موت تو آنی ہی ہے پھر اگر میں مرگیا تو کس کو میرا غم ہوگا۔ میرا کون ہے جو میرے لئے آنسو بہائے گا آنسو بہانا تو درکنار اس دنیا میں تو میرا اپنا کوئی ایسا بھی نہیں کہ اگر بیمار پڑجاؤں تو گھڑی بھر کے لئے عیادت ہی کو آجائے۔ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ سب نے مجھے چھوڑ دیا نہ خالائیں نہ چچیاں نہ کنبہ نہ پریوار، میرا سب کچھ صرف میں ہوں اور میری تنگ ودو۔ اور میرے یہ دونوں پاؤں جن کی بدولت میں جان لیوا خطرات سے بچ نکلتا ہوں۔

إذا ما اتتني ميتتي لم ابال بها ولم تذر خالاتي الدموع وعمتي

الا لا تعدني ان تشكيت خلتي شفاني باعلى ذي البرلقين علاوتي

ان سب باتوں اور اپنی تندخوئی اور سخت کوشی کے باوجود میں بڑا اصلح جو، دوست نواز اور صاحب مروت آدمی ہوں۔ جو مجھ سے ملنا چاہتا ہے میں اس سے بڑھ کر ملتا ہوں اور پورا اعتماد اور بھروسہ دیتا ہوں اور جو مجھ سے دور رہنا چاہے مجھ سے تعلقات نہ قائم کرنا چاہے اس کے پاس بھی نہیں پھٹکتا۔ اور یہیں پر شنفری کا یہ قصیدہ ختم ہوجاتا ہے۔

واني لحلو إن اريدت حلاوتي ومر اذا النفس العزوف استمرت

ابي لما آبي سريع مباءتي إلى كل نفس تنتحي في مسرتي

یہ تھا شنفری کا وہ قصیدہ جس میں اس نے غم دوراں کے ساتھ غم جاناں کی لذت اندوزیوں کی حکایت اور اپنی بیکسی ولاچارگی پر شکایت کرنے کے بجائے، بہادرانہ اپنے بل بوتے پر، ان سے نبرد آزما ہونے کا نقشہ کھینچا ہے۔ چنانچہ اس کے قصیدہ میں صحرا کے آغوش میں پلے ایک بے فکرے بدوی نوجوان کے شب وروز کی تصویر ملتی ہے تو دوسری طرف ایک عاشق کا دھڑکتا دل اور ایک محبوبۂ دلنواز کا جیتا جاگتا پیکر بھی۔ کیونکہ یہ نوجوان صرف تلوار کے ہی دھنی نہ تھے بلکہ اس کے سینہ میں ایک دھڑکتا دل بھی تھا جس میں محبت جب اپنی جوت جگاتی تھی تو اس کی شعاعیں غزل کے ان لافانی اشعار میں ڈھل جاتی تھیں جنھیں دنیا پڑھ کر آج بھی جھوم جھوم اٹھتی ہے۔

شنفری نے اپنے اس قصیدہ کو اپنے سابقہ قصیدہ اور عرب شعراء کی ریت کے خلاف بغیر تشبیب کے مطلب کی بات سے شروع کیا ہے ۔ یہ انداز بیان بلا وجہ نہیں ہے ۔ شنفری کا باپ جیسا کہ معلوم ہے ، بچپنے میں مار ڈالا گیا تھا ۔ ماں اسے اور اس کے چھوٹے بھائی کو لے کر اپنے میکہ میں، جو راویوں کے کہنے کے مطابق ، قبیلہ فہم و عدوان میں تھا ، رہتی تھی ۔ یہاں ننہال والوں نے شنفری سے اچھا سلوک نہیں کیا ہر وقت غربت و افلاس ، یتیمی و بیچارگی کے طعنے دیتے تھے ۔ اس سے بے اعتنائی برتتے تھے ۔ اسی صورت حال نے اس کے دل پر بہت برا اثر ڈالا ۔ اسے محسوس ہوا کہ اس دنیا میں اس کا اپنا کوئی نہیں ، کسی کو اس کا درد نہیں ، اس لئے اس نے سوچا کہ ایسی دنیا اور ایسے ماحول میں رہنے سے کیا فائدہ ؟ ایسے خود غرض اور بے حس لوگوں سے الگ ہو جانا ہی غیرت و خودداری کا تقاضا ہے ۔ پھر جب بقول اس کے

لعمرك ما في الارض ضيق على امرئٍ   سرى راغبا أو راهبًا وهو يعقل

یعنی   جائے خدا تنگ نیست پائے مرا لنگ نیست

اور اگر ان سب رشتوں ناطوں کو توڑ کر نکل جائے تو کوئی پوچھنے والا بھی نہیں کہ کہاں جاتے ہو اور کیوں جاتے ہو "من يسأل الصعلوك اين مذاهبه" تو پھر یہ ذلت کی زندگی کیوں گزاری جائے اور اپنی خود داری و عزت نفس کو کیوں مجروح کیا جائے ؟ چنانچہ اس نے طے کر لیا کہ اپنے ننہال کو خیرباد کہہ کر اگر ممکن ہوا تو اپنی قوم یعنی ازد میں چلا جاؤں گا ورنہ خدا کی لمبی چوڑی زمین کے کسی حصہ میں قسمت آزمائی کے لئے نکل کھڑا ہوں گا ۔ چنانچہ بغیر کسی تمہید یا تشبیب کے اپنے ننہال والوں کو قصیدہ کے مطلع میں مخاطب کر کے کہتا ہے :

أقيموا بني امي صدور مطيكم   فإني إلى قوم سواكم لأميل

یعنی اے میری ننہال والو ذرا کان کھول کر سن لو تم نے میری بڑی بے عزتی کی ہے ۔ مجھ سے بہت بے اعتنائی برتی ہے اس لئے اب میں تمھیں ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ کے دوسرے لوگوں میں جا رہا ہوں کیونکہ اب تمھارے مقابلہ میں ان کی طرف اپنا رجحان طبع زیادہ پاتا ہوں ۔

کہے ہیں جن میں سب سے مشہور امرؤ القیس کا معلقہ ہے لیکن شنفری کے اس قصیدہ کی مقبولیت کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ صرف اسی کو ہی "لامیۃ العرب" کا خطاب دیا گیا۔ یہ شرف کسی اور کے قصیدے کو حاصل نہ ہوا۔ اس کی شہرت اور حُسنِ قبول کی وجہ سے اس کی مختلف شرحیں لکھی گئی ہیں۔ اور اب تک اہلِ ذوق اسے فردوس گوش بنائے ہوئے ہیں[1]۔ یہ قصیدہ اپنے معانی، اسلوب نگارش اور سلاست و روانی میں ایسی امتیازی شان کا حامل ہے کہ بعد میں آنے والے شعرا نے بھی اس بحر اور اس ردیف و قافیہ میں اپنی جولانی طبع کے دکھانے کی کوشش کی، چنانچہ شنفری سے تقریباً ۷۱۶ سال بعد طغرائی نے اسی بحر اور اسی انداز میں ایک قصیدہ کہا جس میں بڑی حد تک زبان پر قدرت، اسلوبِ بیان کی ندرت اور سلاست و روانی میں اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ چنانچہ اس کے قصیدہ کو بھی حسنِ قبول حاصل ہوا اور شنفری کے "لامیۃ العرب" کے مقابلہ میں اسے "لامیۃ العجم" کا خطاب ملا۔ طغرائی کے اس لامیہ قصیدہ کا مطلع ہے:

اصالۃ الرای صانتنی عن الخطل   وحیلۃ الفضل زانتنی لدی العطل

طغرائی کا یہ قصیدہ درحقیقت شہر آشوب ہے، جس میں اس نے اپنے زمانہ کے بغداد کے حالات، لوگوں کی بے وفائی، باکمال شخصیتوں کی بے قدری، ہمتوں اور عزائم کی پستی اور سیاسی افراتفری کا ذکر کیا ہے۔ اسی ضمن میں حکمت وفلسفہ، وصف اور دوسرے اصناف سخن بھی آگئے ہیں۔ اور عربی زبان و ادب کے لئے، نسبتاً زوال پذیر زمانہ میں، اس کا یہ قصیدہ سلاست و روانی، الفاظ معانی، اثر اندازی وگیرائی کے لحاظ سے مثالی اور قابل تقلید نمونہ سمجھا جاتا ہے۔

۱۔ لامیۃ العرب کی شرحوں میں مشہور یہ ہیں (۱) شرح لامیۃ العرب لمحمود بن عمر الزمخشری م ۵۳۸ھ (۲) نہایۃ الارب فی شرح لامیۃ العرب لعطاء اللہ بن احمد بن عطاء اللہ بن احمد المصری ثم المکی (۳) "تفریج الکرب عن قلوب اہل الأرب فی معرفۃ لامیۃ العرب" لمحمد بن قاسم بن زاکور المغربی۔

اس کے بعد اپنی قناعت پسندی سیر چشمی اور باوجود فقر و فاقہ، غربت و افلاس کے اپنی عزت نفس و
خودداری کو برقرار رکھنے کی خواہش کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں کتنا ہی بھوکا کیوں نہ ہوں اگر
دسترخوان پر بیٹھتا ہوں تو لوگوں سے پہلے خوان پر ہاتھ نہیں مارنے لگتا بلکہ جب لوگ کھانا شروع
کر چکتے ہیں تب میں ہاتھ بڑھاتا ہوں۔ اسی طرح اپنی یہ عادت بتاتا ہے کہ اگر کوئی شخص بھلائی کے
بدلے بھلائی اور احسان کے بدلے احسان نہیں کرتا اور اس کے قریب رہنے میں کوئی دوسرا فائدہ
بھی نہ ہو تو ایسے شخص سے میں بلا تامل ہمیشہ کے لئے الگ ہو جاتا ہوں اور ایسے لوگوں کے بجائے
اپنے تین جگری دوستوں پر بھروسہ کرتا ہوں۔ وہ کون ہیں؟ ایک بیباک وجری دل، دوسرے
سفید چمکتی تیز تلوار اور تیسرے پیلے رنگ کی ایک لمبی کمان۔

ثلاثة أصحاب فؤاد مشيع وأبيض إصليت وصفراء عيطل

دسویں شعر سے اپنی تعریف شروع کرتا ہے جس میں اپنی صفات گنا تا ہے جو در حقیقت ایک
بدوی نوجوان کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ سب سے پہلے اپنی عالی نسبی کا دعویٰ کرتا ہے اور کہتا
ہے کہ میں شریف خاندان کا فرد ہوں چرواہا نہیں ہوں جو کمزور، سوکھی اور مریل اونٹنیوں کو رات
تک چراتا رہے، نہ میں بزدل، بیوقوف اور چڑیا کی طرح ڈرپوک ہوں اور نہ ہی بے وفا
ذلیل کوشش کہ دوستوں کو چھوڑ کر عورتوں سے دل لگی میں وقت گنواتا پھروں، میں بڑا مخیر
بڑا فصیح ہوں اور اتنا بہادر اور نڈر کہ ہر وقت ہتھیار بند مقابلہ کے لئے تیار رہتا ہوں اور
غیور کہ مدتوں بھوک و پیاس سے تڑپتا ہوں یہاں تک بھوک کا احساس بھی ختم ہو جائے
بھی کسی کے آگے دست سوال دراز نہیں کرتا۔ کسی کا احسان نہیں لیتا کوئی برائی نہیں کرتا اور
بھی کسی برائی میں پھنس جاتا ہوں تو فوراً اس سے اپنا دامن صاف کر لیتا ہوں۔ اپنا رزق اپنے
ت و بازو سے حاصل کرنے کے لئے اس بھیڑیئے کی مانند نکل کھڑا ہوتا ہوں جو مدتوں بھوکا
مارا رہا ہو اور صحرا میں بیتابی سے چیختا چلاتا ہو اور پھر بھی کچھ نہ ملے تو قناعت کے ساتھ نئے
لے سے اپنی دھن میں لگ جاتا ہو۔ یہ سلسلہ ۱۴ ویں شعر سے شروع کرتا ہے اور ۲۶ ویں شعر

۶ بے رحم زمانے کو اب چھوڑ رہے ہیں ہم
بے درد عزیزوں سے منہ موڑ رہے ہیں ہم
جو آس کہ تھی، وہ بھی اب توڑ رہے ہیں ہم

دوسرے شعر میں کہتا ہے کہ پہلے کے مقابلہ میں اب آسانی سے سفر کرنے کے وسائل بہت مہیا ہو گئے ہیں۔ سفر کی شدید ضرورت کے ساتھ ڈھلی ہوئی چاندنی رات ہے اور ایسے خوشگوار موسم میں سفر کرنے کے لئے سواریاں بھی کس لی گئی ہیں یعنی دوسرے لوگ بھی پا بہ رکاب ہیں۔ قافلہ کوچ کرنے والا ہے اس سے بہتر موقع کب ملے گا۔

فقد حمت الحاجات واللیل مقمر   وشدت لطیات مطایات وأرحل

اس کے بعد کہتا ہے کہ زمین میں اس شریف آدمی کے لئے بڑی گنجائش ہے جو بے عزتی اور جور وجفا کا شکار ہو اور اپنی عزتِ نفس اور خودداری کو عزیز رکھتا ہو۔

وفی الارض منأی للکریم عن الأذی   وفیها لمن خاف القلی المتحول

مگر شنفری اپنے ننھیال والوں کو چھوڑکر، ان سے کٹ کر، جڑتا کس سے ہے؟ اپنے قبیلہ ازد سے نہیں، وہ کہتا ہے کہ ان آبادیوں کو چھوڑکر، ان انسانوں سے منہ موڑکر، اور تم لوگوں سے قطع تعلق کرکے، میں نے جنگلی جانوروں کو اپنا گھرانا بنالیا ہے۔ کیونکہ یہ انسانوں کے مقابلہ میں زیادہ قابل بھروسہ ہیں، وہ دوسروں کے راز افشا نہیں کرتے اگر ان کا اپنا کوئی جرم کر بیٹھے تو اسے دشمن کے حوالہ نہیں کر دیتے کہ اس کا جو جی چاہے ان کے ساتھ کرے۔ اور یہ قابل اعتماد افراد خاندان کون ہیں؟ ایک "سید عملس" بڑا خوفناک بھیڑیا دوسرا "ارقط زہلول" یعنی دھاری دار چکنا چیتا اور تیسرا بالوں والا ابد لبو دار بجو "عرفاء جیئل" یہ ہیں میرے دوست اور افراد خاندان۔ اور میں تم کو چھوڑ کر انہیں کے پاس جا رہا ہوں کہ اب یہی میرے گھر والے اور میرے اپنے ہیں۔

ولی دونکم أھلون سِیدٌ عَمَلَّسٌ   وأرقط زھلول وعرفاء جیئل
ھم الرھط لا مستودع السر شائع   لدیھم ولا الجانی بما جر یخذل

اور جرأت میں فرق نہیں آیا۔ میں نے بڑے بڑے معرکے سر کئے ہیں۔ جنگ میں کشتوں کے پشتے لگا دئے ہیں۔ یہ زندگی ہے اس میں ہر طرح کے دن آتے ہیں کبھی غربت و افلاس ہے تو کبھی فراوانی و عیش و عشرت۔ پھر آدمی کیوں اس سے گھبرائے کیوں روئے دھوئے۔ اسے تو ہمیشہ رواں دواں رہنا چاہئے کہ یہی زندگی ہے۔ اسی لئے جب غربت و افلاس کا دور ہوتا ہے تو میں روتا دھوتا نہیں اور جب فارغ البالی میسر ہوتی ہے تو اکڑ کر تکبر سے نہیں چلتا۔

واعدم احیانا و أغنی و أنما ینال الغنی ذو البعدة المتبذل

فلا جزع من خلة متکشف ولا مرح تحت الغنی أتخیل

۵۲ ویں شعر سے اپنی بعض ان مہموں کا ذکر کرتا ہے جو اس نے شدید برفیلی راتوں میں اور جھلسا دینے والے سخت گرمی کے دنوں میں سر کی تھیں۔ چنانچہ کہتا ہے کہ میں نے لسا اوقات شدید اور تکلیف دہ موسموں میں نہ معلوم کتنے چٹیل میدان صرف دوڑ کر طے کئے ہیں جہاں سورج کی تپش اور لُو سے بچنے کے لئے سوائے میرے گھنے اور چپکے ہوئے بالوں کی لٹوں کے اور کوئی چیز میسر نہ تھی تو میں انھیں لٹوں کو اپنے منہ پر ڈال لیتا تھا تاکہ لُو کی لپیٹ سے چہرے کو بچا سکوں اور اپنی منزل کی طرف بڑھتا رہتا تھا۔ پہاڑوں اور گھاٹیوں کو طے کرتا اور بچتا بچاتا اپنے غنیم پر حملہ کرتا میری اس طویل صحرانوردی اور بادیہ پیمائی کا یہ اثر ہے کہ جنگل کے جانور اور خاص طور سے جنگلی پہاڑی بکریاں میری صورت سے اتنی مانوس ہو گئی ہیں کہ میرے اردگرد بلا خوف و خطر چرتی پھرتی ہیں۔ اور جب شام ہو جاتی ہے تو بلا ڈرے اور گھبرائے میرے چاروں طرف اس طرح لپٹ جاتی ہیں گویا کہ میں خود ایک بڑی سینگوں والا پہاڑی بکرا ہوں۔

یرکدن بالآصال حولی کأننی من العصم أوفی ینتحی الکیح أعقل

اور یہیں پر اس کا یہ مشہور قصیدہ "لامیۃ العرب" ختم ہو جاتا ہے۔

یہ تھا شنفری کا لامیۃ العرب قصیدہ جس میں اس نے اپنی زندگی اپنی بود و باش اور اپنے خیالات و افکار کا ایسا واضح اور صاف نقشہ کھینچا ہے کہ صرف اسی کی نہیں بلکہ عرب کے ان

تک جاری رکھتا ہے۔ کہتا ہے :

۱۴۔ ولست بمہیاف یعشی سوامہ مجدعۃ سقبانہا وھی بہّل

۲۶۔ واغدو إلی القوت الزھید کما غدا ازل تہاداہ التنائف اطحل

۲۷ ویں شعر سے اس بھوکے پیاسے بھیڑیئے اور اس کے ساتھیوں کی حالت بیان کرنے کے بعد پھر اپنی چابکدستی اور کاموں کو جلد از جلد تکمیل کرنے کی مثال "قطا" چڑیا سے دیتا ہے جو کسی جگہ پانی پینے کے لئے آتی ہے تو کس طرح چوکنی ہو کر چاروں طرف دیکھ کر اور جلدی سے اپنی پیاس بجھا کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ۴۱ ویں شعر میں قطا کے پانی پی کر واپس جانے کا نقشہ یوں کھینچتا ہے کہ وہ پانی پی کر پو پھٹتے ہی اس تیزی سے اڑ گئی جس طرح کوئی شکست خوردہ فوج گھبراہٹ اور پریشانی میں معرکہ کارزار سے سراسیمہ ہو کر بھاگ کھڑی ہوتی ہے۔

فعبت غشاشاً ثم ولت کأنہا مع الصبح رکب من احاظۃ مجفل

۴۲ ویں اور ۴۳ ویں شعر میں بڑے دکھ درد کے ساتھ کہتا ہے کہ زندگی میں مجھے کبھی سکھ چین نصیب نہ ہوا، سدا مصیبتیں اور پریشانیاں برداشت کرتے گزر گئی۔ زمانے کے مصائب نے کمر دوہری کر دی ہے۔ میری پسلیوں کا گوشت گل چکا ہے اور صرف ابھری ہوئی ٹیڑھی ہڈیاں رہ گئی ہیں۔ ہاتھ سوکھ کر اکڑ گئے ہیں مگر میں اب ان مصیبتوں اور پریشانیوں کا اتنا عادی ہو چکا ہوں کہ زمین پر بغیر بستر کے جب لیٹتا ہوں اور تکیہ کی جگہ اپنے سوکھے ہاتھ رکھتا ہوں تو مجھے مطلق تکلیف نہیں ہوتی حالانکہ کندھا اور مڑی ہوئی پسلیاں محض ہڈی رہ جانے کی وجہ سے زمین سے نہیں لگ پاتیں۔

وآلف وجہ الارض عند افتراشہا باھدأ تنئیہ سناسن قحل

وأعدل منحوضا کأن فصوصہ کعاب دحاھا لاعب فھی مثل

اس کے بعد کہتا ہے کہ مجھے اس حالت کا کوئی غم نہیں کیونکہ اس کی وجہ سے میری بہادری

یہ صحیح ہے کہ قدماء میں سے اکثر نے شنفری کے اس قصیدہ کا ذکر نہیں کیا ہے اور آخر میں خلف الاحمر کی روایت ہی سے اس کا شہرہ ہوتا ہے۔ مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس دور میں خلف الاحمر ہی وہ راوی ہے جس سے نہ صرف اصمعی جیسا عالم اور جید ناقد بھی روایت کرتا تھا بلکہ بصرہ کے تمام رواۃ بھی اس کی روایت کے رہین منت تھے[1]۔ کیونکہ اس کی روایت کی بنیاد داخلی شہادت پر ہوتی تھی[2] پھر یہ روایت بھی بہت وزنی نہیں ہے کہ اس قصیدہ کی روایت پہلی دفعہ عہد عباسی میں خلف الاحمر نے کی ہے کیونکہ شارح لامیۃ العرب علامہ احمد بن عطار اللہ المصری نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے کہ "یہ قصیدہ عجیب وغریب اور نادر تحفہ ہے۔ امیر المومنین حضرت عمر بن الخطابؓ لوگوں کو اس کی ترغیب دیتے تھے اور اس کے پڑھنے میں سبقت لے جانے پر ابھارتے تھے اور اس کی فضیلت و برتری بتاتے ہوئے لوگوں سے کہتے تھے کہ اپنے بچوں کو شنفری کا قصیدہ پڑھاؤ اس لئے کہ یہ انھیں اخلاق فاضلہ کی تعلیم دیتا ہے"۔ اس بیان کا مطلب یہ ہے کہ عہد خلفائے راشدین تک اس قصیدہ کا اتنا چرچا تھا کہ حضرت عمرؓ جیسے جلالی مزاج کے خلیفہ جنھیں شاید شعر و شاعری سے اتنا لگاؤ بھی نہ تھا محض اس قصیدہ کی اخلاقی افادیت کی وجہ سے بچوں کو پڑھانے کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ اس کے بعد علامہ عطار اللہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ "کہا گیا ہے کہ عبد الملک بن قریب الاصمعی نے جن لوگوں سے اس قصیدہ منجملہ دیوان شنفری کے روایتاً و درایتاً اخذ کیا ہے ان میں امام شافعیؒ بھی شامل ہیں[3]۔ حضرت امام شافعیؒ جیسے جلیل القدر امام اور تمام ائمۂ مذاہب میں سب سے زیادہ شعر و ادب کا ذوق

۱۔ تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ جرجی زیدان ج ۲۔

۲۔ دائرۃ المعارف الاسلامیہ۔

۳۔ مقدمہ شرح لامیۃ العرب لعطار المصری مطبوعہ مطبع محمد محمد مطر الوارق بالحمزاوی

سارے صعالیک کی زندگی ہمارے سامنے کھل کر آجاتی ہے۔

اگر ہم اس قصیدہ پر اس کے انداز بیان اور الفاظ و معانی کے اعتبار سے ناقدانہ نظر ڈالیں تو ہمیں نظر آئے گا کہ اس میں دورِ جاہلی کی شعر و شاعری کی خصوصیات پوری طرح پائی جاتی ہیں۔ اس میں الفاظ کا وہی گمبھیرپن، ثقل اور ندرت ہے معانی میں وہی وضاحت اور سطحیت ہے، اور فخر و حماسہ میں وہی شان و شکوہ اور غزل و وصف نگاری میں وہی سادگی لیکن وہی بانکپن ہے جو شعرائے جاہلیت کا طرۂ امتیاز ہے۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود بعض نقادوں کا خیال ہے کہ لامیۃ العرب درحقیقت شنفری کا کلام نہیں ہے بلکہ عہد عباسی میں خلف الاحمر نے جس کا نام ابو محرز تھا اس قصیدہ کو کہا تھا اور شنفری کے نام سے منسوب کر دیا تھا۔ ان نقادوں کی دلیل یہ ہے کہ اس قصیدہ کا قدماء میں سے کسی نے بھی تذکرہ نہیں کیا ہے اور اگر کسی نے تذکرہ کیا ہے تو ضمناً اور اس شبہ کے ساتھ کہ یہ قصیدہ شنفری کی طرف منسوب ہے۔ شاید اس کا اپنا کہا ہوا نہیں، جیسا کہ ابو علی القالی نے الامالی میں ذکر کیا ہے[1]۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قدماء میں سے اکثر نقادوں اور تذکرہ نگاروں نے شنفری کے اس قصیدہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ چنانچہ ابو الفرج الاصفہانی نے اپنی کتاب الاغانی میں یا ابن قتیبہ نے کتاب الشعر و الشعراء میں، یا جاحظ نے کتاب البیان و التبیین میں یا عبدالسلام الجمحی نے طبقات فحول الشعراء میں اس قصیدہ کی کوئی نشاندہی نہیں کی ہے[2]۔ مگر بعد میں اس قصیدہ کا بڑے دھوم دھام سے شہرہ ہوتا ہے اور زبان زد خاص و عام ہو جاتا ہے اور اسی وجہ سے اس کی صحت پر شبہ پیدا ہوتا ہے۔

۱۔ کتاب الامالی لابی علی القالی ج ۱ ص ۱۰۷ منشورات المکتب الاسلامی ۔ مکۃ المکرمۃ

۲۔ ابن قتیبہ نے صرف اس کا وہ شعر نقل کیا ہے جو اس نے گرفتاری کے بعد شعر کہنے کی فرمائش پر کہا تھا۔ شعر پہلے گزر چکا ہے۔

ہوئے۔ ابوسفیان ٹال گئے کہ مبادا دونوں میں سے کوئی ایک قریش کا مخالف ہوجائے اور فساد برپا ہو۔ ابوسفیان کے انجان ہوجانے پر یہ دونوں ابوالحکم عمرو بن ہشام مخزومی کے یہاں پہنچے۔ مگر ابوالحکم بھی اپنا فیصلہ صادر کرنے پر تیار نہیں ہوا۔ پھر انھوں نے قبیلہ ثقیف کے دو تین شیوخ سے خواہش کی کہ وہ ان دونوں کی نزع کا دوٹوک فیصلہ کر دے۔ کیونکہ قریش کے بعد ثقیف ہی سارے عرب میں معزز سمجھے جاتے تھے۔ مگر یہ لوگ بھی دونوں میں سے کسی ایک کو فاضل قرار دے کر مفضول کا نشانہ ملامت بننا نہیں چاہتے تھے۔ آخر کار یہ ہرم بن قطبہ بن سناں فزاری سے رجوع ہوئے (وہی جس سے عمرؓ نے سوال کیا تھا۔)

ہرم نے عامر اور علقمہ دونوں سے وعدہ لیا کہ وہ اس کے فیصلہ کو بے چون وچرا مان لیں گے۔ فیصلہ کے بعد کوئی بھی فخر یا ہجو نہیں کرے گا۔ جب پیمان پکا ہوگیا تو ہرم نے کہا مجھے چند روز کی مہلت دو۔ میں دونوں کے کارناموں پر اچھی طرح غور کروں گا۔ دونوں راضی ہوگئے۔

ایک رات ہرم نے عامر کو طلب کیا۔ تنہائی میں اس سے کہا تم جن کارناموں پر فخر کرتے ہو وہ تقریباً سب کے سب علقمہ میں موجود ہیں۔ پھر یہ بھی توسوچو تم دونوں کا جداعلیٰ ایک ہی تھا۔ آخر تم کس خصوصیت کی وجہ سے علقمہ پر فوقیت رکھتے ہو؟

عامر نے ہرم کی یہ بات سنی تو اس کو یقین ہوگیا کہ یہ ضرور مجھ پر علقمہ کو ترجیح دے گا۔ چناں چہ وہ کچھ جواب دیئے بغیر اپنا سامنہ لیکر اپنے خیمہ کو واپس ہوا۔

دو تین دن کے بعد ہرم نے علقمہ کو طلب کیا۔ تنہائی میں اس سے وہ کچھ کہا جو وہ عامر سے کہہ چکا تھا۔ چناں چہ علقمہ نے بھی یقین کر لیا کہ وہ مجھ پر عامر کو ترجیح دے گا۔ یہ بھی نظریں جھکائے اپنے خیمہ لوٹا۔

دونوں سے اس طرح گفتگو کرنے کے بعد ہرم نے اپنے بھتیجوں بھانجوں سے کہا: جب میں اپنا فیصلہ سنادوں تو تمھیں چاہیئے کہ فوراً دس اونٹ عامر کی طرف سے اور دس اونٹ علقمہ کی طرف سے ذبح کرکے سب حاضرین کی ضیافت کریں۔

ادبی مصادر میں آثار عمرؓ بن
آثار عمرؓ
(۲)

جناب ڈاکٹر ابوالنصر محمد خالدی صاحب پروفیسر شعبۂ تاریخ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

منافرہ محولہ کی شرح۔

عرب قبل اسلام کے قبائلی معاشرہ کی ایک خصوصیت نُفُورہ ۔ منافرہ بھی تھی۔ اس سے مراد دو شخصوں کا ایک تیسرے شخص کے روبرو بھرے مجمع میں اپنے اور اپنے آباء و اجداد کی ستائش کے قابل کارنامے بیان کرنا اور ثالث ـــ حَکَم سے یہ فیصلہ چاہنا کہ وہ کس کو کس سے برتر و بہتر سمجھتا ہے۔ ایسی محفل منافرہ اس لئے کہلاتی تھی کہ فخر کرنے والا بات شروع کرتا ہی اس جملہ سے تھا: اَیُّنَا اَعَزُّ نَفَراً۔ بتاؤ ہم دونوں میں کمی و کیفی دونوں لحاظ سے کون زیادہ شریف و قوی ہے؟

اس زمانے میں منافرے اس کثرت سے ہوتے تھے کہ قریش نے مکہ میں جو سیاسی نظم قائم کیا تھا اس میں "حکومت" یعنی ثالثی ایک مستقل شعبہ (وزارت) قرار پایا۔ اس کے عہدہ دار نسلاً بعد نسلٍ قریش کی شاخ بنو سہم سے ہوتے تھے۔ (۱)

آغاز اسلام سے چند سال قبل جو منافرے ہوئے ان میں وہ منافرہ بہت مشہور ہے جو عامر بن طفیل بن مالک عامری اور علقمہ بن علاثہ بن عوف کے درمیان ہوا۔

عامر اور علاثہ میں جھگڑا ہوا۔ یہ دونوں ابوسفیان صخر بن حرب بن امیہ سے رجوع

ملحوظہ : عمرؓ کے اس فعلی اثر سے آپ کی مردم شناسی کا اندازہ ہوتا ہے۔

۱۲ علبار سدوسی کی ایک آنکھ جاتی رہی تھی ۔ شکل وصورت جاذبِ نظر اور دلکش نہیں تھی۔ یہ اپنی ایک ضرورت عمرؓ کے یہاں لے آئے ۔ عمرؓ نے علبار کی لیاقت دیکھی۔ ان کا ابہام و اشکال سے پاک و واضح کلام سنا تو آگے بڑھے ۔ اوپر نیچے نظر ڈال کر غور سے دیکھا اس طرح کہ علبار خوشی سے پھول گئے۔

جب علبار واپس ہوئے تو عمرؓ نے ایک ضرب المثل دہرائی ۔ اس کا مطلب تھا : آدمی کی بینش و دانش اس کے ساتھی سے پہچانی جاتی ہے۔

البیان والتبیّن ۔ ج ۱ ص ۲۳۸ د باختلاف خفیف

یہی کتاب ج ۳ ص ۲۹۹

تشریح : عمرؓ نے جو ضرب المثل کہی وہ وہاں اس وقت بولی جاتی تھی جب کوئی گروہ اپنا سردار کسی ایسے شخص کو بناتا جس کی خردمندی و دانش وری چھپی ڈھکی نہیں بلکہ جانی پہچانی ہوتی تھی ۔

۱۳ محمد بن حفص بن عمر تیمی کہتے ہیں : عمرؓ شعر کے بہت بلند پایہ عالم و ناقد تھے ۔ مگر جب نجاشی وعجلانی یا حطیئہ وزبرقانی کے درمیان حکم بننے کی آزمائش میں پڑے تو فریقین سے کسی کا ہدف بننا آپ کو نہایت ناگوار ہوا اس لئے ان کے بارے میں شہادت دینے کے لئے حسّان اور ان جیسے ایسے لوگوں کو طلب کیا جنھیں حطیئہ ونجاشی کے ڈرانے دھمکانے کی کوئی پرواہ نہیں تھی (کہ اگر ان میں سے کوئی حَکَم کی ہجو کر ڈالے تو تردیداً یہ بھی ہجو کر ڈالتے) یہ لوگ شاعروں کا کلام سنتے تو حسب صوابدید اپنی رائے دیدیتے ۔ جب حسّان جیسے سخن فہم کی رائے ظاہر ہوجاتی اور فریقین کے لئے تشفی بخش ہوتی تو خود آپ اپنا پہلو صاف بچا جاتے۔

مگر جس شخص کو عمرؓ کی سخن سنجی وسخن فہمی کا حال معلوم نہ ہوتا اور وہ یہ دیکھتا کہ آپ فلاں وفلاں سے پوچھ رہے ہیں تو وہ خیال کرتا کہ آپ شعر کے حسن وقبح اور اس کی قدر وقیمت

ہرم نے ایک روز صبح ہی صبح ایک عام جلسہ طلب کیا۔ فیصلہ سننے کے مشتاق افراد جوق در جوق جمع ہوئے تعداد دو ہزار سے زائد ہی تھی۔ ہرم نے کھڑے ہو کر باآواز بلند اعلان کیا کہ عامر علقمہ دونوں ہی ایک دوسرے کے ہم پایہ وہم درجہ ہیں۔

اعلان ہوتے ہی ہرم کے بھتیجوں بھانجوں نے جھٹ پٹ عامر و علقمہ کی طرف سے دس دس نہایت فربہ اونٹ ذبح کئے۔ حاضرین ضیافت سے محظوظ ہوئے اور سب کے سب مسرور اپنے ٹھکانے لوٹے۔(۲)

اس واقعہ کے بعد پھر دونوں میں کبھی ناچاقی نہیں ہوئی تاآں کہ ہادی صلعم نے للکارا: اللہ جل شانہ کہتا ہے: لوگو! ہم نے تم کو مرد اور عورت سے پیدا کیا۔ پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ حقیقت میں اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہی ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔(۳)

(۱) العقد الفرید۔ لابن عبدربہ م ۳۲۷۔ مصر۔ ۱۳۶۱۔ ج ۳ ص ۳۱۳

(۲) الاغانی۔ ج ۱۵ ص ۵۰ جاری

(۳) سورۃ الحجرات

۱۱ عمرؓ نے عراقی وفد میں ابو بحر صخر احنف کو دیکھا۔ وہ ایک موٹی سی چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ آپ نے وفد کے دوسرے سرداروں کو نظر انداز کیا۔ احنف سے کہا کہ وہی گفتگو شروع کریں۔

آپ نے احنف کا کلام سنا۔ اس میں خوبی پائی۔

احنف نے اس موقع پر دل نشین، صاف و واضح کلام کیا۔ اختصار و اسہاب دونوں سے بچتے ہوئے معتدل مسلک اختیار کیا۔ اس وقت سے احنف آپ کی نظر میں بلند پایہ رہے تاآں کہ وہ اپنی قوم کی ریاست پر فائز ہوئے۔ الخ

البیان والتبیین۔ ج ۱ ص ۲۳۷

۱۶ ابوقیس اوس جاہلی دور کا شاعر ہے۔ اوس و خزرج کی ایک جنگ میں اس نے نمایاں حصہ لیا۔ واپس ہوا تو اپنی اہلیہ کو مخاطب کر کے فی البدیہہ ایک قصیدہ سنایا۔ اس میں ایک بیت وہ تھی جس کا مطلب ہے: خوف و زباں بندی و لالچ سے قوت و دانائی بہرحال بہتر ہے۔

عمرؓ کو یہ قصیدہ سنایا جا رہا تھا۔ آپ خاموش سنتے جا رہے تھے۔ راوی نے جب وہ شعر سنایا جس کا خلاصہ مطلب اوپر بیان ہوا تو آپ نے پوری بیت کئی بار دہرائی۔ اس کی داد دی۔

البیان والتبیین۔ ج ۱ ص ۲۴۱

تشریح اخبار و آثار نشان ۱۳

عجلان و نجاشی کے واقعہ کا خلاصہ یہ ہے:

۱۳۔ نجاشی یعنی قیس بن عمر حارثی اور تمیم بن اُبَیّ بن مقبل عجلانی دونوں شاعر تھے اور ہم عصر بھی۔ نجاشی طبعاً آزاد منش تھا۔ کوفہ میں شراب نوشی کی پاداش میں سزا بھی پائی تھی۔ بنو عجلان کی ہجو کہہ ڈالی۔ یہ لوگ عمرؓ کے یہاں فریادرس ہوئے آپؓ نے پوچھا اس نے کیا کہا:

عجلانی نے کہا: جب اللہ کسی قابل ملامت و کم زور گروہ سے ناراض ہوتا ہے تو وہ ابن مقبل کے قبیلہ بنو عجلان ہی سے ناخوش ہوتا ہے۔

عمرؓ: اس نے بس ایک دعا کی ہے۔ اگر وہ مظلوم ہے تو دعا قبول ہوگی اور اگر ظالم ہے قبول نہیں ہوگی۔ اس میں ہجو کی کیا بات ہے؟

عجلانی: یہ سنئے! یہ تو ایک چھوٹا سا ناقابل التفات قبیلہ ہے۔ جو کام اس کے سپرد کیا ہے وہ پورا کرتا ہے۔ ذرا سی کوتاہی بھی نہیں کرتا۔ یہ کسی پر تل برابر بھی زیادتی نہیں کرتے۔

عمرؓ: خدا کرے میرے والد کے سارے اہل و عیال ایسے ہی ہوں کہ ظلم کریں اور نہ اس سے کترائیں۔

سے ناواقف ہیں سخن سنجوں سے دریافت کر رہے ہیں۔

جب زبرقان نے حطیئہ کے خلاف عمرؓ کی جناب میں اپنی شکایت پیش کی تو آپ نے حطیئہ کی زبان کاٹنے کا حکم دیا۔ زبرقان نے الفاظ کے ظاہری معنی لیئے اور عمرؓ سے استدعا کی: امیرالمومنین! اگر اس کی زبان کاٹنا ہی ہے تو میرے گھر میں نہ کاٹی جائے (شاعری کی خیالی بات اور ہے۔ میرے گھر میں ایسی شدید جسمانی سزا پانے سے تو میں ہمیشہ کے لئے بدنام ہو جاؤں گا) زبرقان کو سمجھایا گیا کہ اس سے امیرالمومنین کی مراد بخشش کی امید اور سزا کے خوف کے ذریعہ حطیئہ کو خاموش کرنا ہے کہ وہ آئندہ شعر میں بھی کوئی نازیبا بات زبان سے نہ نکالے۔

البیان والتبیین ج ۱ ص ۲۲۹ جارمی ج ۲ ص ۳۱۸

۱۴ ایک مرتبہ عمرؓ کو زہیر کا باسٹھ ابیات والا قصیدۂ ہمزیہ سنایا گیا اس میں ایک بیت کا مطلب تھا: ثبوت حق کو قطعیت دینے الے تین امور ہیں۔ حق دار قسم کھائے یا کسی کو حکم بنائے اور اس کا فیصلہ قبول کرے یا پھر ایسی شہادت پیش کرے کہ حق (کا واجبی ہونا) واضح ہو جائے۔ راوی قصیدہ سناتے سناتے جب درج بالا مضمون کے شعر پر پہنچا تو آپؓ اس کو بار بار دہراتے رہے۔ اس طرح آپ نے حقوق کی قسمیں اور ان کے فیصل ہونے کے طریقوں سے شاعر کی واقفیت اور اس کے فنکارانہ اظہار کی تحسین کی۔

البیان والتبیین ج ۱ ص ۲۴۰

۱۵ عمرؓ کو عبدۃ متوفی سنہ تیرہ ہجری کا اکاسی ابیات والا طویل لامیہ سنایا گیا۔ سنانے والا جب اس شعر پر پہنچا جس کا مطلب تھا ـــ انسان کسی چیز کو حاصل کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے لیکن حاصل کرنے نہیں پاتا۔ اور زندگی بجز حرص و درستی احوال یا آرزوؤں ارمانوں کے سوا اور کیا ہے ـــ تو آپ نے بطور تحسین ثانی مصرع کئی بار دہرایا۔

البیان والتبیین ج ۱ ص ۲۴۰ وباختلاف خفیف الحیوان ج ۳ ص ۴۶

مقامات خیر از مولانا شاہ ابوالحسن زید فاروقی، تقطیع کلاں، **ضخامت ۸۰۰ صفحات**، کتابت وطباعت اعلیٰ، قیمت مجلد درج نہیں۔ پتہ: درگاہ شاہ ابوالخیر، شاہ ابوالخیر مارگ، دہلی - ۶

حضرت شاہ محی الدین عبداللہ ابوالخیر مجددی فاروقی رحمۃ اللہ علیہ سلسلۂ مجددیہ کے ایک نہایت بلندپایہ عالم اور صاحب طریقت ومعرفت بزرگ تھے جو دلی میں آکر مقیم ہوگئے تھے اور یہیں ۱۹ فروری ۱۹۲۳ء کو وفات پائی، دلی کے بازار چتلی قبر میں درگاہ شاہ ابوالخیر آپ کے ہی نام سے منسوب اور مرجع عوام وخواص ہے، یہ کتاب آپ کے ہی حالات وسوانح میں ہے، چونکہ اس کے مصنف خود حضرت شاہ صاحب کے فرزند ارجمند ہیں جو الولد سرّ لابیہ کے مطابق علم وفضل، وسعت مطالعہ، دقّت نظر، ورع وتقویٰ اور اخلاق وشمائل میں پدر بزرگوار کے صحیح جانشین ہیں اس لئے ظاہر ہے اس کتاب کے لکھنے کا حق آپ کے سوا اور کس کو پہونچ سکتا تھا۔ چنانچہ جو جامعیت، جزئیات کا استیعاب و استقصا اور مستند معلومات اس کتاب میں ہیں اس موضوع پر کسی دوسری کتاب میں ہرگز نہیں ہوسکتیں۔ حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی نویں پشت میں شاہ ابوالخیر صاحب کے جد امجد تھے اس لئے کتاب دو حصوں میں تقسیم ہے، پہلے حصہ میں حضرت مجدد سے لے کر شاہ محمد عمر (والد ماجد شاہ ابوالخیر صاحب) تک سلسلہ وار نو بزرگوں کے حالات وسوانح، فضائل ومناقب اور علمی کمالات بیان کئے گئے ہیں، اس کے بعد دوسرا حصہ صاحب سوانح شاہ ابوالخیر صاحب کے تذکرہ و ترجمہ کے لئے مخصوص ہے، اس میں شاہ صاحب کے حالات وسوانح، علمی وعملی کمالات، عبادات وریاضات،

عجلانی: اس کے متعلق کیا کہیں گے: بنو عجلان کے لوگ پانی لینے چوری چھپے رات کے وقت آتے ہیں جب کہ پانی لینے والے پانی لے کر اپنے اپنے گھر لوٹ جاتے ہیں۔

عمرؓ: اچھا ہے۔ اس سے بھیڑ کم ہوتی ہے۔ دھکا پیل بھی نہیں ہونے پاتی۔

عجلانی: کیا یہ ہجو نہیں ہے کہ ــــ بنو عجلان کے گوشت پر سدھائے کتے بھی نہیں لپکتے وہ تو صرف بنو کعب و نہشل جیسے معزز قبیلوں پر جھپٹتے ہیں۔

عمرؓ: بنو عجلان نے اپنے مُردوں کو گہرا دفن کر دیا۔ ان کو بے حرمت نہیں ہونے دیا یہ تو بہت خوب ہوا۔

عجلانی: اور اس کی بابت آپ کیا کہیں گے! بنو عجلان کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ: دوسرے سرداران کے افراد سے کہتے ہیں اے کنڈا لے، دودھ دوھ، جلدی جلدی دوھ۔ دوہنے میں سستی نہ کر (عجلت کر)

عمرؓ: قوم کا بہترین آدمی تو وہی ہے جو سب کی خدمت کرے ہم سب تو اللہ ہی کے بندے ہیں۔

عجلانی: کیا ہم ایسے ہیں کہ وہ یہ کہے: یہ تو ان لوگوں کے بھائی بند ہیں جن پر پھٹکار پڑتی ہے۔ یہ کمینوں کا نمونہ ہیں۔ یہ دراصل ایک بھیڑ ہے حقیروں اور راندوں کی!

اس کی عمرؓ کوئی تاویل نہیں کر سکے۔ حسّان کو بلایا۔ وہ حاضر ہوئے ان سے ان شعروں کی بابت رائے لی۔ حسّان نے کہا: ہجو۔ اس نے تو عجلانی پر گندگی کی کنڈی انڈیل دی۔

یہ فیصلہ سن کر عمرؓ نے نجاشی سے کہا خبردار! اگر پھر کبھی تیرے منہ سے ایسی بات نکلی تو تیری زبان ہی کٹوا دوں گا۔

نجاشی نے بھی توبہ کی پھر کبھی اس سے ایسی بات سرزد نہیں ہوئی۔

یہ واقعہ متعدد کتابوں میں مذکور ہے۔ درج بالا بیان عبداللہ ابن قتیبہ م ۲۷۶ کی کتاب الشعر والشعراء سے لیا گیا ہے۔

(باقی)

تمام مضامین اس کتاب میں یکجا کر دیے ہیں جو تعداد میں ۴۳ ہیں ، علاوہ ازیں "حدیث دیگراں" کے زیر عنوان مشاہیر ارباب قلم وتنقید کی وہ تمام تحریریں بھی اس کتاب میں شامل کر دی گئی ہیں جو مرحوم کی شخصیت یا اُن کے ادب و انشا سے متعلق ہیں۔ شروع میں مرحوم کے فرزند ارجمند (جواب خود بھی مرحوم ہو گئے) سید ابن علی صاحب بدایونی نے اپنے والد ماجد کے حالات وسوانح دلچسپ اور شگفتہ اندازِ بیان میں لکھے ہیں ، اب اگرچہ اردو ادب وانشا اور طنز نگاری کا کچھ اور ہی ڈھنگ ہے اور اُس نے غیر معمولی ترقی کی ہے لیکن اتنی مدت گزر جانے پر بھی ان پھولوں کا رنگ اور اُن کی بو باس پرانی نہیں ہوئی ، تاریخِ ادب کا تو کوئی طالب علم ان سے بے نیاز ہو ہی نہیں سکتا۔ عام قارئین بھی اس کے مطالعہ سے محظوظ وشادکام ہوں گے۔ مرحوم کے مضامین کا ایک مجموعہ پہلے بھی شائع ہو چکا ہے لیکن یہ زیادہ جامع اور مکمل ہے۔

علمی، ادبی اور تعلیمی ادارے (برصغیر ہند و پاک کے) مرتبہ جناب ابوسلمان شاہجہانپوری جناب امیر الاسلام صدیقی ، تقطیع خورد . ضخامت ۳۴۸ صفحات ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت درج نہیں۔ پتہ : گورنمنٹ نیشنل کالج ، کراچی۔

یہ کتاب گورنمنٹ نیشنل کالج کے میگزین "علم و آگہی" کا خصوصی شمارہ ہے جو بڑے سلیقہ اور خوش اسلوبی سے مرتب کیا گیا ہے ، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ، اس میں برصغیر کے علمی، ادبی اور تعلیمی اداروں کا تذکرہ خالص مورخانہ نقطۂ نظر سے کیا گیا ہے یہ خصوصی شمارہ کی پہلی جلد اور ۳۵ اداروں کی تاریخ پر مشتمل ہے ، مضامین لکھنے والوں میں کالج کے طلباء اور طالبات کے علاوہ کالج کے اساتذہ اور بعض مشہور اربابِ قلم بھی شامل ہیں ، مضمون بڑی کاوش اور محنت وتلاش سے لکھا گیا ہے ، ان اداروں کی اب تک کوئی تاریخ نہیں تھی ، اس راہ میں یہ پہلا قدم ہے جو سزاوار تحسین و آفرین ہے ، اس سلسلہ میں برصغیر کے مسلمانوں کی گذشتہ ایک صدی کی تہذیبی، علمی اور ادبی سرگرمیوں اور

اوراد و اشغال، ارشادات و فرمودات، ارشاد و ہدایات، اندرون خانہ اور بیرون خانہ مشاغل، اسفار، اخلاق، تصنیفات وتالیفات، مریدین ومتعلقین، خلفاء ومسترشدین، اولاد و احفاد، مرض اور وفات، یہ سب امور نہایت بسط وتفصیل اور تحقیق وکاوش سے لکھے گئے ہیں، اصل موضوع کے علاوہ بیسیوں افراد و اشخاص سے متعلق بھی ضمنی طور پر اکثر و بیشتر حواشی میں اور کہیں کہیں متن میں بھی نہایت مفید اور قیمتی معلومات آگئے ہیں، جو کچھ لکھا ہے حوالہ سے اور استناد کے ساتھ لکھا ہے، زبان وبیان شگفتہ رواں اور دلچسپ ہے، اس لئے کتاب تاریخی اور دینی و ادبی حیثیت سے بہت مفید، پر از معلومات اور بصیرت افروز ہے، اس کا مطالعہ ہم خرما وہم ثواب کا مصداق ہوگا۔

طنزیات ومقالات مرتبہ جناب محمد محی الدین بدایونی، تقطیع متوسط، ضخامت چھ سو صفحات، کتابت وطباعت اعلیٰ، قیمت -/۲۵، پتہ: انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ، کراچی۔ ۱

سید محفوظ علی بدایونی مرحوم علی گڑھ کے پرانے اولڈ بوائے مولانا محمد علی مرحوم کے ساتھیوں میں سے تھے۔ بلا کے ذہین وطباع، بذلہ سنج اور اردو زبان کے طنز نگار اور ادیب تھے، اگرچہ صورت اور سیرت کے اعتبار سے نہایت ثقہ اور صحیح معنی میں مرد مومن تھے مگر طبیعت بے حد شوخ و شنگ پائی تھی۔ بات بات میں ضلع جگت کے پھول کھلاتے اور فقرہ فقرہ میں نہایت لطیف ظرافت ومزاح کا جادو جگاتے تھے۔ عمر کا بیشتر حصہ خانہ نشینی اور اپنی زمینداری کی دیکھ بھال میں بسر کر دیا۔ انھوں نے اگرچہ کوئی مستقل کتاب اپنی یادگار نہیں چھوڑی، لیکن وقتاً فوقتاً مختلف رسالوں اور اخبارات میں نام بدل بدل کر چھوٹے بڑے مضامین لکھتے رہے، عجب طرز نگارش پایا تھا۔ جو چیز قلم سے نکل گئی ادب اور بلاغت کی انگشتری کا نگینہ اور عروس انشا کے ماتھے کا جھومر بن گئی، بڑی مسرت کی بات ہے کہ لائق مرتب نے محنت شاقہ اور تلاش بسیار کے بعد مرحوم کے یہ

اُن کے کارناموں کی مختصر رُوداد بھی قلمبند ہو گئی ہے، اس میں شک نہیں کہ یہ نمبر ایک کالج میگزین کے خصوصی نمبر کی توقعات سے کہیں زیادہ ہے۔ میگزین کا عملۂ ادارت بہمہ وجوہ ہماری مبارک باد کا مستحق ہے۔

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

مرتبہ

سعید احمد اکبر آبادی

برہان

جلد ۷۴ | ماہ ربیع الآخر ۱۳۹۵ھ مطابق مئی ۱۹۷۵ء | شمارہ ۵

فہرست مضامین

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ اسلام کا اقتصادی نظام۔ قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ۔
تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام۔ سوشلزم کی بنیادی حقیقت۔

سنہ ۱۹۴۰ء غلامانِ اسلام۔ اخلاق و فلسفۂ اخلاق۔ فہم قرآن۔ تاریخِ ملت حصہ اول "نبی عربی صلعم"۔ صراطِ مستقیم (انگریزی)

سنہ ۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول۔ وحی الٰہی۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول۔

سنہ ۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات)
مسلمانوں کا عروج و زوال۔ تاریخِ ملت حصہ دوم "خلافتِ راشدہ"۔

سنہ ۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد اول۔ اسلام کا نظامِ حکومت۔ تاریخِ ملت حصہ سوم "خلافتِ بنی امیہ"

سنہ ۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم۔ لغات القرآن جلد دوم۔ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت (کامل)

سنہ ۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم۔ قرآن اور تصوف۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کیے گئے)

سنہ ۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اول۔ خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ۔ جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو۔

سنہ ۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظمِ مملکت۔ مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم۔ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلوی۔

سنہ ۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم۔ تاریخِ ملت حصہ چہارم "خلافتِ ہسپانیہ"۔ تاریخِ ملت حصہ پنجم "خلافتِ عباسیہ اول"

سنہ ۱۹۴۹ء قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے (کامل)
تاریخِ ملت حصہ ششم "خلافتِ عباسیہ دوم" لغات القرآن جلد چہارم۔

سنہ ۱۹۵۰ء تاریخِ ملت حصہ ہفتم "تاریخِ مصر و مغربِ اقصیٰ"۔ تدوینِ قرآن۔ اسلام کا نظامِ مساجد۔
اشاعتِ اسلام یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا۔

سنہ ۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم۔ عرب اور اسلام۔ تاریخِ ملت حصہ ہشتم "خلافتِ عثمانیہ"۔ تاریخ پر ایک نظر۔

سنہ ۱۹۵۲ء تاریخِ اسلام پر ایک طائرانہ نظر۔ فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اول (جس کو از سرِ نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ کتابت حدیث۔

سنہ ۱۹۵۳ء تاریخِ مشائخ چشت۔ قرآن اور تعمیرِ سیرت۔ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ۔

گیا۔ ان کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ انھوں نے اربوں اور کھربوں روپیہ سے ضرور تمند عرب اور دوسرے اسلامی ممالک کی بے تحاشا مدد کی، دنیا میں جہاں کہیں بھی مسلمان آباد ہیں اِن پر اُن کی نگاہ رہتی اور اُن کے فوز و فلاح کی تدبیر کرتے رہتے تھے۔

مرحوم نہایت محنتی، فرض شناس اور حد درجہ بیدار مغز اور روشن خیال فرمان روا تھے اسلامی اور دینی علوم و فنون کے ساتھ علومِ جدیدہ اور سائنس و ٹکنالوجی کی اعلیٰ تعلیم کی اہمیت و ضرورت کا انھیں پورا الیقین تھا۔ دنیا کے معاشی اور اقتصادی مسائل پر ان کی نگاہ مبصرانہ تھی، اس سلسلہ میں عرب بنک کا قیام ان کا ایک عظیم کارنامہ ہے، اسلاف کے علمی کارناموں (جسے التراث الاسلامی کہتے ہیں) کے احیا سے انھیں بڑی دلچسپی تھی، چنانچہ ۶۷ء میں ہندوستان کے حج ڈیلی گیشن کے ساتھ راقم الحروف نے ایک خصوصی ملاقات میں تفسیر سفیان ثوری مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی اور مسند حمیدی مرتبہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی کا تذکرہ کیا تو شاہ مرحوم بیحد مسرور ہوئے، اس سلسلہ میں دو چار سوالات کئے اور ہمارے سفیر ہند جناب قدوائی صاحب سے شکایت کی کہ انھوں نے اب تک یہ دونوں کتابیں اُن کو نہیں پہونچائی ہیں۔

غرض کہ ان کے کس کس وصف اور خوبی کا ذکر کیا جائے، اس کے لئے ایک مستقل کتاب درکار ہے، وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے، ان کی شخصیت ایک گلشنِ رنگ و بو اور مینارۂ عظمت و بزرگی تھی، بَرَّدَ اللہ مضجعَہٗ و نوّر مرقدہٗ

وما كان قيسٌ هلكُهُ هلكُ واحدٍ
ولكنّهٗ بنيانُ قومٍ تهدّما

نظرات

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ

گزشتہ مہینہ شاہ فیصل کا حادثہ، شہادت موجودہ حالات میں عالم اسلام کا سب سے
المیہ ہے جس کی شدت کو ایک مدت تک فراموش نہ کیا جا سکے گا۔ مرحوم اس زمانہ میں عالم اسلا
کی آبرو، عزت و وقار اور تمکنت تھے، قدرت نے انھیں سوز اور ساز دونوں نعمتوں سے نوا
تھا۔ وہ کہنے کو خادم حرمین شریفین تھے، لیکن درحقیقت وہ پاسبان و نگہبانِ حرمِ اسلام تھے
نورِ ایمان و یقین ان کا جوہرِ ذاتی، تعامل بالکتاب و السنۃ ان کا آئینِ حقیقی، فہم و فراست، ا
تدبر و دوراندیشی ان کی طبیعت کے گوہر آبدار تھے، مرحوم کی سربراہی کی مدت گیارہ برس
زیادہ نہیں ہے، اور یہ وہ زمانہ ہے جب کہ عالمِ اسلام اندرونی اور بیرونی اسباب وعوا
کے باعث شدید کشمکشِ امید و بیم سے دوچار تھا اور اس کے سر پر اضطراب و تشویش کی تیا
مچل رہی تھیں، لیکن شاہ فیصل کی قائدانہ بصیرت و بصارت نے وہ معجزہ نمائی کی کہ عالمِ ا
ہوگیا، امریکہ جو اس وقت دنیا کی سب سے بڑی طاقت و قوت ہے اور سیاستِ فرنگ" — جو ا
دور کا سب سے بڑا حربہ ہے، دونوں نے اس طرح سپر افگنی کی کہ روس اور امریکہ کے بجائے عالم
نظریں شاہ کی جنبشِ مژگان و آبرو پر مرتکز ہوگئیں، اور امریکہ کے ٹائمز وغیرہ کو تسلیم کرنا
کہ اس زمانہ کا سب سے بڑا سیاسی اور طاقتور انسان شاہ فیصل ہیں، یہ انھیں کا حوصلہ
کہ عرب کی طاقت کا لوہا دنیا سے منوا لیا۔ انھوں نے عرب ممالک میں اتحاد پیدا کیا، ان
خود اعتمادی سکھائی، عرب قومیت کی لعنت سے نجات دلا کر انھیں صراطِ مستقیم پر گا

عہد نبوی کے غزوات وسرایا اور ان کے مآخذ پر ایک نظر

(۹)

سعید احمد اکبر آبادی

جنگ شروع ہوتی ہے

صفوں کی ترتیب و تنظیم اور ان کی تلقین و تعلیم سے فارغ ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر کے ساتھ عریشہ میں تشریف لے گئے تو اب جنگ کے شروع ہونے کا وقت آیا۔ ابن اسحق کی روایت کے مطابق لشکر قریش کی طرف سے سب سے پہلے اسود بن عبدالاسود المخزومی جو نہایت بہادر اور جان پر کھیل جانے والا تھا اچانک صف سے باہر نکلا اور درانہ اسلامی صفوں میں گھس آیا۔ حضرت حمزہ بن عبدالمطلب نے جھپٹ کر اس پر تلوار کا ایسا شدید وار کیا کہ نصف پنڈلی سمیت اس کا پاؤں کٹ گیا۔ لیکن اس حالت میں بھی وہ کودا اور حوض کی طرف لپکا جہاں پہونچنے کی اس نے قسم کھا رکھی تھی، اب حضرت حمزہ نے پلٹ کر اس پر دوسرا وار اس زور کا کیا کہ حوض کے اندر اس کا کام تمام ہو گیا۔ مخزومی کے قتل نے جنگ کی آگ بھڑکا دی، چنانچہ اب لشکر قریش کی طرف سے تین بہادر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جد امجد عبد مناف کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، یعنی شیبہ بن ربیعہ، عتبہ بن ربیعہ اور ولید بن عتبہ ایک ساتھ باہر نکلے اور عرب کے قاعدہ کے مطابق مبارزت طلب کی، اس چیلنج

افسوس ہے پچھلے مولانا عامر عثمانی اڈیٹر تجلی دیوبند کا بھی غریب الوطنی میں قلب کا دورہ پڑنے سے اچانک انتقال ہوگیا، مرحوم مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی کے برادر عم زاد تھے دار العلوم دیوبند سے فراغت پائی تھی، ذہانت وطباعی اور شعر وادب کا ذوق اس خاندان کی خصوصیت ہے، مرحوم کو بھی اس سے بہرہ وافر ملا تھا۔ چنانچہ اردو زبان کے نغز گو شاعر بھی تھے اور ایک صاحب طرز ادیب بھی، شگفتہ نگاری کے ساتھ قلم بیحد شوخ اور بیباک تھا۔ تنقید میں لگی لپٹی کچھ اٹھا کے نہیں رکھتے تھے اور اس اعتبار سے اس شعر کا مصداق تھے

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانہ میں

لیکن تنقید بڑی محنت اور کثیر مطالعہ کے بعد کرتے تھے، مذہبیات میں طنز نگاری ان کی ایجاد تھی، اللہ تعالیٰ کمزوریوں سے عفو و درگزر فرما کر مغفرت وبخشش کی نعمتوں سے سرفراز فرمائے۔ آمین۔

ضرب کاری لگائی کہ وہ اسے سہار نہ سکا، تڑپ کر گرا اور ختم ہو گیا[1] لیکن حضرت عبیدہ بھی شدید زخمی ہو گئے تھے، حضرت حمزہ اور علی انھیں اٹھا کر اسلامی کیمپ میں لے آئے، اس وقت درد و کرب کا یہ عالم تھا کہ ان کی کٹی ہوئی ران سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا تھا۔ لیکن اس پر بھی فکر تھی تو شہادت کی، رحمت عالم کے سامنے آئے تو سر حضور کے قدموں پر رکھ دیا اور عرض پرداز ہوئے: یا رسول اللہ! میں ان زخموں سے مرگیا تو شہادت کا درجہ ملے گا؟ سرورِ کائنات نے فرمایا: کیوں نہیں! ضرور! اب ان میں امنگ پیدا ہوئی اور فخر سے بولے: آج اگر ابوطالب مجھے دیکھ لیتے تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ ان کے اس شعر کا مصداق میں ہوں:

وَنُسَلِّمُهٗ حَتّٰى نُصَرَّعَ دُوْنَهٗ ۔۔۔ وَنَذْهَلُ عَنْ اَبْنَائِنَا وَالْحَلَائِلِ

ترجمہ: ہاں! اے اہلِ قریش! ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس وقت تک تمھارے حوالہ نہیں کریں گے جب تک ہم سب ان کی مدافعت کرتے ہوئے پچھڑ کر گر نہیں پڑیں گے اور اپنی آل اولاد اور بیویوں سے غافل نہیں ہو جائیں گے، آخر زخموں کی تاب نہ لا کر جب مسلمان مدینہ لوٹ رہے تھے وادی الصفراء میں وہ جاں بحق ہو گئے۔

اس کے بعد عبیدہ جو سعید بن العاص کا بیٹا تھا بڑی آن بان سے صف سے باہر نکلا اور پکار کر بولا: "میں ابوذات الکرش ہوں" اس کے جواب میں ادھر سے حضرت زبیر آگے بڑھے اور جنگ شروع ہو گئی۔ عبیدہ زفرق تا بقدم خود اور زرہ بکتر میں غرق تھا، صرف اس کی آنکھیں نظر آرہی تھیں، اس لئے حضرت زبیر نے اس کی آنکھوں پر اس زور اور قوت سے نیزہ مارا کہ بلبلا کر زمین پر گرا اور مرغ روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا، نیزہ اس بری طرح

---

[1] معلوم نہیں اس موقع پر بغیر حوالہ کے مولانا شبلی نے یہ کہاں سے لکھ دیا کہ شیبۃ کو حضرت علی نے قتل کیا تھا۔ حالانکہ یہ چیز اصول مبارزت کے خلاف تھی۔

کے جواب میں لشکر اسلام کی طرف سے قبیلۂ انصار کے تین نوجوان عوف، معاذ (جو عفرا کے بیٹوں کی نسبت سے مشہور ہیں) اور حضرت عبداللہ بن رواحہ آگے بڑھے، قریشیوں نے پوچھا: تم کون ہو؟ کس قبیلہ سے تعلق رکھتے ہو؟ انھوں نے کہا: ہم انصار میں سے ہیں، یہ سن کر قریشیوں نے ان کی تعریف کی۔ لیکن ان کے ساتھ نبرد آزما ہونے سے یہ کہکر انکار کر دیا کہ ہم تو اپنی ہی قوم کے اور اپنے ہمسر لوگوں سے جنگ کرنا چاہتے ہیں، یہ سن کر تینوں انصاری نوجوان اپنی صفوں میں واپس آ گئے، اور اب حضور کے حکم سے انھیں کے قبیلہ اور خاندان کے تین غازی حضرت حمزہ، حضرت عبیدۃ بن الحارث اور حضرت علی بن ابی طالب جو عمر میں سب سے چھوٹے تھے آگے بڑھ کر قریشیوں کے مدمقابل ہوئے اور مبارزت کے اصول کے ماتحت اپنا تعارف کرایا۔ قریشی بہادروں نے ان سے نبرد آزما ہونے کی ہامی بھرلی تو اب سب نے مل جل کر اپنا اپنا جوڑ منتخب کیا چنانچہ ولید بن عتبہ نے حضرت علی کو۔ حضرت عبیدہ بن الحارث نے شیبہ کو اور حضرت حمزہ نے عتبہ کو اپنا اپنا جوڑ قرار دیا[1] اور جنگ شروع ہو گئی، حضرت علی نے پہلا وار ہی ایسا بھرپور کیا کہ چشم زدن میں دشمن خاک پہ ڈھیر تھا، نوجوان بھتیجہ (حضرت علی) نے جو پھرتی دکھائی سن رسیدہ چچا (حضرت حمزہ) بھی اس سے کم نہ رہا، انھوں نے پہلو بچاکر اپنے حریف عتبہ پر اس زور کا حملہ کیا کہ وہ پچھڑ کر گرا اور دم توڑ گیا۔ اب رہا تیسرا جوڑا! تو اگرچہ حضرت عبیدۃ بن الحارث عمر رسیدہ تھے لیکن اس بہادری سے لڑے کہ شیبہ سے گتھم گتھا ہو گئے، کچھ دیر تک دونوں میں جنگ ہوتی اور ایک دوسرے پہ چوٹیں پڑتی رہیں، آخرکار حضرت عبیدہ نے پینترا بدل کر دشمن کے ایک ایسی

---

[1] صحیح بخاری باب غزوۂ بدر، صحیح بخاری میں حضرت علی سے یہ روایت بھی ہے کہ انھوں نے فرمایا: قرآن مجید کی آیت "ھٰذٰن خصمان اختصموا فی ربھم" انھیں چھ قریشیوں کے بارہ میں نازل ہوئی تھی جن میں سے تین اس طرف تھے اور تین اس طرف۔

نے تازہ دم تیراندازی کی جو یقیناً بے اثر نہیں رہ سکتی تھی، اس کے بعد دونوں لشکر ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا ہو گئے تو فضا میں یکایک تلواریں اور نیزے اس طرح چمکنے لگے جیسے بادلوں میں بجلی، بلا کا رن پڑا اور غضب کا معرکہ بپا تھا۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کمال خشوع و تضرع کا عالم طاری تھا۔ بار بار ہاتھ اٹھاتے اور فرماتے تھے: "اللھم انشدك عھدك و وعدك، اللھم ان شئت لم تعبد" ترجمہ: "اے اللہ! میں تجھکو تیرا وعدہ اور عہد یاد دلاتا ہوں۔ اے اللہ! اگر تو نے کچھ اور چاہا ہے تو پھر تیری عبادت نہ کی جائے گی"۔ صحیح بخاری باب غزوۂ بدر میں حضرت ابن عباس سے صرف اتنے ہی الفاظ منقول ہیں، لیکن مسند احمد بن حنبل میں اور بعض اور مآخذ میں یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قبلہ رو ہوئے، دست مبارک دراز کیے اور کہنا شروع کیا: "اے اللہ! کہاں ہے وہ جس کا تو نے وعدہ کیا تھا، اے اللہ! تو نے جس چیز کا مجھ سے وعدہ کیا تھا اب اسے پورا فرما۔ اے اللہ! اگر اہل اسلام کی یہ جماعت قلیلہ ہلاک ہو گئی تو پھر دنیا میں کوئی تیری عبادت کرنے والا نہ ہوگا"۔ حضرت عمر جو اس کے راوی ہیں ان کا بیان ہے کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) بار بار گڑگڑا گڑگڑا کے (یستغیث ربہ) یہ الفاظ کہتے جاتے اور دعا مانگتے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ عالم بیخودی میں آپ کی چادر گر پڑی۔ حضرت ابوبکر نے یہ دیکھا تو پاس آئے، چادر اٹھا کر جسم اطہر پر ڈالی اور سرور کائنات کی پشت سے چمٹ کر بولے: "اے اللہ کے نبی بس کیجئے! آپ نے اپنے رب سے کافی عرض معروض کر دی، اس نے آپ سے جو وعدہ کیا تھا وہ اب پورا ہونے والا ہی ہے"۔ بعض روایتوں میں ہے کہ دعا کرتے کرتے آپ ذرا سرنگوں ہو گئے اور اب جو سر اٹھایا تو زبان مبارک پر یہ ارشاد ربانی تھا:

سیھزم الجمع ویولون الدبر یہ لوگ عنقریب شکست کھائیں گے اور پسپا ہوں گے۔[1]

---

[1] صحیح بخاری غزوۂ بدر، مگر اس میں سرنگوں ہونے کا ذکر نہیں ہے، ابن اسحٰق کے ہاں اس کا ذکر ہے۔

سر میں پیوست ہوا تھا کہ حضرت زبیر نے مقتول نعش پر پاؤں رکھ کر اسے پوری قوت سے کھینچا تو نکلا تو سہی، لیکن اس کے دونوں کنارے خمیدہ ہوگئے، یہ نیزہ کمال شجاعت و مردانگی کا نشان تھا، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حضرت زبیر سے طلب کر کے اپنے پاس رکھ لیا، آپ کے بعد یہ خلفائے راشدین میں دست بدست منتقل ہوتا رہا اور پھر حضرت زبیر کے خاندان میں آگیا[1]

حملۂ عام

ولید، عتبہ، شیبہ اور عبیدہ جو یکے بعد دیگرے مارے گئے بڑے بہادر اور نامور ان قریش تھے ان کے قتل ہوجانے پر قریش آپے سے باہر ہوگئے اور حملۂ عام کی تیاری کرنے لگے، ادھر غیر معمولی جوش و خروش اور کشمکش کے باعث اسلامی لشکر کی صفوں میں یک گونہ بے ترتیبی پیدا ہوگئی تھی اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، صفوں کو مرتب و منظم کیا اور پھر حضرت ابوبکر کو ساتھ لے کر عریشہ میں لوٹ آئے[2] اب لشکر قریش ایک سیل رواں کی طرح غصہ میں بھرے ہوئے اس طرح آگے بڑھے کہ چلتے جاتے اور تیروں کی بارش برساتے جاتے تھے، چونکہ ابھی فاصلہ پر تھے اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے بموجب لشکر اسلام نے مضبوطی کے ساتھ اپنا مورچہ سنبھال لیا اور جنگ کے لئے تیار ہوگئے، لیکن تیراندازی نہیں کی، گویا مسلمانوں نے اس وقت دفاعی پوزیشن اختیار کر رکھی تھی۔ فرمان نبوی پر عمل کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ دشمن نے جذبات سے بے قابو ہوکر دور سے جو تیراندازی کی اور اس میں چابکدستی دکھائی تھی اس کے باعث لشکر اسلام کے قریب آتے آتے اس کے تیروں کا ایک بڑا ذخیرہ بیکار گیا اور وہ خود تازہ دم بھی نہیں رہا۔ اس کے برخلاف جب دونوں لشکر ایک دوسرے کے قریب آئے تو مسلمانوں

---

[1] صحیح بخاری غزوۂ بدر

[2] الدرر لابن عبد البر

صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مژدہ جاں سنایا[1]

عتبہ، شیبہ اور ولید ایسے نامور ان قریش پہلے ہی قتل ہو چکے تھے، اب ابوجہل کے قتل نے رہے سہے حواس بھی ختم کر دیے اور لشکر قریش میں بھگدڑ مچ گئی، مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا، جو ہاتھ لگ گیا اسے سپرد تیغ کر دیا یا گرفتار کر لیا، اب جو جنگ کا مطلع صاف ہوا تو معلوم ہوا کہ لشکر اسلام میں سے صرف چودہ مسلمان شہید ہوئے ہیں جن میں چھ مہاجر تھے اور آٹھ انصار۔ ان میں چھ قبیلۂ اوس سے تعلق رکھتے تھے اور دو خزرج کے تھے، اس کے بالمقابل ستر آدمی فریق مخالف کے مارے گئے اور ستر ہی گرفتار ہوئے۔ اب ہم ذیل میں تین فہرستیں نقل کرتے ہیں جن سے فریقین کے نقصانات کا اور اس جنگ کی تاریخی اہمیت کا صحیح اندازہ ہوگا۔

(۱)

شہدائے بدر

نمبر	نام	قبیلہ و کیفیت
۱	حضرت عبیدۃ بن الحارث بن المطلب	بنو المطلب بن عبد المناف قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے، قریش کے مشہور شہسوار تھے، مکہ میں پیدا ہوئے، حضور جب دار ارقم میں داخل ہوئے ہیں، اس سے

[1] ارباب علم پر پوشیدہ نہیں ہے کہ قتل ابوجہل کے سلسلہ میں علما نے طول طویل بحثیں کی ہیں کہ معاذ بن عفراہیں یا ابن عمرو بن الجموح، پھر یہ کہ ابوجہل کا اصل قاتل کون ہے، وغیرہ وغیرہ، لیکن یہ بحثیں ہمارے دائرۂ کار سے خارج ہیں اس لئے ہم نے صرف صحیح بخاری اور مسند امام احمد بن حنبل کو سامنے رکھ کر کچھ اِس سے لیا اور کچھ اُس سے لیا اور اس طرح نفس واقعہ کا ایک خاکہ تیار کیا ہے۔

مسند امام احمد بن حنبل اور بعض اور کتب حدیث میں اس پر اتنا اضافہ اور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت زرہ پوش تھے، اسی حالت میں آپ فرط جوش سے اچھلتے جاتے اور یہ آیت پڑھتے جاتے تھے۔

اب میدان جنگ پر آپ نے نگاہ ڈالی تو یہاں کا نقشہ بدلنا شروع ہو گیا تھا۔ قریش کا لشکر جو گھنگھور گھٹا کی طرح اُمڈ کر آیا تھا اب وہ چھٹنے لگا۔ غازیان اسلام نے شجاعت و مردانگی کے وہ جوہر دکھائے کہ ان کے چھکے چھوٹ گئے، فوج میں افراتفری پیدا ہو گئی، مسلمانوں کی تیغ و سنان کے پے بہ پے حملوں سے دشمن کی لاشوں پر لاشیں گر رہی تھیں یا وہ گرفتار ہو رہے تھے، اسی عالم میں عفرا کے دو نوخیز بیٹے معوذ اور معاذ ابوجہل کی تاک میں سرگرداں اِدھر اُدھر پھر رہے تھے، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے پاس سے ان کا گذر ہوا تو دونوں نے چپکے سے ان کے پاس جاکر پوچھا: "چچا جان! کیا آپ ابوجہل کو پہچانتے ہیں" حضرت عبدالرحمٰن بن عوف بولے: ہاں میں اسے پہچانتا ہوں مگر بھتیجہ تم کروگے کیا؟ ایک لڑکے نے جواب دیا: میں نے سنا ہے کہ یہ شخص رسول اللہ کی شان میں اول فول بکتا ہے، اس لئے میں نے قسم کھائی ہے کہ اگر دیکھ لوں گا تو اسے بچ کر نہیں جانے دوں گا۔ ایک جب یہ کہہ چکا تو پھر دوسرے بھائی نے بھی یہی بات کہی، عبدالرحمٰن بن عوف کہتے ہیں: ان دونوں بھائیوں کی کم عمری اور ان کا تن و توش دیکھ کر ان کے اس عزم پر مجکو بڑی حیرت ہوئی (حالانکہ بات حیرت کی نہ تھی، شمع اگر روشن ہو تو پروانہ کی عمر اور اس کے قد و قامت کا سوال چہ معنی دارد) اتنے میں ابوجہل چلتا پھرتا نظر آگیا تو میں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: لو دیکھو، وہ ہے ابوجہل۔ یہ سنتے ہی دونوں بھائی لپک کر وہاں پہونچے اور یک لخت اس پر جھپٹ کے دونوں نے تلوار کا ایسا وار کیا کہ ٹھنڈا ہو کر گر پڑا۔ بعد ازاں حضور نے ابوجہل کی خبر لانے کے لئے حضرت عبداللہ بن مسعود کو بھیجا تو اس وقت تک اس میں رمق حیات باقی تھی، عبداللہ بن مسعود نے رہا سہا اس کا کام تمام کر دیا اور آنحضرت

نمبر	نام	کیفیت
۵	حضرت مہجع	حضرت عمر کے آزاد کردہ غلام! یہ بھی سابقین اولین میں سے تھے۔
۶	” صفوان بن بیضار	قبیلۂ بنی الحارث بن فہر سے تھے۔
۷	” سعد بن خیثمہ انصاری	بنی عمرو بن عوف (خزرج کی ایک شاخ) سابقین اسلام میں سے ہیں، بیعت عقبہ کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بارہ نقیب منتخب کئے تھے ان میں ایک یہ بھی تھے، یہ نوجوان تھے، غزوۂ بدر میں شرکت کے لئے انھوں نے اور ان کے والد حضرت خیثمہ نے قرعہ اندازی کی تو حضرت سعد کا نام نکلا۔ باپ نے ہر چند کہا کہ بیٹے مجھے غزوہ میں جانے دے لیکن حضرت سعد نہ مانے اور بولے: ابا جان! اگر سودا جنت کے علاوہ کسی اور چیز کا ہوتا تو میں آپ کی بات مان لیتا چنانچہ گئے، بڑی بہادری سے لڑے اور شہید ہو گئے،
	” مبشر بن عبد المنذر بن زنبر انصاری	قبیلہ خزرج، حضرت ابو لبابہ کے بھائی تھے جن کو حضور نے مقام الروحا رسے مدینہ کا امیر بنا کر واپس کر دیا تھا۔
	” یزید بن الحارث انصاری	قبیلہ خزرج۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں اور حضرت ذو الشمالین میں مواخات کرائی تھی۔
	” عمیر بن الحمام انصاری	قبیلہ خزرج کی شاخ بنی سلمہ، یہ وہی ہیں جن کا تذکرہ مضمون میں آچکا ہے کہ کھجور کھاتے کھاتے

		پہلے اسلام لاچکے تھے، حضور سے عمر میں دس برس بڑے تھے، سلسہ میں ساٹھ آدمیوں کا جو دستہ بھیجا گیا تھا اس کے علمبردار یہی تھے۔
۲	حضرت عمیر بن ابی وقاص	قبیلۂ بنو زہرۃ بن کلاب۔ حضرت سعد بن ابی وقاص کے برادر خورد، شہادت کے وقت عمر سولہ یا سترہ برس تھی، حضور نے جب لشکر کا جائزہ لیا تو کم سنی کے باعث ان کو واپس کردینا چاہا یہ رونے لگے، اس پر حضور نے اجازت عطا فرمادی، یہ لڑے اور شہید ہوگئے۔
۳	ر ذوالشمالین ابن عبد عمرو بن نضلۃ الخزاعی	حلیف بنی زہرہ۔ حافظ ابن عبد البر (الدرر) نے اس پر تنبیہ کی ہے کہ امام زہری تک کو یہ مغالطہ ہوگیا ہے کہ وہ ان کو وہی ذوالیدین سمجھ بیٹھے ہیں جن کی طرف حدیث سہو نبی اَقُصِرَتِ الصلوٰۃ ام نسیت یا رسول اللہ کہنا منسوب ہے حالانکہ یہ الگ الگ دو شخص ہیں، کیونکہ حدیث سہو کے راوی حضرت ابوہریرہ ہیں اور ان کا اسلام ذوالشمالین کی شہادت کے بعد کا ہے۔
۴	ر عاقل بن البکیر	حلیف بنی عدی بن کعب بن لوئی۔ اسلام کے سابقین اولین میں سے تھے، دار ارقم میں حضور سے بیعت کی تھی، ان کا اصل نام غافل تھا، حضور نے اسے بدل کر عاقل کر دیا۔

۹	عبیدہ بن سعید بن العاص	قریش کی شاخ عبد مناف
۱۰	العاص بن سعید بن العاص	؍؍
۱۱	عقبہ بن ابی معیط	؍؍
۱۲	عامر بن عبد اللہ النمری	بنی عبد شمس بن عبد مناف کا حلیف
۱۳	حارث بن عامر بن نوفل	بنی نوفل بن عبد مناف
۱۴	طعیمہ بن عدی بن نوفل	؍؍
۱۵	زمعہ بن الاسود بن المطلب	بنی اسد بن عبد العزی
۱۶	ابو البختری بن ہشام	؍؍
۱۷	حارث بن زمعہ	؍؍
۱۸	نوفل بن خویلد بن اسد	؍؍ یہ حضرت خدیجہ کا بھائی، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا برادر نسبتی تھا، لیکن نہایت سرکش اور حضور کی جان کا دشمن
۱۹	عقیل بن الاسود بن المطلب	؍؍
۲۰	عقبہ بن زید	یمن کا باشندہ اور بنی اسد کا حلیف
۲۱	عمیر	بنی اسد کا غلام
۲۲	النضر بن الحارث بن کلدہ	بنی عبد الدار بن قصی، یہ لشکر قریش کا علمبردار تھا، نہایت بدطینت اور کمینہ فطرت انسان تھا، مکہ کے زمانۂ قیام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی میں پیش پیش رہتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے اس کو حضرت علی نے مدینہ واپس جاتے ہوئے وادی صفرا کے

		انھیں پھینک دشمن کی صفوں میں گھس گئے اور شہید ہوگئے۔
۱۱	" رافع بن المعلی انصاری	قبیلۂ خزرج ، ابوجہل کے بیٹے عکرمہ کے ہاتھوں شہید ہوئے
۱۲	" حارثہ بن سراقہ انصاری	قبیلۂ اوس کی شاخ بنی النجار۔
۱۳	" عوف بن الحارث	"اوس" کی شاخ بنی غنم سے تھے ، دونوں بھائی تھے اور نوجوان ! ابنا عفرا کے لقب سے مشہور ہیں
۱۴	" معوذ بن الحارث	

ڈاکٹر محمد حمید اللہ لکھتے ہیں : "ان شہدائے بدر کا مقبرہ ایک ممتاز احاطے میں آج بھی موجود ہے ، ترکوں کے زمانہ میں یہاں سنگ مرمر کے ستون اور کتبے وغیرہ لگائے گئے تھے۔ مگر اب یہ کھنڈر ہو چکے ہیں۔

(۲)

مقتولین بدر

۱	عتبہ بن ربیعہ بن عبد شمس	قریش کی شاخ عبد مناف
۲	شیبہ بن ربیعہ بن عبد شمس	"
۳	ولید بن عتبہ	"
۴	حنظلہ بن ابی سفیان بن حرب	"
۵	الحارث بن الحضرمی	"
۶	عامر بن الحضرمی	"
۷	عمیر بن ابی عمیر	"
۸	عمیر کا بیٹا	"

۴۰	سائب بن ابی السائب بن عابد	بنی مخزوم ۔ لیکن ابن ہشام ج ۲ ص ۳۷۹ میں ہے کہ یہ قتل نہیں ہوئے بلکہ بعد میں مسلمان ہوگئے تھے اور حضور نے حنین کے مال غنیمت میں سے ان کو حصہ دیا تھا۔ ابن عبدالبر نے بھی مقتولین کی فہرست میں ان کا نام لکھنے کے بعد لکھا ہے وقد قیل لم یقتل السائب یومئذٍ بل اسلم بعد ذالک ۔ ص ۱۱۸ واللہ اعلم
۴۱	اسود بن عبد الاسد	بنی مخزوم
۴۲	حاجب بن السائب بن عویمر	〃
۴۳	عویمر بن السائب بن عویمر	〃
۴۴	عمرو بن سفیان	حلیف بنی مخزوم ، قبیلہ طے
۴۵	جابر سفیان	〃 〃
۴۶	عبداللہ بن المنذر بن ابی رفاعہ	بنی مخزوم
۴۷	حذیفہ بن ابی حذیفہ	〃
۴۸	ہشام بن ابی حذیفہ	〃
۴۹	زہیر بن ابی رفاعہ	〃
۵۰	السائب بن ابی رفاعہ	〃
۵۱	عائذ بن السائب بن عویمر	〃
۵۲	عمیر	حلیف بنی مخزوم قبیلہ طے

۲۳	زید بن ملیص	مقام اثیل میں قتل کیا۔ بنی عبدالدار بن قصی
۲۴	نبیہ بن زید بن ملیص	حلیف بنی عبدالدار، اول بنو مازن اور پھر بنو تمیم سے۔
۲۵	عبید بن سلیط	حلیف بنی عبدالدار، قبیلہ قیس
۲۶	مالک بن عبیداللہ بن عثمان	بنی تیم بن مرہ، یہ جنگ میں قتل نہیں ہوا تھا۔ بلکہ گرفتار ہوا اور اسی حالت میں مرگیا
۲۷	عمرو بن عبداللہ بن جدعان	بنی تیم بن مرہ
۲۸	عمیر بن عثمان	״
۲۹	عثمان بن مالک	״
۳۰	ابوجہل بن ہشام	بنی مخزوم، لشکر قریش کا کمانڈر ان چیف اسلام کا اور حضور کا شدید ترین دشمن۔
۳۱	عاص بن ہشام بن المغیرہ	بنی مخزوم !
۳۲	یزید بن عبداللہ	حلیف بن مخزوم، بنو تمیم قبیلہ،
۳۳	ابومسافع الاشعری	״
۳۴	حرملہ بن عمرو	״
۳۵	مسعود بن ابی امیہ	بنی مخزوم، حضرت ام سلمہ زوجۂ حضور کا بھا
۳۶	ابوقیس بن الولید	״ حضرت خالد بن الولید کا بھائی
۳۷	ابوقیس بن الفاکہہ بن المغیرہ	بنی مخزوم
۳۸	رفاعہ بن عاید بن عبداللہ	״
۳۹	منذر بن ابی رفاعہ بن عابد	״

عالمی اسلامی کانفرنس

عراق میں نوروز

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی

بغداد کی "موتمر علماء المسلمین" کی روئداد کی اشاعت میں اندازے سے زیادہ تاخیر ہوگئی، ہوا یہ کہ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی مسلسل دو ماہ سے "نقرس" کی تکلیف میں مبتلا ہیں، اسی حالت میں بعض طویل سفر بھی ہوئے اور ارادے کے باوجود روئداد قلم بند نہ ہوسکی۔ افسوس ہے مفتی صاحب کی علالت کی وجہ سے اب بھی اس اہم اور دلچسپ سفر کی مختصر ہی کیفیت شائع کی جارہی ہے، پھر بھی اس کو پڑھ کر قارئین کی معلومات میں اضافہ ہوگا ———— ملایہ

بغداد کی عالمی اسلامی کانفرنس "موتمر علماء المسلمین" میں شرکت کے لئے ۱۰ر فروری کی صبح کو دہلی سے عراق ایرویز سے روانگی ہوئی، راستے میں ۴۵ منٹ کے لیے بحرین ٹھہرا اور اس طرح چھ گھنٹے سے کم میں یہ سفر طے ہوگیا، مہمانوں کے خیر مقدم کے لیے ہوائی اڈے پر معقول انتظام تھا، اسی وقت ابوظبی کا وفد بھی پہونچا تھا اور کچھ دوسرے اصحاب بھی، عرب ممالک کے بہت سے وفود پہلے ہی پہونچ

۵۳	خیار	حلیف بنی مخزوم
۵۴	منبہ بن الحجاج بن حذیفہ	بنی سہم بن عمرو، حضرت عمروبن العاص کا قبیلہ
۵۵	عاص بن منبہ بن الحجاج	"
۵۶	نبیہ بن الحجاج	"
۵۷	ابو العاص بن قیس بن عدی	"
۵۸	عاصم بن خبیرہ بن سعید	"
۵۹	حارث بن منبہ بن الحجاج	"
۶۰	عامر بن بن عوف بن خبیرہ	"
۶۱	معاویہ بن عامر	بنی عامر بن لوئ
۶۲	معبد بن وہب	حلیف بنی عامر، قبیلہ بنی کلب بن عوف
۶۳	امیہ بن خلف	بنی جمح بن عمرو بن ہصیص، یہی وہ شخص ہے حضرت بلال جس کے غلام تھے اور جو ان کے قبول اسلام کی پاداش میں انھیں سخت ترین ایذائیں دیتا تھا۔ یہاں تک کہ حضرت ابوبکر نے انھیں خرید کر آزاد کیا۔
۶۴	علی بن امیہ بن خلف	امیہ کا بیٹا
۶۵	اوس بن معیر بن لوذان	بنی جمح بن عمرو بن ہصیص
۶۶	سبرہ بن مالک۔	حلیف بنی جمح بن عمرو بن ہصیص
۶۷و۶۸	دونا معلوم الاسم غلام	بنی عبد شمس
۶۹و ۷۰	ان کے ناموں اور قبیلہ کا پتہ نہیں لگا۔	

باقی

دعوت نامہ وہاں غالباً ۱۳ر فروری کی شام کو ملا اور اسی تاریخ سے کانفرنس شروع ہو رہی تھی اس لئے ارادے کے باوجود مولانا تشریف نہ لاسکے، میرا خیال ہے کہ موصوف اس اہم تاریخی اجتماع میں شریک ہو جاتے تو ان کی تشریف آوری سے نہ صرف یہ کہ ہندوستانی وفد کے وقار میں اضافہ ہوتا بلکہ ان کی وہ آزردگی، کبیدگی اور گھٹن بھی بڑی حد تک دور ہو جاتی جو ۷۳ء کے سفر عراق کے وقت پیش آئی تھی، یہی وجہ ہے کہ آزادانہ سیر و تفریح کے ہر مرحلہ میں مولانا خاص طور پہ یاد آتے رہے، اجتماع کی تاریخیں پہلے ۱۰ر سے ۲۲ر فروری تک رکھی گئی تھیں، دوسری اطلاع میں یہ تاریخیں ۱۳ر سے ۱۸ر فروری تک کردی گئیں۔

۱۰ر فروری کی شام سے ۱۳ر فروری تک کا وقت فارغ تھا، خیال ہوا کہ اس فرصت سے فائدہ اٹھایا جائے، کانفرنس کے دوران بندھے ہوئے پروگرام کے علاوہ کہیں آنا جانا دشوار ہوگا چنانچہ شدید سردی کے باوجود اپنے مقامی رفیق کے ساتھ ... سے پہلے "جامعہ مستنصریہ" کی ہلکی اور اجمالی سیر کی، رات ہوگئی تھی اور وقت بھی کم تھا اس لئے اس عظیم الشان یونیورسٹی کی جو عراق کی جدید ترین لاجواب یونیورسٹی ہے، تفصیلی سیر نہ ہوسکی یونیورسٹی کی ہر چیز لائق دید ہے، ہزارہا طلبہ اور طالبات اس میں تعلیم پاتے ہیں، ہم نے مغرب کی نماز قدرے تاخیر سے یونیورسٹی کی لائبریری کے ایک حصے میں جماعت سے پڑھی اور لائبریری کے ذمہ داروں سے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ جامعہ کے سالانہ میگزین کا آٹھ سو صفحات سے زیادہ کا ایک ضخیم نمبر بھی ہمیں تحفتاً دیا گیا، اس کو پڑھ کر "جامعہ" کی ... ہتوں اور سرگرمیوں کی ضروری تفصیل معلوم ہو جاتی ہے، کڑاکے کی سردی میں یونیورسٹی سے واپس ہوئے تو قدرتی طور پر تھکن محسوس ہوئی اور جلد آرام کرنے کو جی چاہا، عشاء کی نماز کے بعد جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے، مؤتمر کی روح اور رئاسۃ دیوان الاوقاف کے ... جناب نافع قاسم صاحب تشریف لے آئے، قاسم صاحب نہایت قابل، ذہین اور اعلیٰ درجے کے منتظم ہیں اور حکومت کے تمام ہی شعبوں میں ان کا غیر معمولی رسوخ ہے، رئیس مملکت کے معتمد خاص اور دستِ راست ہیں، ان سے باتیں کرکے تھکن میں تخفیف ہوگئی، نیند بھی

چکے تھے، "شارع سعدون" بغداد کی اہم اور مشہور سڑک ہے۔ مندوبین کی بڑی تعداد کے قیام کا انتظام اسی سڑک کے اول درجے کے ہوٹلوں میں تھا، ابو ذہبی، یمن، بنگلہ دیش اور ہندستانی مندوبین "ہوٹل خیام" میں ٹھہرائے گئے، اسی روز شب میں دیوان رئاسۃ الاوقاف کے صدر شیخ نافع قاسم قیام گاہ پر تشریف لائے اور بڑے ہی خلوص اور تپاک سے معانقہ کیا۔ دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ گزشتہ اگست میں دورۂ سمرقند و ماسکو کے موقع پر موصوف سے ماسکو میں ملاقات ہوئی تھی اور اسی وقت معلوم ہوگیا تھا کہ ہندوستان سے جن علماء کو بلایا گیا ہے ان میں میرا نام بھی شامل ہے بلکہ شیخ قاسم صاحب نے اصرار کے ساتھ فرمایا تھا کہ تمھیں "بغداد کانفرنس" میں ضرور آنا ہے، ضابطے کا دعوت نامہ جلد پہونچے گا، اس طرح گویا حقیقی دعوت نامہ ماسکو ہی میں مل گیا تھا لیکن یہ اگست کی بات تھی اور اب اتنا وقفہ ہوگیا تھا کہ اجلاس کے التوا کا خیال ہونے لگا تھا۔ برادر عزیز مولانا سعید احمد صاحب نے متعدد مرتبہ دریافت بھی کیا کہ "بغداد کانفرنس" کے دعوت نامے کا کیا ہوا، میں نے کہا شاید اجتماع ملتوی ہوگیا ہے، بہرحال اواخر جنوری میں عراق کے سفارت خانہ کی معرفت دعوت نامہ پہونچ گیا اور حکومت ہند کی وزارت خارجہ کے دفتر سے بھی ضابطے کی اطلاع آگئی، عمر کے تقاضے اور اضمحلال کی وجہ سے اب کسی طویل اور اہم سفر کی ہمت نہیں ہوتی، امام بخاری کے بارہ سو سالہ جشنِ ولادت کی تقریب میں مولانا سعید احمد صاحب رفیقِ سفر تھے اس لیے وہ طویل سفر سبک ہوگیا تھا، مولانا کی رفاقت میں یوں بھی بے فکری رہتی ہے کہ مقالات، مذاکرات اور مجالس کی ذمہ داریوں کو قابلیت سے انجام دیتے ہیں، عربی بھی زناٹے سے بولتے ہیں اور انٹرویو بھی خوب دیتے ہیں، خیال تھا اس سفر میں محترم مولانا علی میاں صاحب کی رفاقت کا شرف حاصل رہے گا اور بہت سے کام مولانا کی برکت سے انجام پائیں گے مگر موصوف بہت پہلے سے مدینہ یونیورسٹی کی مجلس انتظامیہ میں شرکت کے لئے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تھے اور پھر شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کی خدمت میں رہ گئے تھے، کوشش بھی کی گئی کہ مولانا مدینہ شریف سے براہ راست بغداد پہونچ جائیں لیکن ان کو کانفرنس کا

وسیع، سادہ اور شاندار ہے، پہلے امام والامقام کے مرقدِ مبارک پر حاضر ہوئے اور وقت کا ایک حصہ اِس پرسکون، باوقار اور خاموش نورانی فضا میں گزارا، یہاں آکر طبیعت کا رنگ کچھ اور ہی ہوگیا، امام عالی مرتبت کے مسلک کی وسعت اور گہرائی دماغ پر چھاگئی، حضرت الاستاذ علامہ سید محمد انور شاہ صاحبؒ کی تحقیقات عالیہ اور مولانا شبلی کی سیرۃ النعمان کی بہت سی باتیں یاد آگئیں، افسوس ہے مراقبہ کے فن سے آشنا نہیں ہوں ورنہ یہاں مراقب ہونے کو دل چاہتا تھا، کوئی پختہ کار مراقب ساتھ ہوتا تو اس کے ہمراہ میں بھی مراقبہ کرتا اور مراقبے کی دنیا کی روحانی سیر سے لطف اندوز ہوتا، بعض محدثین کرام اور فقہائے عظام نے امام اعظم کے بعض مسائل پر جس طرح کی بے رحمانہ یورشیں کی ہیں اس فضا میں بار بار ان کا خیال آیا اور مسلک امام کی طرف سے مدافعت کرنے کو جی چاہا۔ لیکن ان باتوں کا تعلق وقتی جذبات اور اس خاص ماحول سے تھا، خیال تھا کہ قیام بغداد کے دنوں میں یہاں بار بار حاضری ہوگی، لیکن دوبارہ موقع نہیں ملا، اِدھر ظہر کی نماز کا وقت قریب تھا، جلد ہی مسجد آگئے، حنفی امام کی اقتدا میں نماز ادا کی اور قیام گاہ پر واپس آگئے، کھانا کھایا اور تھوڑی دیر آرام کیا، پروگرام کے مطابق عصر سے قبل حضرت شیخ عبدالقادر جیلی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں حاضری دی، یہ بغداد کا نہایت مشہور، مقبول اور بابرکت مقام ہے، آنے جانے والوں کا یہاں ہر وقت تانتا بندھا رہتا ہے، مسجد، مزار، مقبرے کا عالی شان گنبد، مسافر خانہ اور کتب خانہ تمام ہی عمارتیں شاندار اور خوبصورت ہیں، ان دنوں بڑے پیمانے پر مسجد کے مرکزی حصے کی مرمت اور صفائی ہو رہی تھی اس لیے برابر کے حصے میں نماز ہوتی ہے، ہم نے اسی حصے میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھی، اس کے بعد مزار پر حاضر ہوئے، یہاں عام طور پر زائرین کا وہی رنگ ہے جو اجمیر، کلیر اور دہلی وغیرہ کے زائرین کا ہے، جس وقت ہم فاتحہ پڑھ رہے تھے، ایک فوجی کو دیکھا کہ مزار کے پائنتی سجدہ کرکے تڑپ رہا ہے اور تڑپ تڑپ کر دعائیں مانگ رہا ہے، فاتحہ سے فارغ ہوکر کتب خانہ دیکھا، یہ بہت اچھا کتب خانہ ہے جس میں حدیث، تفسیر، فقہ، تاریخ، ادب اور

خوب آئی۔

بغداد صدیوں تک اسلامی تہذیب وثقافت اور ادب وسیاست کے دل کی دھڑکن رہا ہے، اس نے ایک زمانے میں دنیا کے بڑے حصے پر حکمرانی کی ہے، دوسرے مورخین کی زبردست کاوشوں کے علاوہ علامہ خطیب بغدادی نے متمدن دنیا کے اس لاجواب شہر کی تاریخ ۱۴ جلدوں میں لکھی ہے، خطیب کا سنہ وفات ۴۶۳ھ ہے اس لیے ان کی کتاب میں اسی سنہ تک کے واقعات آئے ہیں، بعد کے واقعات تاریخ وثقافت کی دوسری کتابوں میں موجود ہیں۔ خطیب کی تاریخ کے مطالعہ سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ اس سرزمین نے علوم وفنون کے کیسے کیسے امام پیدا کیے اور علم وفن کے ان محققوں اور ماہروں نے کس ولولہ وشوق سے اس دار السلام اور عروس البلاد کا رخ کیا اور پھر یہیں آباد ہوگئے، اس لیے یہ کہنا مبالغہ سے پاک ہوگا کہ دانشوروں مذہبی رہنماؤں، ادیبوں، شاعروں اور اربابِ صدق وصفا کا اجتماع اتنی بڑی تعداد میں کسی بھی دوسرے اسلامی شہر میں نہیں ہوا۔

جہاں تک میرا تعلق ہے بغداد کے بازاروں اور سڑکوں پر قدم رکھنے کے ساتھ ہی عباسی دور کے ادیبوں اور شاعروں کے ادبی اور شاعرانہ کمالات کا نقشہ آنکھوں میں گھوم گیا، ابونواس تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ ساتھ ہی ساتھ چل رہا ہے، معلوم نہیں کیوں مجھے اس موقع پر الاغانی اور الف لیلا ولیلا کے بجائے "نفحۃ الیمن" کی حکایتیں زیادہ یاد آئیں، شارع ابی نواس سے جب بھی گزر ہوتا دجلہ کی موجوں کو دیکھ کر عباسی خلیفہ ہارون الرشید کے دربار کے سب سے بڑے بزلہ سنج شاعر ابونواس کی تصویر سامنے آجاتی، رقاشی، مصعب اور ابونواس کی طبع آزمائیاں لوح حافظہ میں ابھر آتیں اور ۶۰ سال پہلے کی پڑھی ہوئی کتاب کے اوراق مصور ہوکر سامنے آجاتے۔ یہ تو میری بات تھی، مولانا سعید احمد ساتھ ہوتے تو رنگین اشعار کے دفتر کے دفتر دریائے دجلہ کی جھنپی ہوئی لہروں کی نذر کر دیتے۔

۱۱ر فروری کی دوپہر کو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد میں حاضری دی، یہ مسجد نہایت

ہے اور اب ان قبروں کا نشان بھی نہیں ملتا، پروگرام کے مطابق ۱۳ فروری کی صبح کو ۱۰ بجے مؤتمر کے تمام مدعوئین کو قصر جمہوریت پہونچ کر "سجل التشریفات" میں اپنے نام درج کرانے تھے، یہ وہ رجسٹر ہوتا ہے جس پر باہر سے آنے والے معزز مہمان دستخط کرتے ہیں اور رجسٹر صدر جمہوریہ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے، یہ ایک اخلاقی رسم ہے جو ممتاز مہمانوں کو ادا کرنی ہوتی ہے، قصر جمہوری میں قدم رکھتے ہی ماضی کی بہت سی دل خراش اور عبرت خیز یادیں تازہ ہونے لگیں اور تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ کی تفسیر اپنی تمام عبرت انگیزیوں کے ساتھ آنکھوں میں پھر گئی، قصر کی صفائی، ستھرائی، وسعت اور ظاہری رونق خوب تھی، پچاسوں موٹریں، سیکڑوں مشاہیر وقت کو وسیع وعریض محل کے صحن میں پہنچا رہی تھیں اور علمائے کرام رجسٹر پر دستخط کر کے واپس ہو رہے تھے، مجھے خیال آیا کیا صدر جمہوریہ ۳۲ ملکوں کے ان نمائندوں سے ملاقات نہیں کریں گے، لیکن کانفرنس کے آخری دن رئیس جمہوریہ جناب احمد حسن بکر سے بہت اچھے ماحول میں قصر کے بڑے ہال میں خوشگوار ملاقات ہوئی، تھوڑی تفصیل آگے آئے گی۔

شام کو ٹھیک ۶ ½ بجے اجلاس کی باضابطہ کارروائی شروع ہوئی، اجتماع کا انتظام علاقہ علمیہ کے قاعۃ النعمان میں کیا گیا تھا، ۳۲ ممالک کے کم وبیش ۱۵۰ نمایندے اجتماع میں شریک تھے، نمایندوں کے علاوہ مدعوئین خصوصی کی بھی خاصی تعداد موجود تھی، وسیع اور کشادہ ہال بھرا ہوا تھا، عجیب طرح کی دلکشی تھی، اجلاس کا افتتاح بغداد کے ایک مشہور خوش لہجہ قاری صاحب کی تلاوت سے ہوا۔ قاری صاحب نے سورۂ اسرا کی آیات "وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا ... أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا" سوز وگداز میں ڈوبے ہوئے لہجے میں پڑھیں تو سامعین پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی۔ آیاتِ پاک کا سادہ ترجمہ آپ بھی سنتے جائیں، تفسیر وتشریح کا موقع نہیں۔

ہم نے کتاب میں یعنی تورات میں بنی اسرائیل کو اس فیصلے کی خبر دے دی تھی کہ

تصوف ہر طرح کی قدیم وجدید کتابیں موجود ہیں، وقت کی قلت کی وجہ سے کتب خانہ میں زیادہ نہیں ٹھہر سکے۔ یہ بھی خیال تھا کہ دوبارہ آنا ہو ہی گا مگر نہ ہوسکا۔ شارع امام اعظم، شارع جمہوریہ شارع عبدالرشید، شارع ابی نواس اور دجلہ کے سبزہ زاروں اور پارکوں کی سیر کرتے ہوئے ہوٹل واپس آگئے، معمول کے مطابق کھانا کھایا، عشار پڑھی اور سو گئے، رہ رہ کر یہ خلش ہو رہی تھی کہ پیرانِ پیر قدس سرہٗ کی ہنگامہ خیز اور تقدس وتقویٰ میں رچی ہوئی موحدانہ مجلسوں اور مرقدِ مبارک پر ہونے والے ان اعمال میں کیا نسبت ہے اور ان حرکتوں کو دیکھ کر شیخ کی روحِ پاک پر کیا گذرتی ہوگی۔ بہرحال ہر ایک کو اپنا مسلک محبوب ہے اور تاویلوں کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ ۱۲ فروری کی سہ پہر کو مشہور صوفیائے کرام حضرت سری سقطی، حضرت جنید بغدادی اور بہلول دانا وغیرہ کے مزارات پر حاضر ہوئے، اکابرِ صوفیہ کے یہ مزارات عام قبرستان میں ہیں، قبرستان کے اسی حصہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی "پیغمبر یوشع علیہ السلام" کا مزار بھی بتایا جاتا ہے، یہ مزار ایک علٰحدہ کمرے میں ہے، وہاں بھی حاضر ہوئے اور گرونانک جی کے اس حجرے کو بھی دیکھا جس کے متعلق مشہور ہے کہ گروجی نے اس حجرے میں قیام کیا تھا، ایک چھوٹے سے سادہ کمرے میں تخت پر صاف ستھری چادر بچھی ہوئی تھی اور اس پر پھول بکھرے ہوئے تھے۔ سفرنامہ لکھنے کا وقت ہوتا تو اکابرِ صوفیار کے ایمان افروز سوانح حیات کی ہلکی سی جھلک بھی پیش کی جاتی مگر میرے لئے لکھنے کا مسئلہ ہمیشہ ہی دشوار رہا ہے اور اب تو زندگی کا نقشہ ہی کچھ اور ہوگیا ہے، برادرم جمیل مہدی صاحب یا ان کے ڈھنگ کا کوئی قابل ساتھی دستیاب ہوجاتا تو میں بولتا جاتا اور وہ صاحب لکھتے جاتے، یہ حقیقت ہے کہ اِن مزارات پر حاضری کے وقت قلب پر ایک خاص کیفیت طاری ہوئی اور ان پاک باز ہستیوں کے روحانی اور اصلاحی کارناموں کا نقشہ سامنے آگیا۔ حاضری تو دوار دن میں چند ہی مزاروں پر ہوسکی لیکن ابونعیم اصفہانی کی کتاب "حلیۃ الاولیار" اور علامہ ابن جوزی کی "صفۃ الصفوۃ" وغیرہ زیرِ نظر تھیں جن میں اس سرزمین کے سیکڑوں اولیار اللہ کا تذکرہ موجود

ہوتا تھا کہ صدر جمہوریہ کے ذہن میں عرب، اسرائیل جنگ اور مسئلہ فلسطین کی سیاسی اہمیت ہی نہیں بلکہ وہ اس کی مذہبی عظمت کو بھی اچھی طرح سمجھتے ہیں۔

اب رئاستہ دیوان الاوقاف کے رئیس اور کانفرنس کے روحِ رواں نافع قاسم کھڑے ہوئے اور انھوں نے مؤتمر کی کارروائیوں کو ضابطے، قاعدے میں لانے کے لئے صدر، دونائبین صدر اور جنرل سکریٹری کے نام برائے انتخاب پیش کیے، جو متفقہ طور پر منظور کئے گئے

(۱) صدر مولانا شیخ عبداللہ غوشہ قاضی القضاۃ مملکت ہاشمیہ اردن

(۲) نائب صدر اول مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی ہندوستان

(۳) نائب صدر دوم مولانا شیخ ہادی فیاض نجف اشرف

(۴) جنرل سکریٹری مولانا شیخ عبداللہ الشخلسی بغداد

تم ضرور ملک میں دو مرتبہ خرابی اور فساد پھیلاؤ گے، اور بڑی ہی سخت سرکشی کروگے
پھر جب اُن دو وقتوں میں سے پہلا وقت آگیا تو اے بنی اسرائیل ہم نے تم پر ایسے
بندے بھیج دیے جو بڑے ہی خوفناک تھے، وہ تمھاری آبادیوں کے اندر پھیل گئے
اور اللہ کا وعدہ تو اس لئے تھا کہ پورا ہو کر رہے۔

پھر دیکھو ہم نے زمانے کی گردش تمھارے دشمنوں کے خلاف اور تمھارے موافق
کردی اور مال و دولت اور اولاد کی کثرت سے تمھاری مدد کی اور تمھیں پھر ایسا بنا دیا کہ
بڑے جتھے والے ہو گئے ، یاد رکھو، اگر تم نے بھلائی کے کام کئے تو اپنے ہی لیے کئے
اور برائیاں بھی کیں تو اپنے ہی لیے کیں، — پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا
تو ہم نے اپنے دوسرے بندوں کو بھیج دیا تاکہ تمھارے چہروں پر رسوائی پھیر دیں اور اسی
طرح مسجد میں داخل ہو جائیں جس طرح پہلی مرتبہ حملہ آور گھسے تھے اور جو کچھ پائیں توڑ پھوڑ
کر برباد کر ڈالیں، — کچھ عجب نہیں کہ تمھارا پروردگار تم پر رحم فرمائے (اگر اب بھی باز
آجاؤ) لیکن اگر تم پھر سرکشی و فساد کی طرف لوٹے تو ہماری طرف سے بھی پاداشِ عمل
لوٹ آئے گی اور ہم نے منکرین حق کے لیے جہنم کا قیدخانہ تیار کر رکھا ہے،

بے شبہ قرآن اس راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھا
راستہ ہے اور ایمان والوں کو جو نیک عمل میں سرگرم رہتے ہیں بشارت دیتا ہے کہ انھیں
بہت بڑا اجر ملنے والا ہے اور اس بات کا بھی اعلان کرتا ہے کہ جو لوگ آخرت کا
یقین نہیں رکھتے ہم نے ان کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

تلاوت قرآن پاک کے بعد لجنۃ التحضیریہ (تیاری کمیٹی) کی طرف سے ڈاکٹر حمد الکبیسی نے ابتدائی
تقریر کی جس میں مؤتمر کی ضرورت اور مقاصد پر روشنی ڈالی گئی تھی، اس کے بعد رئیس جمہوریہ جناب
احمد حسن بکر کا پیغام ڈاکٹر احمد عبدالستار جواری نے پڑھ کر سنایا۔ پیغام میں اس اہم اجتماع کا خیر مقدم
کیا گیا تھا اور مسئلہ فلسطین کی اہمیت واضح کی گئی تھی، پیغام خاصا جاندار تھا اور اس سے اندازہ

میں جب وہاں کے حکمران کُل سیکھرا (Kulasekhara) کا انتقال ہوگیا تو پھر اس کے دو بیٹوں سندرا پانڈیا (Sundara Pandya) اور ویرا پانڈیا (Vira Pandya) میں تخت نشینی کے لئے جھگڑا ہونے لگا۔ سندرا پانڈیا کُل سیکھرا کی جائز اولاد تھی جبکہ ویرا پانڈیا اس کی ایک داشتہ کا لڑکا تھا، ویرا پانڈیا کو اپنے ایک پڑوسی حکمران راجہ بلال دیو کی حمایت حاصل تھی، لہٰذا سندرا پانڈیا نے دہلی کے مسلم سلاطین سے مدد چاہی، ان دنوں علاء الدین خلجی برسرِ اقتدار تھا، اس نے ملک کافور کو حکم دیا کہ وہ سندرا پانڈیا کی مدد کے لئے مدورا کی طرف کوچ کرے، چنانچہ ملک کافور نے ۱۳۱۱ء میں پانڈیا حکمرانوں کی اس سرزمین پر پہلی بار دھاوا بولا، ویرا پانڈیا اور اس کے ساتھیوں کو شکست دی، سندرا پانڈیا کو تخت پر بٹھایا اور اس کی حفاظت کے لئے ایک چھوٹی سی مسلم فوج کو وہاں چھوڑ کر چلا آیا۔ لیکن سندرا پانڈیا زیادہ دن برسرِ اقتدار نہ رہ سکا۔ ملک کافور کے ہٹتے ہی وہاں پھر سے خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ اور سندرا پانڈیا کے ساتھ ساتھ وہاں کے مسلم فوجی بھی اس کی نذر ہوگئے۔[1]

اس وقت تک دلی میں سلطان محمد بن تغلق، علاء الدین خلجی کی جگہ لے چکا تھا، اس کو جب سندرا پانڈیا کی موت اور مسلم فوج کے خاتمہ کی خبر ملی تو اس نے خواجہ جہاں کو حکم دیا کہ مدورا پر ازسرِنو فوج کشی کی جائے۔ چنانچہ خواجہ جہاں نے مدورا کو دوبارہ فتح کیا اور چونکہ سندرا پانڈیا کا کوئی وارث نہ تھا اس لئے جلال الدین احسن شاہ کو جو کہ محمد بن تغلق کے امرائے دربار میں سے تھا وہاں کا گورنر مقرر کیا گیا، اور اس علاقہ کی نگرانی کا کام اس کے سپرد ہوا۔

جلال الدین احسن صرف چھ سال تک مرکز کا وفادار رہا پھر وہ مرکز کی دوری سے فائدہ اٹھا کر وہاں کا خودمختار حاکم بن بیٹھا اور اپنے نام کا سکہ جاری کردیا۔ یہ گویا جنوبی ہند کی پہلی مسلم ریاست تھی جو اُن دنوں ریاست "معبر" کے نام سے مشہور تھی، اس کا نام معبر اس

1- N. Subramanian: History of Tamil Nad PP278-79

عرب ٹامل

از جناب ڈاکٹر حامد اللہ صاحب ندوی ایم جی، ایم رلیسرچ سنٹر۔ بمبئی

(۱)

اسلام سے پہلے اور بعد عرب عام طور پر بحری راستوں کے ذریعہ جنوبی ہند کے جن ساحلا
پر اترتے تھے ان میں ساحل ملابار (Malabar coast) کے بعد ساحل کا رومنڈا
(Coromandal coast) کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ وہ یہاں بھی نہ صرف
مالابار کی طرح اپنا تجارتی مال لے کر آتے تھے بلکہ سیلون، بنگال اور ایشیا کے جنوب مشرقی
ممالک کی طرف جانے کے لئے بھی ان کو یہیں رکنا اور آگے بڑھنا پڑتا تھا۔ یہ علاقہ
ان دنوں پانڈیا (Pandya) حکمرانوں کے ماتحت تھا، یہ حکمراں عربوں کے ساتھ بڑا
اچھا سلوک کرتے تھے اور انھیں خاص قسم کی سیاسی مراعات بھی دے رکھی تھیں، عرب
اس سرزمین میں نہ صرف آزادی کے ساتھ چل پھر سکتے تھے بلکہ انھیں اپنا مذہب پھیلانے کی
بھی پوری پوری اجازت تھی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ یہاں عربوں کی آمد و رفت کے ساتھ ساتھ
آہستہ آہستہ اسلام کی بھی تبلیغ ہونے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے ساحل کارومنڈل سے لگے ہوئے
سارے علاقوں میں مسلمانوں کی بستیاں قائم ہوگئیں، مسجدوں اور خانقاہوں کے مینار
گنبد دکھائی دینے لگے اور مقامی سیاست میں بھی ان کا اثر و رسوخ بڑھنے لگا۔

اُن دنوں پانڈیا حکمرانوں کا پایۂ تخت مدورا (Madura) تھا، سنہ ۱۰ - ۲۰۸

۲۔ علاء الدین سنہ ۱۳۴۱ء

۳۔ قطب الدین سنہ ۱۳۴۲ء

۴۔ غیاث الدین دامغانی سنہ ۱۳۴۲ء سے سنہ ۱۳۴۴ء تک

۵۔ ناصر الدین سنہ ۱۳۴۴ء

(سنہ ۱۳۴۴ء سے سنہ ۱۳۵۵ء تک کے سکے دستیاب نہیں ہوئے ہیں)

۶۔ عادل شاہ سنہ ۱۳۵۶ء

۷۔ فخر الدین مبارک سنہ ۱۳۵۹ء سے سنہ ۱۳۶۸ء تک

۸۔ علاء الدین سکندر سنہ ۱۳۷۲ء سے سنہ ۱۳۷۷ء تک

اس درمیان میں جنوب کے مختلف ہندو حکمران[۲] بھی جاگے۔ انھوں نے اپنی بکھری ہوئی قوتوں کو منظم کیا اور سلطنت وجیانگر کے نام سے ایک عظیم ہندو ریاست کی بنیاد رکھی جو آہستہ آہستہ بڑھتی اور پھیلتی رہی یہاں تک کہ دریائے کرشنا کے اس پار سارے جنوب پر اس کا جھنڈا لہرانے لگا، صرف مدورا کی یہ چھوٹی سی مسلم ریاست باقی رہ گئی تھی وہ اس طاقتور پڑوسی کے صبح و شام کے حملوں کی تاب نہ لا سکی، یہاں تک کہ سنہ ۱۳۷۷ء میں وجیانگر کے دوسرے راجہ بکا رایا (RuKKa II) کے عہد حکومت میں اس کا بھی خاتمہ ہوگیا۔

(۲)

اوپر ریاست معبر کے جن حکمرانوں کے نام دئے گئے ہیں ان میں صرف قطب الدین ناکارہ تھا اور غیاث الدین دامغانی سخت گیر، ورنہ اور حکمران نہایت انصاف پسند اور رعایا پرور تھے انھوں نے اپنی اس چھوٹی سی ریاست کو خوش حال بنانے اور ترقی دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی چنانچہ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ "عجائب الاسفار"[۳] جلد دوم باب ۱۲ میں جہاں

۔ محمود بنگلوری: تاریخ جنوبی ہند ص ۳۴۸۔ ۳۔ مطبوعہ بک لینڈ بندر روڈ کراچی ص ۲۴۷-۲۲۵

لئے پڑ گیا تھا کہ عرب اس کی ایک بندرگاہ کائل (Cail) سے ہوتے ہوئے ہی سیلون بنگال برما اور جنوب مشرقی ایشیا کے دوسرے ممالک کو جاتے تھے۔ اس مسلم ریاست کے حدود جنوب میں راس کماری (Cape Comerin) سے لے کر شرق میں نیلور (Nellore) تک پھیلے ہوئے تھے، مدورا اس کا پایۂ تخت تھا اور کائل اس کی بندرگاہ تھی جو اس وقت جنوبی ہند کی سب سے بڑی بندرگاہ تھی۔
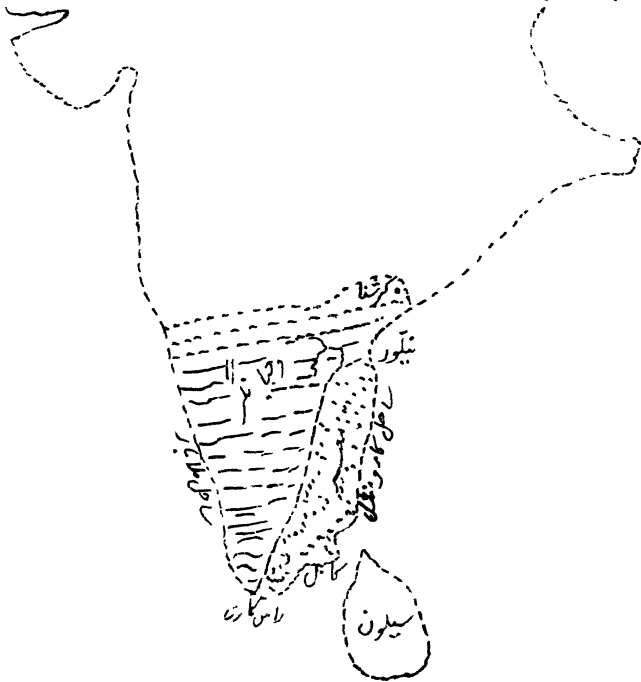
انتہائے جنوب کی یہ چھوٹی سی مسلم ریاست صرف ۴۸ سال تک قائم رہ سکی، اس کے جن حکمرانوں کے نام سفرنامۂ ابن بطوطہ اور سکّوں کی مدد سے تاریخ جنوبی ہند میں دئے گئے ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ جلال الدین احسن سنہ ۱۳۳۵ء سے سنہ ۱۳۴۱ء تک

بہت سی خیرات تقسیم کی گئی اور جب خطیب نے اس کے نام کا خطبہ
پڑھا تو اس پر سے بہت سے دینار اور درہم سونے اور چاندی کے
طباقوں میں سے نثار کئے گئے (ص ۳۴۴)

ریاست کی ہندو رعایا کو بھی ایک باعزت مقام حاصل تھا، لکھا ہے:

"جب میں کیمپ کے قریب پہنچا تو اس (غیاث الدین دامغانی) نے میرے
استقبال کے لئے ایک حاجب کو بھیجا وہ لکڑی کے برج میں بیٹھا ہوا تھا،
دستور ہے کہ بادشاہ کے روبرو کوئی بے موزے پہنے نہیں جاسکتا۔ میرے
پاس اس وقت موزے نہ تھے ایک ہندو نے موزے دیے حالانکہ
بہت سے مسلمان موجود تھے۔" (ص ۳۳۹)

ان بادشاہوں کو اپنی رعایا کے علاوہ اپنے پڑوسی ملکوں کے لوگوں کا بھی بہت خیال رہتا تھا، چنانچہ لکھا ہے:

"میں نے جزائر مالدیپ کے سفر کا ارادہ کیا تو سلطان نے وہاں کی
ملکہ کے واسطے تحفے اور امیروں وزیروں کے واسطے خلعتیں بھی تیار
کیں اور مجھے ملکہ کی بہن کے ساتھ اپنا نکاح کرنے کے لئے اپنا وکیل
مقرر کیا اور حکم دیا کہ تین جہازوں میں جزیرے کے محتاجوں کے لئے
صدقہ روانہ کیا جائے۔" (ص ۳۲۹)

ریاست میں مندر بھی محفوظ تھے، چنانچہ مدورا کے ایک وبائی بخار اور اس سے بچنے کا حال بیان کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے:

"بادشاہ شہر میں فقط تین دن ٹھیرا، پھر ایک نہر میں جو شہر سے تین میل کے
فاصلے پر تھی چلا گیا، وہاں ہندوؤں کا ایک مندر تھا، میں بھی جمعرات
کے دن وہاں پہنچ گیا۔" (ص ۳۴۳)

غیاث الدین دامغانی کے مظالم اور معبر کے بری و بحری حالات کا ذکر کیا ہے وہاں اس ریاست کی خوش حالیوں کی بھی ایک بڑی اچھی تصویر پیش کی ہے۔ اس ریاست کے پایۂ تخت مدورا کے متعلق لکھا ہے:

"یہ ایک بڑا شہر ہے، بازار اور کوچے نہایت وسیع ہیں، اول ہی اول اس کو میرے خسر سید جلال الدین احسن شاہ (ابن بطوطہ کی ایک بیوی جلال الدین کی لڑکی تھی) نے دار الخلافہ بنایا تھا اور دہلی کی نقل پر اس کی بنیاد ڈالی اور اچھی اچھی عمارتیں بنوائیں۔" (ص ۳۴۳)

اس ریاست کے ایک اور شہر پٹن کے بارے میں لکھا ہے:

"یہ بڑا شہر ہے اس کا بندرگاہ عجیب ہے، اس کے بندرگاہ میں ایک بڑا لکڑی کا برج بنا ہوا ہے جو موٹی موٹی لکڑیوں پر بنایا گیا ہے، اوپر سے مسقف ہے اور لکڑیوں کا زینہ ہے، جب دشمن کا خوف ہوتا ہے، جو جہاز بندرگاہ میں ہوتے ہیں وہ اس کے قریب لگائے جاتے ہیں، جہاز والے برج پر چڑھ جاتے ہیں اور دشمن سے بے خوف ہو جاتے ہیں۔ اس شہر میں ایک مسجد بھی پتھر کی بنی ہوئی ہے، اس میں انگور اور انار بہ کثرت ہیں۔" (ص ۳۴۲)

اس ریاست کے حکمرانوں کی علمی ادبی سرپرستیوں کا نقشہ کھینچتے ہوئے بتایا ہے:

"جب ناصر الدین کی بیعت کی گئی تو شاعروں نے اس کی تعریف میں قصیدے پڑھے، ان کو اس نے بڑے بڑے صلے دئے، سب سے پہلے قاضی صدر الزماں نے مبارکبادی کے اشعار پڑھے، ان کو پانچ سو دینار اور ایک خلعت دیا، پھر وزیر نے جس کو قاضی کہتے ہیں، اس کو دو ہزار دینار دیئے، اور مجھے تین سو دینار اور ایک خلعت دیا، فقرا اور مساکین کو

٥ السلطان	شاہ
الاعظم غیاث	دامغان
الدنیا و الدین	محمد
٥ علاء الدنیا	سکندر شاہ
والدین	السلطان [۴]

یہ اثرات محض مسجدوں، مقبروں، خانقاہوں اور سکّوں تک محدود نہ رہے بلکہ عوام کی زبانوں تک بھی پہنچے، اور پڑوسی ملکوں کے حکمرانوں تک کو ان کی زبان سمجھنا پڑتا تھا۔ چنانچہ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں "راجہ سیلان" سے اپنی ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "جب میں اس راجہ کے پاس گیا تو وہ میری تعظیم کے لئے کھڑا ہوگیا اور اپنے برابر مجھے بٹھالیا اور مہربانی کی باتیں کیں اور یہ بھی کہا کہ تمھارے ہمراہی بلاخوف وخطر جہاز سے اتریں اور جب تک ٹھیریں گے میرے مہمان ہوں گے کیونکہ بادشاہ معبر کی اور میری دوستی ہے، میں اس کے پاس تین دن تک ٹھیرا، ہر روز پہلے روز سے زیادہ تعظیم اور تکریم ہوئی وہ فارسی زبان سمجھتا تھا۔" [۵]

آج ٹامل میں عربی فارسی کی جو مذہبی، سیاسی اور انتظامی اصطلاحات رائج ہوگئی ہیں ان کو انھیں اثرات کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ [۶]

۴۔ محمود بنگلوری: تاریخ جنوبی ہند ص ۳۵۰۔ ۵۔ عجائب الاسفار جلد دوم ص ـــــ

۶۔ T.P. Munakshi Sumdaran: A History of Tamil Language P. 181–188

اِس سارے تاریخی پس منظر سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ٹامل ناڈ کی سرزمین کے لئے مسلمانوں کا وجود کوئی نامعلوم چیز نہیں ہے وہ ٹھیک اس وقت سے انھیں جانتی ہے جب سے کہ اسلام دنیا میں آیا۔ عربوں نے اپنی تجارت کے ساتھ اسلام کا پیغام بھی وہاں پہنچایا، خود بھی وہاں آباد ہوئے دوسروں کو بھی اپنے اثر سے مسلمان بنایا۔ اور پھر جب شمالی ہند میں سلاطین دہلی نے اپنے اثرات وسیع کرنا شروع کئے تو اس کے نتیجہ میں یہاں بھی ایک چھوٹی سی مسلم ریاست قائم ہوگئی اور بغیر کسی سیاسی دباؤ کے یہاں مسلمانوں کی تعداد میں اور اضافہ ہونے لگا۔ آج وہاں ہندوؤں کے بعد دوسری بڑی قومیت مسلمانوں ہی کی ہے، جس میں ایک اچھی خاصی تعداد ٹامل بولنے والے مسلمانوں کی ہے، اِن میں اکثر مدورا، تنجاور اور قدیم ریاست معبر کے دوسرے علاقوں میں آباد ہیں۔

(۳)

جب کوئی تہذیب کسی نئی جگہ جڑ پکڑتی ہے تو اس کے لوازمات بھی آہستہ آہستہ وہاں عام ہونے لگتے ہیں، تہذیب کے ان لوازمات میں سے ایک زبان بھی ہے، گو کہ ٹامل ناڈ کی علاقائی زبان آج کی طرح اُس دور میں بھی ٹامل ہی تھی، لیکن پہلے پہل جو عرب یہاں آکر آباد ہوئے اور بعد میں شمال کے جن مسلمانوں نے یہاں ۴۸ سال تک حکومت کی وہ بھی اپنے ساتھ اپنی اپنی زبانیں لائے تھے، جن کو انھوں نے وہاں رائج بھی کیا۔ اِن کا اثر آج بھی وہاں کی اس دور کی مسجدوں، خانقاہوں مقبروں اور سکوں میں دیکھا جا سکتا ہے چنانچہ اس عہد کے جتنے بھی سونے، چاندی اور تانبے کے سکے اب تک دستیاب ہوئے ہیں ان کی عبارتیں عربی فارسی میں ہیں اور کچھ اس طرح کی ہیں:

٥ سلالہ طٰہٰ ویٰسین	الواثق
ابو الفقراء والمساکین	بتائید الرحمٰن
جلال الدنیا والدین	احسن شاہ

۱۔ مفتاح الصبیان حصۂ اول : چالیس صفحات کا یہ چھوٹا سا رسالہ ۳۸ ابواب پر مشتمل ہے، اور اس میں عرب ٹامل سکھانے کے ابتدائی قواعد درج ہیں۔ پہلے ہی صفحہ پر بالترتیب عربی، اردو اور عرب ٹامل کے حروف تہجی دیے گئے ہیں اور پھر ہر باب میں عربی زبان کے ابتدائی قواعد کو چھوٹے چھوٹے جملوں کی مدد سے واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آخر میں عرب ٹامل میں لکھا ہوا ناشر کا اشتہار اور پرنٹ لائن ہے۔

۲۔ ترجمۂ اربعین حدیث مع نصیحت نامہ : یہ رسالہ ۴۸ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں چالیس منتخب احادیث کا بغیر عربی متن کے صرف ٹامل میں ترجمہ دیا گیا ہے۔ آخر میں چند دعائیں ہیں، ناشر کا اشتہار ہے اور عرب ٹامل میں مذکورہ ناشر کے شائع کئے ہوئے انیس رسائل کے نام اور ان کی قیمتیں درج ہیں۔

۳۔ تَوَدُّدُ وجنَاذِ مسئلہ مختصر : یہ رسالہ چالیس صفحات پر مشتمل ہے، اس میں مذہب اور تصوف کے مختلف مسائل پر چار مختلف عالموں کی طرف سے دئے ہوئے جواب سوالوں کے ساتھ درج ہیں اور آخر میں ناشر کی پرنٹ لائن ہے۔

۵۔ رحیا ترجمۂ کریا : یہ رسالہ ۴۸ صفحات پر مشتمل ہے، اس میں ایک ایک کرکے پہلے فارسی شعر دئے گئے ہیں اور پھر ان کے نیچے عرب ٹامل میں ان کا ترجمہ ہے۔ ابتدا میں ایک صفحہ کی تمہید ہے جس میں اس کے مترجم شاہ محمد ضیاء الدین القادری کا تذکرہ ملتا ہے۔ آخر میں ناشر کا اشتہار ہے۔

۵۔ گُرمَنِ مَالَیْ : یہ رسالہ منظوم ہے اور صرف ۱۶ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں ابوالحسن شاذلی کی شان میں، عرب ٹامل کے ایک شاعر نینا محمد پُلوَر کے قصائد ہیں۔

یہ سارے رسائل ایم، جی، شاہ الحمید لببیہ اینڈ سنس مدراس کے شائع کردہ ہیں۔ صرف "رحیا" میں سنہ طباعت درج ہے جو ۱۳۲۰ھ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ رسائل تقریباً ۷۶ سال پرانے ہیں۔ اِن رسائل کی مدد سے عرب ٹامل کا ایک صوتی وصرفی

علاوہ ازیں اس وقت تک ہندوستانی زبانیں زیادہ تر بولیوں کی شکل میں تھیں، اور اس وقت تک ہندوستان میں کوئی ایسا ترقی یافتہ رسم خط نہ تھا جو خواص سے نکل کر عوام تک پہنچ چکا ہو۔ اس کے برعکس مذہب اسلام کی آمد کے بعد ایک سو سال کے اندر اندر عربی زبان اتنی ترقی کر چکی تھی اور ولید بن عبد الملک اور حجاج بن یوسف کی کوششوں سے اس کا رسم خط اِس قدر آسان اور سائنٹفک اور معیاری بن چکا تھا کہ مسلم اثرات جہاں جہاں بھی پہنچے وہاں کے لوگوں نے شعوری و غیر شعوری طریقے پر اپنی اپنی بولیوں کے لئے اس رسم خط کو اپنا لیا، یہی حال شمالی ہند کا بھی ہوا، مسلمانوں کی آمد کے بعد وہاں بھی اس رسم خط نے مقبولیت حاصل کرنا شروع کر دی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں کی اکثر بولیاں اس رسم خط کا لبادہ اوڑھنے لگیں۔

ایسی صورت میں یہ ناممکن تھا کہ اس دور افتادہ علاقے میں عربی اور فارسی بولنے والے لوگ پہنچے ہوں، اور نصف صدی تک وہ علاقہ مسلم حکومت اور مسلم تہذیب کے زیر اثر رہا ہو اور وہاں یہ رسم خط اپنا اثر نہ دکھائے، وہاں کے غیر مسلموں کے متعلق تو کچھ کہا نہیں جا سکتا البتہ وہاں کے ٹامل بولنے والے مسلمانوں کے متعلق یہ یقینی ہے کہ وہ اس رسم خط سے نہ صرف متاثر ہوئے بلکہ ٹامل زبان کو اس رسم خط میں لکھنے کی ایک باقاعدہ تحریک بھی چلائی اور اس عربی رسم خط میں لکھی ہوئی ٹامل زبان کا نام انھوں نے "عرب ٹامل" رکھا، گو "عرب ملیالم"[7] کی طرح "عرب ٹامل" آج زندہ اور طاقتور نہیں ہے لیکن اس کا جو کثیر ادب آج بھی ان علاقوں میں محفوظ ہے وہ اس کے شاندار ماضی کا پتہ دیتا ہے اور آج بھی پرانے مذہبی لوگ اس کا نہایت ذوق و شوق کے ساتھ مطالعہ کرتے ہیں۔ اِس وقت ہمارے سامنے اِس عرب ٹامل کے حسبِ ذیل پانچ رسائل ہیں:

۷۔ تفصیل کے لئے دیکھئے مضمون "عرب ملیالم" مطبوعہ برہان دہلی اپریل ۱۹۷۳ء

انہیں مستقل طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

مصمتے : ٹامل میں مختلف مصمتی آوازوں کے اظہار کے لئے ۲۳ تحریری علامتیں ہیں جن میں بعض علامتیں ایک سے زیادہ آوازوں کو بھی ظاہر کرتی ہیں۔ اِن آوازوں کو عربی حروف کی مدد سے ظاہر کرنے کے لئے جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے اس کی تفصیل یہ ہے :

(الف) ۱۳ ٹامل آوازیں ایسی ہیں جو عربی فارسی میں بھی پائی جاتی ہیں اور ان کے اظہار کے لئے اِن زبانوں میں تحریری علامتیں بھی موجود ہیں، اِن علامتوں کو جوں کا توں رہنے دیا گیا ہے، جیسے :

ک [K] چ [č] ج [ǰ] ت [t]

ہ [h] ش [š] س [S] و [v]

ن [n] م [m]

ل [l]

ر [r]

ی [Y]

(ب) دس ٹامل کی آوازیں ایسی ہیں جن کے اظہار کے لئے عربی میں کوئی تحریری علامت نہیں۔ اس مشکل کام کو حل کرنے کے لئے عربی کی اُن تحریری علامتوں میں نقطوں کی مدد سے تصرف کیا ہے جو اُن سے قریبی آوازوں کے اظہار کے لئے مخصوص ہیں، جیسے

ٮ [p] ٮ [ṭ] [t]

ٮ [ṉ] ٮ [ṇ] ٮ [ŋ]

ٮ [ṟ] ٮ [r̤]

ض [ḻ] ض [ẓ]

[KŠ] اس آواز کے لئے عرب ٹامل میں کوئی علامت مخصوص نہیں کی گئی۔

جائزہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ جن کو اس مضمون سے دلچسپی ہو وہ ہمارا مضمون "عرب ملیالم"
مطبوعہ برہان بابت اپریل ۷۳ء کو بھی پیش نظر رکھیں۔

(۴)

مصوتے: ٹامل میں کل تیرہ مصوتوں کے لئے تحریری علامتیں پائی جاتی ہیں جن میں
گیارہ تو سادہ مصوتے ہیں اور دو جڑواں، ان میں سات سادہ اور دو جڑواں مصوتے
ایسے ہیں کہ جن کو عربی اعراب کسرہ، فتحہ، ضمہ اور عربی حروف علت 'ی' 'ا' 'و' اور ہمزہ
کی مدد سے حاصل کیا جاسکتا ہے، جیسے:

سادہ مصوتے: اِ [i]، اِیْ [i:]، اَ [a]، ا [a:]،
اُ [u]، اُوْ [u:] اُ [ɔ]

جڑواں۔ اَیْ [ɔi]، اَوْ [ɔu]

عرب ٹامل میں بھی ان مصوتوں کو حاصل کرنے کے لئے یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے
لیکن ٹامل کے اگلے اور پچھلے میانی مصوتے چاہے وہ مقصور ہوں یا ممدود ان کے اظہار
کے لئے عربی میں کوئی مخصوص علامت نہیں ہے، اس کمی کو پورا کرنے کے لئے عرب ٹامل میں
علامت ضمہ میں تھوڑا سا تصرف کیا گیا مثلاً یہ کہ جہاں [e] کی آواز پیدا کرنی ہو وہاں الف
کے نیچے الٹا پیش ــــ دیا گیا ہے اور جہاں [o] کی آواز پیدا کرنی ہو وہاں الف کے اوپر
الٹا پیش ـــ دیا گیا ہے اور ان کی ممدود آوازوں کے لئے اس کے بعد بالترتیب 'ی' اور
'و' بڑھا دیئے گئے ہیں۔ جیسے:

اِ [e] اِیْ [e:]
اُ [o] اُو [o:]

اس طرح کسی نئی علامت کا اضافہ کئے بغیر ہی خود عربی اعراب اور حروف علت کی مدد
سے عرب ٹامل میں ٹامل کے پورے تیرہ مصوتوں کے اظہار کی گنجائش پیدا کرلی گئی ہے۔

پ ع ف ب ق ک ل م ن ں ڹ ي و ه لا ء ي ے

(۵)

صرف ونحو: ہمارے سامنے اس وقت عرب ٹامل کے جو چار رسائل ہیں ان میں دو یعنی "تودّد وجناد مسئلہ" اور "ترجمہ اربعین حدیث" چونکہ خالص مذہبی احکام اور احادیث کی تفسیر سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے ان میں عربی الفاظ ومحاورات کا استعمال بڑی کثرت سے ملتا ہے تیسرا رسالہ "رحیا" بھی چونکہ اخلاقیات سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اس میں بھی عربی ترکیبوں کا استعمال کسی حد تک پایا جاتا ہے لیکن چوتھا "کُرمِن مائی" رسالہ چونکہ محض ایک تعریفی نظم ہے اس لئے اس میں سوائے ایک آدھ عربی نام کے اور کوئی عربی لفظ نہیں، یہ خالص ٹامل میں ہے اور محض رسم خط عربی ہے۔ اس طرح چونکہ ہمارے سامنے عرب ٹامل کے محض چند ہی نمونے ہیں اس لئے وثوق کے ساتھ یہ بتانا مشکل ہے کہ اس میں بحیثیت مجموعی رسم خط کے علاوہ عربی اور ٹامل کا ملاپ کس حد تک پایا جاتا ہے اور ان کی صرفی ونحوی کیفیت کیا ہے، البتہ مذکورہ بالا تین رسائل میں اس ملاپ کی جو جھلکیاں نظر آتی ہیں وہ یہاں پیش کی جاتی ہیں۔ چونکہ اس سے پیشتر ہمارا ایک مضمون عرب ملیالم پر برہان میں شائع ہوچکا ہے اور ٹامل اور ملیالم کے صرفی ونحوی اجزا ایک جیسے ہیں اس لئے ہم نے سہولت کی خاطر جگہ جگہ ٹامل کے ساتھ ملیالم کا بھی ذکر کردیا ہے۔

۱۔ اسمار (الف) عدد: ملیالم کی طرح ٹامل میں بھی علامت جمع کے طور پر [کھٖں] کا ہی استعمال ہوتا ہے، عرب ٹامل میں بھی ہمیں اس کا استعمال عربی اسمار کے ساتھ بہ کثرت ملتا ہے، اور یہ علامت عربی اسم واحد اور اسم جمع دونوں کے ساتھ مستعمل ہے۔

واحد کے ساتھ:	مثل + کھٖں	= مثلکھٖں	مثالیں
	حدیث + کھٖں	= حدیثکھٖں	احادیث
جمع کے ساتھ:	علمار + کھٖں	= علماکھٖں	علمار

(ج) بعض آوازوں کے لئے ٹامل میں دو دو علامتیں ہیں جیسے دندانی انفی آواز [ن] اور تھپکدار آواز [ز] ان کے اظہار کے لئے مذکورہ ایک ایک علامت ہی سے کام لیا گیا ہے۔

(د) ٹامل کی بعض تحریری علامتیں ایسی ہیں جو مسموع اور غیر مسموع دونوں آوازوں کی ترجمانی کرتی ہیں جیسے

'پ' 'ب' کی بھی آواز دیتی ہے

'ٹ' 'ڈ' کی بھی آواز دیتی ہے

'ت' 'د' کی بھی آواز دیتی ہے

'ک' 'گ' کی بھی آواز دیتی ہے

عرب ٹامل میں ان میں دو یعنی 'پ' اور 'ت' کی مسموع وغیر مسموع آوازوں کے لئے الگ الگ علامتیں ہیں، جیسے

ف [p] ب [b]

ت [t] د [d]

(د) عرب ٹامل میں [د] کی ٹامل آواز کے لئے مستقل طور پر علامت [ت] اور [ٿ] سے کام لیا گیا ہے۔

(ہ) عرب ٹامل میں چونکہ عربی اسما، صفات، افعال اور حروف جار وغیرہ کا بھی استعمال ہوا ہے اس لئے عربی کی وہ تحریری علامتیں بھی رہنے دی گئی ہیں جو عربی زبان سے مخصوص ہیں جیسے ث، ح، خ، ذ، ز، ص، ض، ط، ظ، ع، غ، ف، ق وغیرہ۔

اس طرح عرب ٹامل سکھانے والی مفتاح الصبیان میں عرب ٹامل کی جملہ آوازوں کے لئے جو تحریری علامتیں دی گئی وہ حسب ذیل ہیں:

ا ب ت ث ج چ ح خ د ڊ ر ڔ ز س ش ص ض ڞ ڝ ط ظ ع غ

(ج) مرکب اسمار : ہمیں عرب ٹامل میں مذکورۂ بالا مفرد اسمار کے علاوہ جو کہ مختلف ٹامل
ات حالت کے ساتھ ملتے ہیں بعض ایسے مرکب اسمار کی بھی مثالیں ملتی ہیں جن میں عربی اسمار
ساتھ ٹامل اسمار کو جوڑا گیا ہے جیسے :

اِرَوُ (رات) معراجِرَوُ (معراج کی رات)
ماثَم (مہینہ) رمضان ماثَم (رمضان کا مہینہ)

اس سلسلہ میں دو تعظیمی لاحقے خصوصیت کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔

آر (ar) (صاحب) جیسے قاضی + آر = قاضیار (قاضی صاحب)
مار (mar) (محترم) امت + مار = اُمتار (محترم امت)

۲۔ صفات : عرب ٹامل میں ایسی مثالیں متعدد ملتی ہیں جن میں ٹامل صفات عربی اسمار
ساتھ استعمال ہوئی ہیں، چونکہ ٹامل میں اردو کی طرح صفت ہمیشہ موصوف سے پہلے آتی ہے
لئے عرب ٹامل میں بھی یہ صفات موصوف کے پہلے ہی آئی ہیں جیسے اَرِنُتَ عالم (بہترین
م) ہَرِیَان عمل (صحیح عمل) نَلَّ کتاب (اچھی کتاب) وغیرہ۔

ان صفات میں ٹامل صفت عددی کا استعمال عربی اسمار کے ساتھ خاص طور پر زیادہ
ہے چاہے وہ صفت، عدد ذاتی (cardinal) سے متعلق ہو جیسے اُرُ حدیث
احدیث) اَیْنتُ وَقْتُ (پانچ وقت) وغیرہ، یا عدد ترتیبی (Ordinal) سے متعلق
جیسے مُونْرَاوَتْ سوال (تیسرا سوال) نَالَاوَتْ جواب (چوتھا جواب) وغیرہ یا عدد
ور (fractional) سے متعلق ہو جیسے کالُ سورۃ (پاؤ سورہ) وغیرہ

۳۔ ضمائر : عرب ٹامل میں، ٹامل کی شخصی ضمیریں تو ان کی اپنی اصلی حالت میں موجود ہیں،
ضمائر استفہامیہ اور ضمائر اشارہ کا استعمال عربی عناصر کے ساتھ بھی ملتا ہے، جیسے :

استفہام : یَارُ (کون) منافق یَارُ (منافق کون)
یِنَّ (کیا) حکم یِنَّ (حکم کیا)

آیات + کِض = آیاتکِض آیات

(ب) حالتیں : ٹامل میں بھی اسمار کی وہ سب حالتیں پائی جاتی ہیں جو اور زبانوں
عام ہیں یعنی فاعلی حالت، مفعولی حالت، آلی حالت، زمانی یا حالت مفعول ثانی، استخرا
حالت، اضافی حالت اور مکانی حالت اور ندائی حالت، ان حالتوں کی نشاندہی کے لئے
ٹامل اسمار کے ساتھ جو لاحقے استعمال ہوتے ہیں وہ تقریباً وہی ہیں جو ملیالم میں بھی پا
جاتے ہیں اور ان کا استعمال بھی عرب ٹامل میں عربی اسمار کے ساتھ ویسے ہی عام ہے جیسے
عرب ملیالم میں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

حالت :	علامت :	عربی اسمار کے ساتھ :
فاعلی	ھ	ھ
مفعولی	اَیْ (ai) = کو	عبادت + ای = عبادتَیْ (عبادت
		مسجد + ای = مسجدَیْ (مسجد کو
آلی	آل (a:l) = سے لہ	وجود + آل = وجودال (وجود
	اُوڈُ (o du) = کے ذریعے	جماعت + اُوڈُ جماعتوڈُ (جماعت کے ذ
زمانی یا مفعول ثانی	اُکُّ (uKKu) = کو لہ	عشاء + اُکُّ عشاءکُّ (عشاء
	اُکّاکَ (uKKaga) = کے لئے	عبادت + اُکّاکَ = عبادتّکاکَ (عبادت
استخراجی	اِل (il) = میں لہ	مذہب + اِل = مذہبِل (مذہب
	اِلرِنْڈُ (ilurundu) = میں سے	جیب + اِلرُنْڈُ جیبلرُنْڈُ (جیب
اضافی	اِنْ (in) = کا لہ	محبت + اِن محبّتِن (محبت
	اُدَیَّ (udayya) = کا	شیطان + اُدَیَّ شیطانُدَیَّ (شیطا
مکانی	اِل (il) = میں لہ	آخرت + اِل آخرتِّل (آخرت
	اِدَتِّلْ (idattil) = کے پاس	جاہل + اِدَتِّلْ جاہلِدَتِّلْ (جاہل
ندائی	اے (e:) = او	

قبول + چَیَّپَدُّم = قبول چَیَّپَدُّم (قبول کیا جائے گا)

قواعد کے مذکورہ بالا چند بنیادی عناصر سے ہٹ کر جب ہم عرب ٹامل کا بحیثیت مجموعی مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ترتیب الفاظ، جملوں کی ساخت اور دوسری نحوی خصوصیات کے معاملے میں وہ ٹامل سے کسی طرح الگ نہیں ہے بلکہ اسی کا ایک مخصوص تہذیبی رخ ہے۔ ذیل میں کچھ عبارتیں دی جاتی ہیں تاکہ اس کی مجموعی حیثیت واضح ہو کر سامنے آئے۔

سُوالْ: اِسْلَامِنُمّْ مَادْکَمْ یتَّنَی کَارِیَتّنْ فیرِلْ یدْ کَغَنْدّ تَایرکُمْ یِنْرْ کَیدّ ادْ

(اسلام کہلانے والا مذہب کتنے کاموں کے نام پر قائم ہے، کر کے، انھوں نے پوچھا)

جواب: اَیْنتُ کَارِیَتّنْ فیرِلْ یدْ کَفَنْدّ تَایرکُمْ یِنْرُ چَنّارْ کلمۃ تَضْکَی نُوبُفْ حَجّ زکاۃ اِوَیْنتُ کَارِیمْ چیوتَایرکُمْ

(پانچ کاموں کے نام پر قائم ہے، کر کے کہا، کلمہ، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ یہ پانچ کام کرنے چاہئیں)

سوال: شَہَادۃ کلمۃ دِنُوثْ ینّونُرْ کَیدّ ادْ

(کلمۂ شہادت کہیں تو کیا، کر کے، پوچھا)

جواب: اَتَاوَثُ اشھد ان لا الہ الا اللہ و اشھد ان محمداً عبدہٗ و رسولہٗ ینْرُ چَنّاجُنْ (وِجنّادِ مسئلہ ص ۱۳)

(یعنی اشھد ان لا الہ الا اللہ و اشھد ان محمداً عبدہ و رسولہ، کر کے، کہا)

حَدِیثُ یَا نَزُوْنُ طَالِبُ الْعِلْمِكَ اِرُ دِرْھَمْ وِضَکَاشْ کلْ تَالْ اللہ اَدِیَ فِی سَبِیْلِ تَنْکَ مَلَیْ کَبْدَتَّثُ بُولَا یرکُمْ (نَادْ فُتْ حدیث ص ۱۴)

یعَکّیُ (کہاں) مسجد یعَکّیُ مسجد کہاں

اشارہ: اِنُتَ (یہ) اِنُتَ کتاب (یہ کتاب)

اَنُتَ (وہ) اَنُتَ مدرسہ (وہ مدرسہ)

یِنُتَ کونسا یِنُتَ قلم (کونسا قلم)

حروف جار: متعدد حروف جار کا ذکر اسم کی حالتوں کے سلسلہ میں اوپر ہو چکا ہے، لیکن ان کے علاوہ بھی ہمیں بعض ایسے ٹامل حروف جار ملتے ہیں جو عرب ٹامل میں عربی اسماء کے ساتھ مختلف حالتوں میں استعمال ہوئے ہیں، جیسے مُنّیُ (آگے) فِنّیُ (پیچھے) وَرَیلُ (تک) فُوْل (جیسا) وغیرہ۔ اِن میں وَرَیلُ (تک) کا استعمال فاعلی حالت میں جیسے: صبح وَرَیلُ (صبح تک)، فُوْل (جیسا) کا استعمال مفعولی حالت میں جیسے نَبِیَّ فُوْلُ (نبی کے جیسا) اور مُنْ فِنْ (آگے پیچھے) کا استعمال زمانی حالت میں جیسے رنِیَّتِرْکُ مُنَّمْ فِنَّمْ (نیت سے پہلے بھی اور بعد بھی) میں ملتا ہے۔

اِن حروف جار میں حرف عطف [اُمْ] بھی شامل ہے جو عرب ٹامل میں عربی اسماء کے ساتھ بہ کثرت استعمال ہوا ہے جیسے بقرَۃِ وِنْرسورۃ تِلُمْ آل عمران سُورتِلُمْ (البقرہ نامی سورہ میں بھی آل عمران نامی سورہ میں بھی)

افعال: عرب ملیالم کی طرح عرب ٹامل میں بھی ایسے افعال کی بہتات ہے جو عربی مادّوں اور ٹامل لاحقوں سے مل کر بنے ہیں اور یہ ٹامل لاحقے زیادہ تر ذیلی افعال کی صورت میں ہوتے ہیں، مواد (corpus) کی کمی کی وجہ سے ان افعال کی پوری تفصیل زمانہ، گردان اور صیغوں کی قید کے ساتھ نہیں پیش کی جا سکتی تاہم بہ طور نمونہ ایسے افعال کی دو چار مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں:

موت + اُوان = موتاوان (مرے گا)

عمل + اُرکرُث = عملاکرُث (عمل ہوتا ہے)

ادبی مصادر میں آثار عمرینؓ

آثار عمرؓ

(۳)

جناب ڈاکٹر ابو النصر محمد خالدی صاحب پروفیسر شعبۂ تاریخ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد

زبرقان یعنی حصین بن بدر اپنی قوم کے صدقات (محصول کی رقم - مالگذاری) لے کر ابوبکر صدیق کے یہاں حاضر ہو رہے تھے راستہ میں حطیئہ سے ملاقات ہوئی زبرقان نے اس کو اپنا ایک تیر بطور نشان دے کر کہا قمر بن قمر ــــ چاند کے بیٹے چاند ــــ کو پکارو۔ لوگ پہچان لیں گے وہاں تم میری واپسی تک ٹھیرے رہو۔ لوٹ کر تمھیں نوازوں گا۔

حطیئہ تیر لے کر زبرقان کے قبیلہ میں آیا اور مہمان رہا۔

زبرقان کے چچازاد بھائیوں بنو قریع نے ازراہ حسد زبرقان کی بیوی کو یہ باور کرایا کہ وہ واپس ہو کر اپنی بیٹی کا حطیئہ سے نکاح کر دے گا۔ یہ بات حسب توقع زبرقان کی بیوی کو ناگوار گزری۔

بنو قریع کے سردار بغیض نے حطیئہ سے کہلایا۔ تم ہمارے مہمان رہو ہم تمھیں ایک سو اونٹ دیں گے۔ تمھارے خیمہ کی ہر ہر رسی سے کپڑوں سے بھری ہوئی ایک ایک پوٹلی لٹکا دیں گے۔ حطیئہ نے کہا: یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ میں اپنے میزبان کی اجازت بغیر نہیں آسکتا۔ بغیض نے کہا جب موسم بہار کے ختم پر یہ اپنے اونٹ اور بکری لئے چراگاہوں کی طرف

(جو کوئی ایک طالب علم کو ایک درہم چاندی کا سکہ دے گا وہ اللہ کی راہ میں ایک سونے کا پہاڑ دینے کے برابر ہوگا)

ازیں پس مکن تکیہ بر روزگار

کہ ناگہ زجانت برآرد دمار

اِتنِ بنِ کالَتِّنِ ہیلِ نَمفکیَّ وِیَّانیِ ہینلِ تِدیہ نو اُنّدیَ اُیدلِو نت

مَرنبتیّ نہ نبدِ ودمُ (رحیا ص ۴۴)

(اس کے بعد زمانہ پر بھروسہ مت کر، کیونکہ اچانک وہ تیری جان پر ہلاکت لے آئے گا۔)

تو میں ہمیشہ کے لئے رسوا ہو جاؤں گا۔

عمرؓ نے زبرقان سے یہ شفقت دیکھی تو حطیئہ کو ایک زمین دوز کٹھرے میں بند کر دیا۔ یہاں بڑے پڑے حطیئہ نے نہایت پر درد انداز میں چند رحم انگیز و رقت خیز اشعار عمرؓ تک پہنچائے۔ ان کا مضمون کچھ اس طرح تھا۔ امیر المومنین میرے بے بال و پر چوزوں کا کیا حال ہوگا۔ میں قید میں پڑا سڑتا رہوں تو اُن کو دانا دنکا کون چکائے گا۔ میری اور ان کی گذر بسر تو ذی مروتوں کی مدح پر تھی۔

عمرؓ نے یہ اشعار سنے تو زبرقان سے کہا حطیئہ اب تمھارا قیدی ہے۔ اب تم جانو اور وہ جانے۔ یہ سنتے ہی زبرقان نے اپنا عمامہ اتار حطیئہ کی گردن میں ڈال دیا۔ پھر اس کو کشاں کشاں اپنی قیام گاہ لے چلے۔ وہاں پہنچے ہی تھے کہ بنو غطفان کے سرداروں نے زبرقان سے استدعا کی کہ ہم تمھارے بھائی بند ہی تو ہیں۔ حطیئہ کو ہم پر ہبہ کر دو۔ زبرقان نے ان کی بات مان لی۔ حطیئہ آزاد ہو گیا۔

یہ دورِ عمرؓ کے عربوں کی زندگی کا مشہور واقعہ ہے۔ باختلاف خفیف متعدد کلاسکل مصادر میں ثابت ہوا ہے۔ درج صدر تلخیص راقم السطور کے شیخ السید محمد نوار ازہری کے استاد السید بن علی مرصفی کی بے بدل کتاب رغبۃ الآمل فی کتاب الکامل (مصر۔ ۱۳۴۶-۱۳۴۸ھ) کے مختلف مقاموں سے ماخوذ ہے۔

۱۴۔ یہ بیت زہیر کے جس قصیدہ کی ہے اس کے اشعار کی تعداد باسٹھ ہے۔

۱۵۔ عبدہ کا قصیدہ المفضلیات میں موجود ہے۔ یہ ان قصیدوں کا مجموعہ ہے جو المفضل بن محمد الضبی م ۱۸۹ نے بنو عباس کے دوسرے خلیفہ منصور م ۱۵۸ کے لڑکے کی تعلیم کے لئے جمع کیا تھا۔ یہ مجموعہ ایک سے زائد مرتبہ مع شرح چھپ گیا ہے۔

۱۶۔ ابوقیس ابن الاسلت کا قصیدہ بھی مفضلیات میں موجود ہے۔

۱ ایک ماہر ادیب و عالم نے اپنے وعظ میں فرمایا: .... میں تمھیں الفاظ کی خوبی اور جملوں کی شیرینی سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ معنی جب جاذب سماعت لفظوں کا لباس پہنتے ہیں، کوئی بلیغ

نکلیں اس وقت تم ہمارے یہاں آجاؤ۔ چناں چہ جب بنو زبرقان اپنے اونٹ بکری لئے چراگاہوں کی طرف چلے گئے تو حطیئہ بغیض کے یہاں آگیا۔ زبرقان کی بیوی نے اس کو اپنے یہاں روکے رکھنے کی کوئی کوشش بھی نہیں کی۔

اس واقعہ پر ایک سال گزر گیا۔ ابوبکرؓ کی وفات کے بعد زبرقان اپنی قیام گاہ لوٹے تو معلوم ہوا حطیئہ تو بغیض کے یہاں نکل گیا۔ زبرقان نے بنو قریع سے حطیئہ کو اپنے یہاں واپس بلانا چاہا تو حطیئہ نے انکار کردیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ زبرقان کی ہجو کہہ ڈالی۔ اس ہجو کی ایک بیت کا مطلب یہ تھا: زبرقان! دادو دہش کی باتیں چھوڑو۔ جود و کرم کے حصول کی فکر میں سفر کی صعوبتیں کیوں جھیلتے ہو۔ گھر میں بیٹھے رہو۔ تم تو صرف کچھ کھا پی لینے اور اوڑھے لپٹے رہنے کے سوا کیا کرسکتے ہو۔

ہجو فنی اعتبار سے نہایت بلند پایہ تھی۔ چند ہی دنوں میں دور ونزدیک مشہور ہوگئی۔ زبرقان عمرؓ کے یہاں فریاد کرتے آئے۔ حطیئہ کے اشعار سنائے اور انصاف رسانی کی التجا کی۔ عمرؓ نے کہا: یہ تو کوئی ایسی ہجو نہیں معلوم ہوتی کہ کہنے والے کو سزا دی جائے۔ کیا پیٹ بھر کھانا تن بھر کپڑا ڈھانک لینا کافی نہیں۔ یہ تو ہجو نہیں۔ یہ تو زیادہ سے زیادہ معاتبہ۔ ایک دوسرے سے خفگی وناراضگی کا اظہار ہے۔

زبرقان نے عرض کیا! تو کیا میری مردانگی — مروّت — صرف یہ رہ گئی ہے کہ صرف تن ڈھانک لوں اور سوکھے ٹکڑے توڑ کر دو گھونٹ پانی پی لوں۔

عمرؓ نے یہ سن کر حسان کو بلایا۔ وہ آئے۔ شعر سنے تو کہا: کم بخت نے زبرقان پر گوموت انڈیل دیا۔

یہ رائے سن کر آپ نے ایک کرسی منگائی۔ اس پر بیٹھے۔ حطیئہ کو اپنے سامنے بٹھایا۔ وہ سوئے اور ایک چھری منگائی۔ گویا آپ اس کی زبان کاٹ ڈالنا چاہتے ہیں۔ زبرقان کو ایسا ہی گمان ہوا تو انھوں نے کہا: امیرالمومنین یہاں میرے پاس نہیں۔ اس کی زبان ہی کٹ جائے

میں ملتا ہے۔ یہاں صرف ایک حوالہ پیش ہے یعنی صحیح البخاری کتاب الطب = ۷۶ باب اِنَّ من البیان سحرا = ۵۱

۱۸ ابوموسیٰ عبداللہ بن قیس اشعری کوفہ کے امیر تھے۔ اور زیاد ان کے کاتب (معتمد و مددگار) عمرؓ نے زیاد کی بعض جرارتمند تجویزوں (کام) پر انھیں معتمدی سے علیحدہ کر دیا۔ زیاد نے مدینہ حاضر ہو کر عمرؓ سے پوچھا۔ کیا آپ نے مجھے نااہل سمجھکر علیحدہ کیا ہے یا کام چور (خائن) خیال کر کے؟

عمرؓ نے فرمایا: دونوں میں سے ایک بات بھی نہیں۔ لیکن مجھے یہ بات پسند نہیں آئی کہ عام لوگوں پر تمھاری عقلی تفضیلت مسلط کر دوں۔

البیان والتبیین۔ ج ۱ ص ۲۶۰

ملحوظہ: اس اثر سے زیاد بن ابی سفیان کی انتظامی سوجھ بوجھ ظاہر ہے۔

۱۹ عمرؓ نے فرمایا: اللہ کی قسم میں ہرگز کسی مجرم سے اللہ کا حق لینا (سزا دینا) ترک نہیں کروں گا خواہ اس کی علالت ظاہر ہی کیوں نہ ہو جائے اور نہ اس لئے کہ مجھ پر اس سے کینہ رکھنے (یا بوقت فیصلہ میرے حالتِ غضب میں ہونے) یا شر کی طرف داری کرنے کا الزام عائد ہوگا۔

اللہ کی قسم! تم نے اس شخص کو جس نے تمھاری وجہ سے اللہ کی نافرمانی کی ایسی سزا دی جیسی کہ تم اس کی وجہ سے اللہ کی اطاعت کرنے میں دیتے۔

ملحوظہ: اللہ کی قسم ...... نافرمانی کی اس کا تم نے اس کو جو بدلہ دیا وہ ویسا ہوتا جیسا کہ تم اس کی وجہ سے اللہ کی اطاعت کرتے تو تم کو ملتا۔

البیان والتبیین۔ ج ۱ ص ۲۶۱

ملحوظہ: یہ اثر عمرؓ کے کسی مراسلہ کا جزء ہے۔ پورا متن سامنے نہ ہونے کی وجہ سے مطلب حسب دلخواہ واضح نہیں ہو سکا۔

۲۰ عمرؓ نے سعد بن ابی وقاص زہری م ۵۵ ھ کو لکھا: سعد! اللہ جب اپنے بندہ سے محبت کرتا ہے تو اس کو اپنی مخلوق میں محبوب بنا دیتا ہے۔ اللہ کے یہاں تمھارا کیا درجہ ہے اس

انھیں سلاست وسہولتِ بیان عطا کرتا اور صاحب بیان انھیں دلفریب طرزِ ادا بخشتا ہے تو ایسا کلام دلوں میں اتر کر سینوں میں گھر کر لیتا ہے۔

معنی کو اگر موزوں الفاظ کا جامہ پہنایا جائے اور وہ بلند پایہ اوصاف کے حامل ہوجائیں تو ایسے جملے وفقرے لوگوں کی نظر میں اپنی حیثیت سے زیادہ وقیع ہوجاتے اور اپنی حقیقی منزلت سے زیادہ بلند ہوجاتے ہیں۔

یہ عمل اسی نسبت سے ہوتا ہے جس نسبت سے انھیں زیبائی و زینت دی گئی اور اس کی اصلاح وسنوار کی گئی۔

جب دل اثر پذیری کے لحاظ سے نرم ہوں، خواہش قوی اور سینہ میں شیطانی فریبوں کے داخل ہونے کے راستے چھپے ڈھکے ہوں تو ایسی صورت میں موصوفۂ صدر کلام سے دھوکہ میں پڑ جانا یقینی ہے۔

جاحظ کہتے ہیں: یہ بات یاد رکھو، بھولو نہیں، اس میں کچھ کمی یا زیادتی بھی نہ کرو۔ عمرؓ نے احنف کو پورے ایک سال اپنے یہاں ٹھیرائے رکھا تاکہ اس سے بہت سی ملاقاتیں ہوتی رہیں، اس کے احوال پر نظر ہوسکے اور اس کی حیثیت کی چھان بین ہوجائے۔ اس مدت میں آپ احنف کی خوبی سے خوش ہوئے۔ اس کے برتاؤ میں نرمی اور اس میں تکلف کی کمی پائی۔ اس طور پر جب اچھی طرح جانچ ہوگئی تب ہی آپؓ نے احنف سے کہا:

رسول اللہ صلعم ہمیں دانشور منافقوں سے بار بار خبردار فرمایا کرتے تھے مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں تم بھی دو رُو داناؤں میں سے نہ ہو۔

(جاحظ نے کہا) اور کیوں نہ ہو اس لئے تو رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے بیان میں جادو ہوتا ہے۔

البیان والتبین۔ ج ۱ ص ۲۵۴ جاری

یادداشت: جاحظ نے رسول اللہ صلعم کا جو قول نقل کیا ہے وہ متعدد حدیثی مجموعوں

کے لئے جو بھلائی کما کر آگے بھیجو گے اللہ کے یہاں اسے موجود پاؤ گے۔

۲۳ عمرؓ نے فرمایا: حرکت ترک کرنے (بیٹھے رہنے) سے جوڑوں میں گرہیں پڑجاتی ہیں۔

البیان والتبین ۔ ج ۱ ص ۲۷۲

ملحوظہ: اس اثر کا سیاق یہ معلوم ہوتا ہے: بے وجہ چپ سادھ لینے سے زبان بند ہوجاتی اور گویائی بگڑ جاتی ہے۔

۲۴ عمرؓ نے فرمایا: آنسو بہاؤ۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اپنے کرتوتوں پر پچھتاوا بھی ہونا چاہیئے۔

اس کے ایک اور معنی بھی بآسانی یوں ہوسکتے ہیں: (مردوں پر) آنسو بہاؤ مگر اس کے ساتھ عبرت پذیری بھی ہونی چاہیئے (محض رونا دھونا مفید نہیں)

البیان والتبین ۔ ج ۱ ص ۲۹۷ نیز ج ۳ ص ۱۴۹

۲۵ محمد بن اسحاق م ۱۵۲ ھ یعقوب بن عتبہ م ۱۲۸ ھ انصار کے قبیلۂ خزرج کی شاخ زریق کے ایک شیخ سے روایت کرتے ہیں۔ جب نعمان بن منذر لخمی شاہِ حیرہ کی تلوار عمرؓ کے سامنے لائی گئی تو آپ نے جبیر بن مطعم صحابی م ۵۷ ھ کو بلایا۔ وہ آئے تو یہ تلوار انہیں دی۔ پھر آپؓ نے ان سے پوچھا: بتاؤ نعمان کس کی نسل سے تھا۔ جُبیر نے کہا: قنص بن سعد کی نسل سے باقی رہ گئے نعمان انھیں کی نسل سے تھا۔

جبیر عربوں کے ایک ممتاز نسب دان تھے۔

البیان والتبین ۔ ج ۱ ص ۳۰۳

۱ نسب دانوں میں یکے بعد دیگرے تین پشتیں مسلسل ایک ہی درجہ کی ہیں یعنی عمرو خطّاب و ن۔ عمرؓ نے نسب دانی اپنے والد خطّاب سے (اور خطاب نے اپنے باپ نفیل سے) ل کی تھی۔

عمرؓ نے کئی بار کہا: میں نے یہ خطّاب سے سنا۔ میں نے یہ خطّاب سے

کا اندازہ اس بات سے کرو کہ لوگوں کے دلوں میں تمہارا کیا درجہ ہے۔ تمھیں معلوم ہونا چاہئے کہ تمھارے لئے اللہ کے یہاں وہی کچھ ہے جو تمھارے اپنے یہاں اللہ کے لئے ہے (تم اللہ کی رضاجوئی کے لئے جو کچھ اور جیسا کچھ کروگے اس کے یہاں تم کو اتنا ہی اور ویسا ہی، بلکہ اس سے زائد ہی ملے گا)

ہم اللہ کے یہاں تمھاری حالت کا اندازہ اس سے کریں گے کہ اللہ کے بندوں کے دلوں میں تمھارا کیا حال ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ نے بعض لوگوں کے جسموں کا مالک بنایا ہے لیکن کسی کے قلب کا مالک نہیں بنایا۔ (جس سے جیسا سلوک ہوگا اس کے دل میں سلوک کرنے والے کی ویسی ہی جگہ ہوگی۔ بالفاظ دیگر احسان مند کے دل میں محسن کا مقام احسان کی نوعیت کے لحاظ سے متعین ہوگا)

البیان والتبیین ج ۱ ص ۲۶۱ + رسائل ج ۱ ص ۲۹۵

۲۱ عمرؓ نے ایک شخص سے کچھ دریافت کیا تو اس نے کہا: اللہ جانتا ہے۔ اس پر عمرؓ نے (گھڑک کر) کہا: ہم بدبخت و خوار ہوں گے اگر یہ نہ جانیں کہ اللہ جانتا ہے اگر تم سے کوئی کچھ پوچھے تو تمھیں چاہئے کہ جانتے ہوں تو جواب دیں ورنہ کہہ دیں کہ میں نہیں جانتا۔

البیان والتبیین ج ۱ ص ۲۶۱ و باختلاف خفیف

حیوان ج ۱ ص ۳۳۸

ملحوظہ: جاحظ نے عمرؓ کا جو اثر نقل کیا ہے وہ ہوبہو صحیح البخاری کتاب التفسیر ۶۵ باب قال ابراہیم الخ ۳۰ میں ثبت ہے۔

۲۲ عمرؓ نے کہا: تم جو کچھ دنیا میں جمع کرتے (چھوڑ جاتے) ہو تم کو آخرت میں وہی مل جائے گا

البیان والتبیین ج ۱ ص ۲۶۵

یادداشت: سورۃ البقرہ (آیت ۔ ۱۱۰) وسورۃ المزمل (آیت ۔ ۲۰) میں ہے۔ تم اپنی عاقبت

یں مانع ہوگی ؟

عمرؓ: نہیں۔ تم کو تمھارا حق دلانے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی (عدل گستری میں ذاتیات کیا دخل ؟)

ابومریم: ایسا ہے تو پھر کوئی حرج نہیں۔ عورتیں محبت کی وجہ ہی سے تو افسوس کرتی ہیں پ کو بھی محبت کی وجہ سے اپنے بھائی کا غم ہے۔ یہ ایک طبعی بات ہے)

البیان والتبیین۔ ج ۱ ص ۳۷۶ و ج ۲ ص ۸۹ و ج ۳ ص ۶۰

الحیوان۔ ج ۳ ص ۱۳۶، ج ۴ ص ۲۰۱

توضیح: عربوں میں مشہور ہے کہ زمین انسان یا کسی جانور (چوپایہ) کا خون جذب نہیں تی۔ خون خشک ہو کر ذروں کی صورت میں بکھر جاتا ہے۔ منقولہ فقرہ "زمین خون سے بغض رکھنے تک" ہمیشگی ظاہر کرنے کے لئے بولا جاتا ہے۔

قاضی علی بن مجاہد (م ۱۸۰ کے کچھ بعد) کابلی رازی اپنے شیخ ہشام بن عروہ ابن الزبیر ۱۴۶ھ) سے روایت کرتے ہیں: عمرؓ نے کسی سے حطیئہ کی ایک بیت سنی۔ اس کا مطلب ؛ وہ ایسا سخی داتا ہے کہ جب تم کڑکڑاتے جاڑے کی رات میں اس کی جلائی ہوئی آگ روشنی دیکھ کر اس کی بخشش چاہنے آؤ تو تم کو اچھی بخشش ملے گی۔ بہترین انسان وہ ہے بے کسوں، ناداروں کو غذا و گرمی پہنچانے کے لئے رات میں آگ روشن رکھتا ہے (کہ ہارا مسافر اس کو دیکھ کر اس کے پاس آجائیں اور سیر ہوں)

جب عمرؓ نے یہ بیت سنی تو کہا: یہ رسول اللہ صلعم کی صفت ہے۔

البیان والتبیین ج ۲ ص ۲۹

ابوالحسن علی بن محمد مدائنی م ۲۱۵ کہتے ہیں: رسول اللہ صلعم نے گھڑ دوڑ میں اپنا گھوڑا چھوڑا۔ اس مسابقت میں آپ کا مشکی گھوڑا سب سے آگے رہا۔ رسول اللہ صلعم یہ دیکھکر زانوں بیٹھ گئے اور فرمایا: یہ تو سمندر کی موجوں کی طرح رواں دواں ہے۔

نہیں سنا۔

البیان والتبیین ۔ ج ۱ ص ۳۰۴

۲۷ اس اثر کی تفصیل مع ترجمہ سلسلہ نشان چار ۔ ۴ میں گزر چکی۔

۲۸ عمرؓ نے عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب سے فرمایا : اے غوطہ خور غوطہ لگا۔

تشریح: مطلب یہ کہ غور کرو ۔ تمھاری رائے اکثر صائب ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ عمرؓ نے عبداللہ کو گفتگو کرتے سنا تو حاتم طائی کے دادا (یا اس کے پردادا) کے شعر کا مصرع بطور تمثیل دہرایا ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ : تم میں اپنے باپ دادا کی خوخصلت پائی جاتی ہے۔

البیان والتبیین ۔ ج ۱ ص ۱۳۳ نیز ج ۲ ص ۱۷۱

الحیوان ۔ ج ۱ ص ۳۳۵

۲۹ قبیلہ بنی حنیفہ کے ابو مریم ایاس اسلام لانے کے بعد ارتداد کے فتنہ میں مبتلا ہو [کر] اپنے قبیلہ کے ساتھ نبوت کا دعویٰ کرنے والے مُسَیلمہ کی طرف داری کی ۔ ابوبکرؓ نے ا[س] فتنہ کو ختم کرنے کے لئے یمامہ کی طرف جو فوج روانہ کی اس میں بدری صحابی زید بن خط[اب] بن نوفل بھی تھے ۔ جنگ میں یہ ابو مریم کے ہاتھ سے شہید ہوئے۔

فتنہ فرو ہوگیا ۔ ابو مریم نے توبہ کی ۔ نئے سرے سے اسلام قبول کیا ۔ اسلام پر ثابت رہے۔

ایک مرتبہ ابو مریم نے اپنا مقدمہ عمرؓ کے سامنے پیش کیا ۔ عمرؓ نے دیکھتے ہی کہا ! ا[للہ] کی قسم ! تمھارے ہاتھ میرے بھائی کی وفات ہونے کی وجہ سے میں تم کو کبھی پسند نہیں [کرتا] میرے دل میں تمھاری طرف سے اتنا زیادہ بُغض ہے کہ زمین کو خون سے بھی اتنا بغ[ض] نہیں ہوگا۔

ابو مریم : تو کیا آپ اس کی وجہ سے مجھے میرا حق نہیں دلائیں گے ۔ کیا یہ بات انصاف

بحر العلوم عبد العلی محمد فرنگی محلی

(۱)

ڈاکٹر محمد اقبال انصاری، صدر شعبہ اسلامیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اگرچہ ہندوستان عہد قدیم ہی سے علوم وفنون کا گہوارہ رہا ہے اور اپنی اسی خصوصیت کی وجہ سے اکثر بیرونی علماء وفضلاء کی توجہ کا مرکز بھی رہا ہے پھر بھی اسلام کی آمد نے اسے علوم ومعارف اسلامیہ کا گنجینہ وسرچشمہ بنا کر اس کی عظمت میں چار چاند لگا دئے۔ علوم اسلامیہ کے چشمے یوں تو پورے ہی ملک میں جاری ہوئے مگر صوبۂ اودھ کو نمایاں خصوصیت حاصل رہی جس نے بہت سی گرانقدر علمی خدمات انجام دیں اور بے شمار علماء وفضلاء کو جنم دیا۔ اودھ کے جو قصبات علمی خدمات میں پیش پیش رہے ان میں سہالی، دیوہ، گوپامئو اور بلگرام وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں جو اپنی علمی فیض رسانی میں دہلی اور لکھنؤ سے بجا طور پر ہمسری کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی (م ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء) نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ اس صوبہ میں دس دس پانچ پانچ میل پر شرفاء ونجباء کے دیہات آباد تھے جن میں اچھے اچھے نامور فضلاء درس دیتے تھے اور دور دور سے تحصیل علم کے لئے آتے تھے، سلاطین وقت کی طرف سے ان درسگاہوں کے لئے دیہات معاف تھے[1]۔

انھیں درسگاہوں میں ایک سہالی بھی تھا جو کسی زمانہ میں بہت بڑا قصبہ تھا۔ اساتذہ کے

۱۔ شبلی نعمانی: مقالات شبلی، ج ۳ (اعظم گڑھ، ۱۹۵۵ء)، ص ۱۰۳

یہ سن کر عمرؓ نے کہا: حطیئہ نے غلط کہا جب کہا کہ: ہمیں عمدہ گھوڑوں کی طلب لیے آرام کرتی ہے اور نہ وہ جو پہنچوں کے اوپر ہاتھی دانت کے کنگن پہنتی ہیں۔ (یعنی ہم مال یا عورت کی خواہش میں آرام طلب نہیں ہوئے)

البیان والتبیین ج ۲ ص ۲۹، ۳۰

توضیح: علماء ادب کا کہنا ہے کہ رسول اللہ صلعم کے فرمودے کا مطلب یہ نہیں کہ آپ کو صرف اپنے گھوڑے کے اوّل آنے سے مسرّت ہوئی بلکہ اس کا یہ مطلب ہے، جہاد میں قتال میں گھوڑے کی افادیت، اس لئے اس سے الفت کا اظہار۔ نیز یہ کہ جہاد وقتال کے لئے سامان، اس کے لوازم بھی زیادہ سے زیادہ اثر انداز ہونے والے ہونا چاہیئے۔

(باقی)

گذارش

خریداری برہان یا ندوۃ المصنفین کی ممبری کے سلسلہ میں خط وکتابت کرتے وقت یا منی آرڈر کوپن پر برہان کی چٹ نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولیں۔ تاکہ تعمیل ارشاد میں تاخیر نہ ہو۔

اس وقت بے حد دشواری ہوتی ہے جب ایسے موقعہ پر آپ صرف نام لکھنے پر اکتفا کرلیتے ہیں۔

(مینیجر)

نظام الدین محمد انصاری تھا۔ یہی نام خود انھوں نے اپنی تصنیفات فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت وغیرہ میں لکھا ہے اور یہی نام اس خط کے آخر میں بھی درج ہے جو انھوں نے فارسی میں شوال ۱۲۱۸ھ میں نواب عظیم الدولہ کے نام وظیفہ کے اجراء کے لئے لکھا تھا[1]۔ البتہ عمر رضا کحالہ نے غالباً عبد العلی اور نظام الدین کو لقب خیال کر کے آپ کا نام محمد بن محمد الکنوی لکھا ہے[2]۔ آپ کی کنیت ابو العیاش تھی اور بحر العلوم لقب اور ملک العلماء سرکاری خطاب تھا۔

تعلیم و تربیت

ابتدائی تعلیم اپنے نامور پدر بزرگوار ملا نظام الدین محمد سہالوی سے حاصل کی اور انھیں کی آغوش تربیت میں پلے بڑھے جب چار سال چار ماہ کے ہوئے تو ملّا صاحب نے بڑے تزک و احتشام سے اپنے اکلوتے فرزند کی بسم اللہ کی تقریب کی جس میں بڑے بڑے علمائے وقت فضلائے زمانہ اور مشائخ کبار نے شرکت کی۔ چونکہ آپ کو گھر ہی میں تعلیم و تربیت کی ساری سہولتیں فراہم تھیں اس لئے اپنے والد ماجد کی حیات میں کسی اور سے استفادہ کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ البتہ ان کے انتقال کے بعد انھیں کے شاگرد خاص ملّا کمال الدین سہالوی ثم فتحپوری (۱۱۰۴ – ۱۱۷۵ھ) سے جو جامع معقول و منقول، حامی فروع و اصول اور اپنے زمانہ کے ذہین افراد میں سب سے افضل تھے[3]، گاہے بگاہے بعض چیدہ مسائل میں کچھ استفادہ کیا۔

سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں آپ نے تعلیم سے فراغت حاصل کی، اس کے بعد آپ کے والد نے لکھنؤ کے قریب قصبہ کاکوری کے محلہ جزیہ گڑھی کے شیخ محمد مشرف عباسی کی دختر کے ساتھ آپ کا عقد کر دیا۔ اس کے چھ ماہ بعد ہی

۱۔ کوکن: مصدر سابق، ص ۲۳ – ۲۴

۲۔ عمر رضا کحالہ: معجم المولفین ج ۱۱ (دمشق: ۱۹۶۰ء)، ص ۲۶۲

۳۔ رحمان علی: مصدر سابق، ص ۳۹۹

امام، علماء کے قائد، علوم عقلی کے معدن اور فنون نقلی کے مخزن[1]، ملا قطب الدین شہید سہالوی (م ۱۱۰۳ھ/۱۶۹۱ء) اسی قصبہ سہالی کے رہنے والے تھے اور یہیں تمام عمر تدریس و تعلیم میں مشغول رہے۔ ان کے نامور فرزند، استاد الہند ملا نظام الدین محمد سہالوی (۱۶۷۶ء؟ - ۱۷۴۸ء) نے والد کی شہادت (۱۹ رجب ۱۱۰۳ھ) کے بعد صوبۂ اودھ کے دارالحکومت لکھنؤ لے اس علاقہ میں سکونت اختیار کی جو فرنگی محل کے نام سے موسوم ہے اور یہیں سے اطراف و اکناف ہند میں علم و حکمت کے دریا بہائے اور یہیں درس نظامی کی بنیاد رکھی جو نہ صرف جلد ہی علمی دنیا میں سکہ رائج الوقت بن گیا بلکہ امتدادِ زمانہ کے باوجود اب بھی رائج ہے اور اس نے ہندوستان میں جو گرانقدر خدمات انجام دی ہیں وہ کسی بھی تعارف کی محتاج نہیں ہیں، اس درس کی جہاں اور بہت سی خصوصیات ہیں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ پڑھنے والوں میں ایسی استعداد اور صلاحیت پیدا کر دیتا ہے کہ وہ فراغت سے پہلے ہی بعد کی منزلیں خود بخود طے کرنے لگتے ہیں[2]۔

نام و ولادت اسی نامور استاد الہند اور بانی درس نظامی کے فرزند ملا بحر العلوم کے نام سے مشہور ہوئے جو ۱۱۴۲ھ[3] میں فرنگی محل (لکھنؤ) میں پیدا ہوئے۔ اگرچہ عام طور پر تذکرہ نگاروں نے آپ کا نام عبد العلی لکھا ہے مگر درحقیقت آپ کا پورا نام عبد العلی محمد بن

۱۔ رحمان علی: تذکرہ علمائے ہند (فارسی) ترجمہ محمد ایوب قادری (کراچی: ۱۹۶۱ء)، ص ۳۹۰

۲۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو شبلی نعمانی: حوالۂ بالا، ص ۱۰۲ - ۱۲۵ نیز محمد رضا انصاری: بانی درس نظامی، استاذ الہند ملا نظام الدین (فرنگی محلی) (لکھنؤ۔ ۱۹۷۳ء)، ص ۲۵۹ - ۲۷۸

۳۔ تاریخ ولادت تخمینی ہے، میرے نزدیک یہ زیادہ قرین قیاس ہے۔ مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی نے تذکرہ علمائے فرنگی محل (لکھنؤ: ۱۹۳۰ء)، ص ۱۳۷ پر یہی سنہ درج کیا ہے۔ یوسف کوکن نے بحر العلوم (مدراس: ب، ت) ص ۱۴ پر سنہ ولادت ۱۱۴۴ھ لکھا ہے۔ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو رضا انصاری: مصدر سابق، ص ۱۴۶

موافق معمول کے گئے مگر صرف تماشہ دیکھنے کو، بٹیر کی کابک ہاتھ میں تھی۔ جس وقت دستاربندی کی رسم ادا ہونے لگی تو مجمع بہت زائد تھا، بحرالعلوم اس رسم کو دیکھنا چاہتے تھے اور اس غرض سے آگے بڑھے مگر کسی طرف بھی مجمع کی وجہ سے جانے نہیں پاتے تھے آخر ایک طرف سے جانے لگے تو کسی نے زور سے ان کو دھکا دیا اور کہا کہ کہاں بڑھے چلے جاتے ہو۔ بحرالعلوم نے جواب دیا کہ مجھکو نہیں جانتے میں ملا نظام الدین کا لڑکا ہوں۔ اس شخص نے کہا کہ سبحان اللہ، استاد الہند کے اگر تم بیٹے ہوتے تو مسند پر صدر میں ہوتے یا یہاں بٹیر کی کابک ہاتھ میں لئے ہوئے ہوتے، مولانا کی حمیت جوش میں آگئی کابک وہاں ہی توڑ ڈالی اور بٹیریں اڑادیں اور گھر آکر کتاب بغل میں لی اور پدر بزرگوار کے مزار پر حاضر ہوکر دیر تک گریاں رہے اس کے بعد کتاب کھول کر مطالعہ شروع کیا[۱]" اور علم کی طرف پوری طرح متوجہ ہو گئے یہاں تک کہ فاضل اجل اور عالم بے بدل، جامع معقول و منقول اور عارف ظاہر و باطن ہو کر مرجع انام ہو گئے اور جلد ہی ان کا نام ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پہونچ گیا۔

اسفار

بحرالعلوم کی شہرت پھیلتے ہی دور دور سے تشنگان علم اُن کے حلقۂ درس میں شرکت کی غرض سے جوق در جوق آنے لگے اور مدرسہ بحرالعلوم زبان زد خلائق ہو گیا مگر ایک ناخوشگوار واقعہ کی وجہ سے جو سراسر غلط فہمی پر مبنی تھا بحرالعلوم کو لکھنؤ کو خیرباد کہنا پڑا۔ ہوا یوں کہ عشرہ محرم کے روز فرنگی محل کی گلی سے تعزیوں کا جلوس گزر رہا تھا، خان بہادر سید نورالحسن بلگرامی اُس زمانہ کی ایک بہت ہی سربرآوردہ شخصیت تھے۔ شیعی مسلک رکھتے تھے اور رسوم عزاداری کے حد درجہ پابند تھے چنانچہ اپنے انھیں مذہبی اعتقادات کی بنا پر اپنے زنانہ حصہ مکان میں ایک امام باڑہ بھی قائم کیا جہاں تبرکات محرم میں علم، ماہی اور مراتب وغیرہ آج بھی موجود ہیں۔ موصوف بغرض علاج ان دنوں فرنگی محل میں مقیم تھے اور بوجہ علالت تعزیہ کی زیارت کو نہیں جاسکتے تھے اس لئے

۱۔ عنایت اللہ: مصدر سابق، ص ۱۳۸ نیز رضا انصاری: مصدر سابق، ص ۱۵۰

۹ر جمادی الاولی ۱۱۶۱ھ میں[1] ملا صاحب کا انتقال ہوگیا، اگرچہ انھوں نے اپنے اکلوتے بیٹے کی تعلیم وتربیت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا اور خود ہی ساری تعلیم دی تھی نیز ہمہ وقت اس کے متمنی رہتے تھے کہ وہ خلف الصدق ثابت ہو اور ملاقات کے لئے آنے والوں سے بھی بیٹے کے لئے دعا کے خواستگار رہتے تھے پھر بھی گھر کی ساری ذمہ داریاں سر پر آن پڑنے کے باوجود والد ماجد کی قائمقامی کا دھیان اس وقت تک نہیں ہوا جب تک کہ تابڑ توڑ دو واقعے پیش نہیں آئے۔

پہلا واقعہ تو یہ پیش آیا کہ "ملا صاحب کے وصال کے بعد ایک فقیر صدا لگاتا ہوا دروازے پر آیا، گھر سے ماما نے نکل کر اس کو کچھ دینا چاہا، فقیر نے نہیں لیا اور ملا صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی، ماما نے جواب دیا کہ ملا صاحب پردہ فرما چکے ہیں، فقیر نے کہا 'ان ملا صاحب سے نہیں اُن کے بیٹے ملا صاحب کو میں کہہ رہا ہوں' ماما نے اندر آکر ملا عبدالعلی سے کہا کہ باہر آپ کو کوئی پوچھ رہا ہے۔ نوجوان ملا عبدالعلی چھت پر کبوتر اڑا رہے تھے اُسی حالت میں باہر آگئے، ایک کبوتر بھی ہاتھ میں تھا فقیر نے کہا 'آپ کا یہ منصب نہیں ہے کہ کبوتر اڑائیں'۔ ملا عبدالعلی نے کبوتر ہاتھ سے اڑا دیا"[2]

دوسرا واقعہ غالباً اس کے بعد پیش آیا۔ اُس زمانہ میں دستور تھا کہ فاتحۃ الفراغ پڑھنے والے شاہ پیر محمد صاحب (۱۰۹۸ھ / ۱۶۸۷ء) کے موقعہ پر ٹیلہ کی مسجد پر حاضر ہوتے۔ جس میں اکابر علمائے ہند بھی موجود ہوتے اور انھیں کے سامنے دستار بندی ہوتی۔ اپنی زندگی میں استاذ الہند ہی مجلس کے صدر نشین ہوا کرتے تھے ان کی وفات کے بعد "جب یہ موقعہ دستار بندی کا آیا حضرت بحر العلوم بھی

۱۔ رضا انصاری : مصدر سابق، ص ۲۰۳ بحوالہ بحر زخار (فارسی) از وجیہ الدین اشرف لکھنوی مخطوطہ

۲۔ رضا انصاری : مصدر سابق، ص ۱۴۹ ــــ ۱۵۰

شاہجہاں پور شجاع الدولہ کے ماتحت چلا گیا جس کی عملداری میں لکھنؤ کا ناخوشگوار واقعہ پیش آیا تھا، اس لئے تقریباً بیس سال قیام کے بعد مولانا کو شاہجہاں پور کو بھی خیرباد کہنا پڑا[1]

یہاں سے نواب فیض اللہ خاں والی رامپور کی دعوت پر بحرالعلوم وہاں تشریف لے گئے۔ انھوں نے بھی مولانا اور ان کے طلبار کی بڑی تعظیم و تکریم کی اور ہر ممکن سہولت بہم پہونچائی مگر طلبار کی کثرت اور ریاست کی خستہ حالی کے باعث وہ اُن کا تمام خرچ برداشت کرنے میں دقت محسوس کرنے لگے تھے کہ اسی اثنا میں منشی صدر الدین بوہاری نے مولانا سے اپنے مدرسہ جلالیہ میں تعلیم و تدریس کی درخواست کی جو انھوں نے ۱۱۸۹ھ مطابق ۱۷۷۵ء میں سید جلال الدین تبریزی (م ۶۴۲ھ) کی یادگار میں بوہار (بہار) (ضلع بردوان) میں قائم کیا تھا۔ چنانچہ تقریباً چار سال رامپور قیام کے بعد مولانا نے مع طلبہ کے ساتھ بوہار کا رُخ کیا جہاں آپ کا بڑی ہی گرم جوشی کے ساتھ استقبال ہوا اور منشی صدر الدین بوہاری نے مناسب مشاہرہ مقرر کر دیا اور طلبا کے قیام و طعام کا بھی معقول بندوبست کر دیا اور مولانا ایک مدت تک وہاں درس و تدریس میں مشغول رہے[2] مگر کچھ مفتریوں نے ان کے اور منشی صدر الدین بوہاری کے درمیان رنجش پیدا کر دی جس سے مولانا بیحد دل برداشتہ ہو گئے جب اس کی خبر نواب والاجاہ محمد علی رئیس کرناٹک کو پہونچی جو اصلاً گوپامئو (ضلع ہردوئی) کے تھے تو انھوں نے ایک خط مع سفر خرچ مولانا کو مدراس بلانے کے لئے بھیجا[3] جسے مولانا نے قبول فرمایا۔

"اغصان الانساب"[4] میں لکھا ہے کہ مولانا بوہار سے اٹھ کر پہلے کلکتہ آئے، یہاں نظام

۱۔ الحسنی: مصدر سابق، ص ۲۸۴ نیز شبلی نعمانی: مصدر سابق، ص ۱۱۸

۲۔ شبلی نعمانی: مصدر سابق، ص ۱۱۸ نیز کوکن مصدر سابق، ص ۱۵

۳۔ رحمان علی: حوالہ بالا ص ۳۰۴ - ۳۰۵

۴۔ اغصان الانساب (فارسی) از رضی الدین محمود فتحپوری (مخطوطہ)

تعزیہ کو بلوا کر اپنی قیامگاہ سے اس کی زیارت کرنا چاہی، درمیان میں ملا بحرالعلوم کا مدرسہ پڑتا تھا جو اُس وقت حضرات حسنین کی نذر کے شربت پر فاتحہ دے رہے تھے، چونکہ اُس طرف سے تعزیہ کے گذرنے کا دستور نہ تھا اس لئے جب انھوں نے تعزیہ اُدھر آتے دیکھا تو اشارہ سے تعزیہ روکنے کو کہا۔ طلبا ریہ سمجھے کہ بحرالعلوم کے اشارہ کا مطلب یہ ہے کہ تعزیہ توڑ ڈالا جائے چنانچہ انھوں نے اسے فوراً توڑ ڈالا۔ فاتحہ سے فراغت کے بعد بحرالعلوم طلبا پر بیحد برہم ہوئے مگر جو کچھ ہونا تھا وہ ہوچکا تھا اور اس نے جلد ہی سنی شیعہ نزاع کی شکل اختیار کر لی۔ لکھنؤ میں اس وقت شیعہ عملداری تھی اور شجاع الدولہ کا زمانہ تھا۔ اس کے باوجود بحرالعلوم کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ چشم زدن میں عوام وخواص کی اتنی بڑی فوج ان کی مدد کو آگئی کہ حکومت ان کا ایک بال تک بیکانہ کرسکی اور بالآخر صلح کے لئے پیغام بھیجا جسے انھوں نے مسلمانوں کے درمیان باہمی مصالحت کی خاطر قبول کرلیا[1]

اگرچہ یہ واقعہ بحرالعلوم کی مقبولیتِ عام کی دلیل تھا پھر بھی اعزا واحبار کے مشورہ پر مولانا نے لکھنؤ سے شاہجہاں پور منتقل ہوجانا ہی مناسب خیال کیا جہاں ان دنوں حافظ رحمت خاں روہیلہ کی حکومت تھی، انھوں نے آپ کی بیحد تعظیم وتکریم کی اور آپ کے ونیز طلبا کے تمام مصارف خود برداشت کئے۔ شاہجہاں پور پہونچتے ہی آپ کی شہرت سُن کر دور دور سے طلباء وہاں جوق درجوق آنے لگے اور ان کی تعداد میں یوماً فیوماً اضافہ ہونے لگا اس کے باوجود مولانا نے تدریس کے ساتھ تصنیفی مشاغل کو بھی جاری رکھا مگر ۱۱۸۸ھ میں حافظ رحمت خاں نے شہادت پائی جس کے بعد تمام

۱۔ رضا انصاری: مصدر سابق ص ۱۵۲ بحوالہ رسالہ قطبیہ از ملا عبدالاعلی فرنگی محلی (فارسی، قلمی) ص ۳۳

۲۔ نواب عبداللہ خاں ملاحظہ ہو عبدالحی الحسنی: نزہۃ الخواطر وبہجۃ المسامع والنواظر (حیدرآباد ۱۹۵۹ء) ج ۷ ص ۲۸۴

۱۹۵۴ء

حیات شیخ عبدالحق محدّث دہلوی ۔ العلم والعلماء ۔ اسلام کا نظام عفت و عصمت ۔

تاریخ صقلیہ ، تاریخ ملت جلد نہم

۱۹۵۵ء

اسلام کا زرعی نظام ، تاریخ ادبیات ایران ، تاریخ علم فقہ ، تاریخ ملت حصہ دہم سلاطین ہند اوّل

تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی

۱۹۵۶ء

ترجمان السنہ جلد ثالث ۔ اسلام کا نظام حکومت (طبع جدید و لپذیر ترتیب) حد بین الاقوامی

سیاسی معلومات جلد دوم خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات

۱۹۵۷ء

لغات القرآن جلد پنجم صدیق اکبرؓ ، تاریخ ملت حصہ یازدہم سلاطین ہند ، انقلاب [illegible] بعد

۱۹۵۸ء

لغات القرآن جلد ششم سلاطین دہلی کے [illegible] تاریخ ہجرت [illegible] معلومات جلد سوم

۱۹۵۹ء

حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط ، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ، مصائب سرورِ کونین ۔

۱۹۶۰ء

تفسیر مظہری اُردو پارہ ۲۹ ۔ ۳۰ ۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سرکاری خطوط

امام غزالی کا فلسفۂ مذہب و اخلاق ۔ عروج و زوال کا الٰہی نظام ۔

۱۹۶۱ء

تفسیر مظہری اُردو جلد اوّل مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط ۔ اسلامی کتب خانے عرب دُنیا

تاریخ ہند پر نئی روشنی

۱۹۶۲ء

تفسیر مظہری اُردو جلد دوم ۔ اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں معارف الآثار ۔

نیل سے فرات تک

۱۹۶۳ء

تفسیر مظہری اُردو جلد سوم ۔ تاریخ ردہ ، سرکشی ضلع بجنور ۔ علماء ہند کا شاندار ماضی اوّل

۱۹۶۴ء

تفسیر مظہری اُردو جلد چہارم حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط ، عرب و ہند عہد رسالت میں ۔

ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں ۔

۱۹۶۵ء

ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اوّل ۔ تاریخی مقالات

لادینی دور کا تاریخی پس منظر ایشیا میں آخری نوآبادیات

۱۹۶۶ء

تفسیر مظہری اُردو جلد پنجم ، مور عشق ۔ خواجہ بندہ نواز کا تصوّف و سلوک ۔

ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں ۔

۱۹۶۷ء

ترجمان السنہ جلد چہارم تفسیر مظہری اُردو جلد ششم حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کی فقہ

۱۹۶۸ء

تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم ، یمن تذکرے ۔ شاہ ولی اللہؒ کے سیاسی مکتوبات

اسلامی ہند کی عظمت رفتہ ۔

۱۹۶۹ء

تفسیر مظہری اُردو جلد ہشتم ، تاریخ الفخری ، حیات ذاکر حسین ۔ دین الٰہی اور اس کا پس منظر

۱۹۷۰ء

حیات عبدالحی ، تفسیر مظہری اُردو جلد نہم ، مآثر و معارف ، احکام شرعیہ میں حالات زمانہ کی رعایت ۔

۱۹۷۱ء

تفسیر مظہری اُردو جلد دہم ، بیماری اور اس کا روحانی علاج ۔ خلافت راشدہ اور ہندوستان

۱۹۷۲ء

فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر ۔ انتخاب الترغیب والترہیب ۔ اخبار التنزیل

عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان

حیدرآباد اور سلطان حیدر [علی] ٹیپو سلطان کا باپ) کی متعدد عرضیاں آئیں کہ یہاں قدم رنجہ فرمائیے لیکن چونکہ ہم وطنی کا واسطہ تھا اس لئے مولانا نے مدراس کو ترجیح دی[1]۔

جب نواب والاجاہ کو بحرالعلوم کے مدراس کے قریب پہونچنے کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے اپنے کچھ حاشیہ برداروں اور عزیزوں کو استقبال کے لئے بھیجا اور ۲۴ ذی الحجہ ۱۲۰۵ھ کو جب وہ مدراس پہونچے تو بیرون شہر سے علماء واعیان باپیادہ ہمراہ ہوکر انھیں نواب کرناٹک کے دولت خانہ تک لائے جہاں نواب والاجاہ نے مع شہزادوں کے استقبال کیا اور جب مولانا نے پالکی سے اترنے کا قصد کیا تو نواب نے اشارہ کیا کہ تشریف رکھئے اور پھر خود اپنے اور اپنے خویش واقارب کے کاندھوں کے سہارے پالکی صدر مقام تک لے گئے اور" جہاں خود اس کی نشست تھی مولانا کو اس جگہ بٹھا دیا اور مولانا کے قدم چومے اور کہا اللہ اکبر! یہ نصیب کہاں تھے کہ حضور کا قدم میرے گھر آتا۔"[2] پھر مولانا کا ایک ہزار روپیہ مشاہرہ مقرر کر دیا اور ایک بڑا مدرسہ تعمیر کرایا جس میں مولانا درس دیتے تھے۔ نواب ساری عمر پہلے ہی کی طرح بحرالعلوم کی آمد پر ان کا احترام کرتے اور دروازہ تک رخصت کرنے جاتے۔ نواب والاجاہ کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے عمدۃ الامراء اور تاج الامراء نیز موخرالذکر کی دستبرداری کے بعد والاجاہ کے پوتے عظیم الدولہ نے بھی بحرالعلوم کے اعزاز و اکرام میں کوئی فروگذاشت نہیں کی اور مولانا نے اپنی زندگی کے بقیہ دن وہیں گذارے۔

(باقی)

۱۔ شبلی نعمانی: مصدر سابق، ص ۱۱۹

۲۔ ایضاً بحوالہ اغصان اربعہ (فارسی) از ملا ولی اللہ فرنگی محلی (م ۱۲۷۰ھ) لکھنؤ: ۱۲۹۸ ص ۱۲۴

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

مرتب

سعید احمد اکبرآبادی

Regd. No. D. (D) ... Phone 262815 MAY 1975

Subs. Rs 15-00 Per Copi Rs.1-50

حکیم مولوی محمد ظفر احمد خاں پرنٹر پبلشر نے یونین پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر
دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی ملا سے شائع کیا۔

جلد ۷۴ | ماہ جمادی الاول ۱۳۹۵ھ مطابق جون ۱۹۷۵ء | شمارہ ۶

فہرست مضامین

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت - اسلام کا اقتصادی نظام - قانون شریعت کے نفاذ کا مسئلہ - تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام - سوشلزم کی بنیادی حقیقت -

سنہ ۱۹۴۰ء غلامانِ اسلام - اخلاق و فلسفۂ اخلاق - فہم قرآن - تاریخ ملت حصہ اول "نبی عربی صلعم" - صراط مستقیم (انگریزی)

سنہ ۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اوّل - وحی الٰہی - جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول -

سنہ ۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم - اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات) مسلمانوں کا عروج و زوال - تاریخ ملت حصہ دوم "خلافتِ راشدہ" -

سنہ ۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد اول - اسلام کا نظامِ حکومت - سراپیہ - تاریخ ملت حصہ سوم "خلافتِ بنی امیہ"

سنہ ۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم - لغات القرآن جلد دوم - مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت (کامل)

سنہ ۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم - قرآن اور تصوف - اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے)

سنہ ۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اوّل - خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ - جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو -

سنہ ۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظمِ مملکت - مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم - حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ -

سنہ ۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم - تاریخ ملت حصہ چہارم "خلافتِ ہسپانیہ" - تاریخ ملت حصہ پنجم "خلافتِ عباسیہ اول"

سنہ ۱۹۴۹ء قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے (کامل) تاریخِ ملت حصہ ششم "خلافتِ عباسیہ دوم" بصائر -

سنہ ۱۹۵۰ء تاریخِ ملت حصہ ہفتم "تاریخِ مصر و مغربِ اقصیٰ" تدوین قرآن - اسلام کا نظامِ مساجد - اشاعتِ اسلام یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا -

سنہ ۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم - عرب اور اسلام - تاریخِ ملت حصہ ہشتم "خلافتِ عثمانیہ" جارج برنارڈشا

سنہ ۱۹۵۲ء تاریخِ اسلام پر ایک طائرانہ نظر - فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اوّل (جس کو از سرِ نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے - کتابتِ حدیث -

سنہ ۱۹۵۳ء تاریخ مشائخ چشت - قرآن اور تعمیرِ سیرت - مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ -

بیدار مغز اور عربی و انگریزی دونوں زبانوں کے بہت عمدہ مقرر ہیں لائق مبارکباد ہیں کہ یہ سب کچھ در اصل انھیں کی کوششوں اور حسن تدبیر کا نتیجہ تھا۔

اس موقع پر اس کا اظہار بھی ضروری ہے کہ اسلامیات پر جو دو روزہ سمینار ہوا وہ ہمارے نزدیک خاطر خواہ کامیاب نہیں رہا۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ اول تو کسی غیر عرب کو اظہار خیال کا موقع ہی نہیں دیا گیا اور پھر عرب حضرات نے جو کچھ کہا وہ بہت سرسری اور سطحی تھا اور معیار سے گرا ہوا تھا، ان کی تقریروں سے معلوم ہوتا تھا کہ ان حضرات نے موضوعِ بحث پر سنجیدگی سے غور و فکر کیا ہی نہیں ہے اور تقریر شروع کرتے وقت جو کچھ ان کے ذہن میں آگیا ہے وہ کہہ ڈالا ہے، حد یہ ہے کہ شیخ جامعہ ازہر، قاہرہ ڈاکٹر عبدالحلیم محمود کی تقریر بھی بالکل سطحی اور غیر محققانہ تھی، بہر حال جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب انجمن اسلامیہ کو چاہئے کہ اسلامیات کی تعلیم اور اس پر ریسرچ کا نظام مرتب کرنے کی غرض سے اسلامیات کے ماہرین و محققین کی ایک کمیٹی مقرر کرے اور ان کے مشورہ اور رائے سے اس تجویز کو عملی شکل دے۔

خوشی کی بات ہے کہ ہمارے عزیز اور نہایت فاضل دوست پروفیسر خلیق احمد نظامی مملکت شام میں ہندوستان کے سفیر مقرر ہوئے ہیں اور انھوں نے پچھلے دنوں اپنے عہدہ کا چارج لے بھی لیا ہے، موصوف بین الاقوامی شہرت کے مورخ، تاریخِ تصوف کے ایک نہایت وسیع النظر عالم، محقق اور مصنف ہیں، علی گڑھ میں مختلف انتظامی اداروں کے سربراہ کی حیثیت سے انھوں نے جو کام کئے ہیں انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ علم و فضل کے ساتھ اُن کی تنظیمی اور انتظامی صلاحیتیں بھی اعلیٰ ہیں۔ پیچیدہ سے پیچیدہ معاملہ ہو وہ فیصلہ جلد کرتے ہیں، فرائض منصبی حاضر حواسی اور محنت سے بجا لاتے ہیں، امید ہے وہ اپنی زندگی کے اس نئے میدان میں بھی بہمہ وجوہ کامیاب رہیں گے، نظامی صاحب نے ساری عمر کبارِ اولیاء اللہ اور اعاظم صوفیا و مشائخ کی معنوی صحبت و معیت میں گذاری ہے اور شام طریقت و معرفت کا گہوارہ رہا ہے اس بنا پر توقع ہے کہ شام میں سفیرِ ہند کی حیثیت سے اُن کا قیام علمی اور عملی دونوں حیثیتوں سے ان کے

نظرات

مزارات وقبور کی تعمیر کے بارہ میں اسلام کی جو تعلیمات ہیں وہ ظاہر ہیں لیکن اس کے باوجود سلاطین اعیان و امرا، اکابر صوفیا و مشائخ، ائمۂ مذاہب فقہیہ اور علماء کے نہایت عالیشان مقبرے عالم اسلام کے گوشہ گوشہ میں پھیلے ہوئے اور مرجع عوام وخواص ہیں۔ اسی نوع کے مقابر میں داؤدی بوہرہ جماعت کے داعی سیدنا طاہر سیف الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مقبرہ جس کا افتتاح صدر جمہوریہ فخرالدین علی احمد صاحب نے گذشتہ ماہ اپریل میں بمبئی میں کیا تاریخی اعتبار سے ایک اہم اضافہ ہے اس کی خصوصیت یہ ہے کہ کم وبیش ایک کروڑ روپیہ کی لاگت سے تیار ہوا ہے اندر قبر بالکل سادہ ہے، اُس پر کوئی نقش ونگار نہیں لیکن دیواروں اور چھت پر پورا قرآن مجید سونے کے حروف میں اور بسم اللہ اور سورۂ قل ہو اللہ یاقوت میں کندہ ہیں

اس مقبرہ کے افتتاح کی تقریب نہایت شاندار اور بڑے طمطراق سے منائی گئی جس میں عرب ممالک اور دوسرے ممالک اور ہندوستان کے اکابر علما وفضلا نے شرکت کی، مصر کے انور سادات، اردن کے شاہ حسین اور شریمتی اندرا گاندھی نے اس موقع پر خصوصی پیغامات بھیجے، مہمانوں کے قیام وطعام کے انتظامات، لنچ، ڈنر اور عصرانے سب اس درجہ عظیم الشان تھے کہ ریاستیں اور حکومتیں ہی یہ اہتمام کرسکتی ہیں، اس تقریب کے سلسلہ میں اسلامیات کے طریق تعلیم وریسرچ پر دو روزہ سیمینار بھی ہوا۔ اور اس مقصد کے لئے مولانا سیدنا برہان الدین صاحب نے انجمن اسلامیہ بمبئی کو اکیس لاکھ روپیہ کی گرانقدر رقم بھی عنایت کی، اس کے علاوہ بعض دیگر رقومات بھی سماجی فلاح وبہبود کے کاموں کے لئے مرحمت کی گئیں، تین دن کا یہ اجتماع ڈسپلن اور نظم ونسق کا شاہکار تھا، یہ اجتماع مسلک ومشرب کے اختلافات کے باوجود اتحاد بین المسلمین کی طرف ایک نہایت مستحسن اور لائق قدر اقدام تھا اس لئے قابل ستائش ہے اور اس کے لئے ڈاکٹر یوسف نجم الدین صاحب جو نہایت روشن خیال

عہد نبوی کے غزوات و سرایا

اور

ان کے مآخذ پر ایک نظر

(۱۰)

سعید احمد اکبر آبادی

(۳) اسیرانِ بدر

نمبر	نام	قبیلہ و کیفیت
۱	عباس بن عبدالمطلب	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا اور عمر میں دو برس بڑے تھے، اپنا فدیہ دے کر مکہ واپس چلے گئے، فتح مکہ سے کچھ پہلے مدینہ آئے، اسلام قبول کیا اور فتح مکہ اور حنین کے معرکوں میں شریک ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چچا کا بہت خیال رکھتے تھے، ایک موقع پر فرمایا: "جو شخص عباس کو اذیت دے گا وہ مجھکو اذیت دے گا۔" ۳۲ھ میں مدینہ میں وفات پائی، قبیلہ بنو ہاشم۔
۲	عقیل بن ابی طالب	بنو ہاشم، حضرت علی کے بھائی اور حضور کے برادر عم زاد تھے، فتح مکہ کے سال مسلمان ہوئے اور حنین اور موتہ

قلب و نظر کے اوصاف و کمالات میں ترقی کا باعث ہوگا۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔

گذشتہ چند برسوں سے مرکزی اور صوبائی حکومتیں اردو کے ساتھ فیاضی اور کرم گستری کا جو معاملہ کر رہی ہیں ہم اُس کو "ہرچہ از دوست می رسد نیکوست" کا ہی مصداق قرار دے سکتے ہیں، اردو ترقی بورڈ کے ماتحت کچھ پرانی اور کچھ نئی کتابیں نہایت اہتمام سے شائع کی گئی ہیں، علاوہ ازیں ترجمہ و تالیف کا ایک وسیع پروگرام ہے جو زیر ترتیب ہے، اترپردیش کی اردو اکاڈمی ہر سال ادیبوں اور شاعروں کو ان کی کتابوں پر لاکھوں روپیہ کے انعامات تقسیم کرتی ہے، اس کے دیکھا دیکھی اب دوسرے صوبوں میں بھی اردو اکاڈمیاں قائم ہو رہی ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ سب کچھ اردو کی اصل بیماری کا علاج اور اردو والوں کے اصل مطالبہ کا خاطر خواہ جواب ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہرگز نہیں، اور ان سب سرکاری نوازشات کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ چند کھلونے دیکر اردو والوں کا دل بہلایا جا رہا ہے، اول تو یہ ادارے دوست نوازی کا مرکز بن گئے ہیں۔ معیاری اور غیر معیاری کی کوئی تفریق نہیں، انعام دینے کا طریقہ نہایت توہین آمیز ہے، ایک ہی شخص کئی کئی ناموں سے الٹی سیدھی کتابیں لکھ ڈالتا ہے اور سفارشوں کے ذریعہ کئی کئی انعامات وصول کر لیتا ہے، معمولی کتابوں پر بڑی رقم کے اور ان کے بالمقابل معیاری اور بلند پایہ کتابوں پر بہت قلیل رقم کے انعامات تقسیم ہوتے ہیں اور پھر سب سے اہم اور بنیادی بات یہ ہے کہ اگر اردو زبان بحیثیت قومی زبان کے ختم ہو گئی اور اس زبان کے بولنے اور پڑھنے والے ہی نہ رہے تو ان کتابوں کو پڑھے گا کون؟ اس لیے اردو کا حل بجز اس کے کوئی اور نہیں ہے کہ اردو زبان کی سرکاری حیثیت کم از کم اترپردیش، بہار، پنجاب، ہریانہ، آندھرا، اور دہلی میں تسلیم کی جائے، اردو والوں کو اس ہمہ رنگ زمین دام سے ہوشیار رہنا اور اپنی ساری توجہات اور عملی جد وجہد کو اصل حل اور اسی کے مطالبہ پر مرکوز رکھنا چاہیے۔

نے ان کی شادی کے موقع پر ان کو دیا تھا تو اس ہار کو
دیکھ کر حضور پر رقت طاری ہوگئی اور صحابہ کے مشورہ
اور ان کی اجازت سے آپ نے وہ ہار ان کو واپس
کر دیا اور انھیں اس شرط پر رہا کر دیا کہ وہ مکہ پہونچکر
حضرت زینب کو مدینہ بھیجدیں گے، انھوں نے اس کی
پابندی کی اور قریش کی سخت مخالفت کے باوجود جس
طرح بن پڑا اپنے بھائی کنانہ کے ہمراہ حضرت زینب
کو حسب قرار داد مکہ سے آٹھ میل کی مسافت پر پہونچادیا
اور وہاں سے حضرت زینب حضرت زید بن حارثہ اور
ایک اور ہمراہی کے ساتھ مدینہ آگئیں، صلح حدیبیہ کے
بعد یعنی ۶ھ میں ابو العاص بھی مدینہ آئے اور مشرف
باسلام ہوئے، اس کے بعد ان کی درخواست پر حضور
نے حضرت زینب کا عقد جدید ابو العاص کے ساتھ کر دیا۔
ابو العاص کے اسلام اور اس سے پہلے کے ان کے
ان واقعاتِ زندگی کو جو ان کے اعلیٰ کردار کی دلیل ہیں
ابنِ ہشام، طبری، ابنِ سعد، ابنِ عبد البر، اور ابنِ حزم
نے کمال بسط و تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ابو العاص حضرت
زینب کے خالہ زاد بھائی بھی تھے۔

۱۳	ابو ریشۃ بن عمرو	بنی عبد شمس بن عبد مناف کا حلیف۔
۱۴	عمرو بن الازرق	"
۱۵	عقبۃ بن عبد الحارث بن الحضرمی	"

		کے معرکوں میں شریک رہے
۳	نوفل بن الحارث بن المطلب	بنو ہاشم، حضور کے چچیرے بھائی، بعد میں یہ بھی مسلمان ہو گئے، ان کے چچا عباس نے ان کا زر فدیہ ادا کیا۔
۴	عتبہ	بنو ہاشم کا حلیف۔
۵	السائب بن عبید بن عبد زید	بنو المطلب بن عبد مناف، غزوۂ بدر میں قریش کے علم بر یہی تھے، فدیہ دیکر رہا ہو گئے، بعد میں اسلام قبول کیا امام شافعی انھیں کی نسل سے ہیں۔
۶	نعمان بن عمرو بن علقمہ	بنی مطلب۔
۷	عقیل بن عمرو	بنی مطلب کا حلیف۔
۸	تمیم بن عمرو	بنی مطلب کا حلیف اور عقیل کا بھائی۔
۹	ابن تمیم	بنی مطلب کا حلیف۔
۱۰	عمرو بن ابی سفیان بن حرب	بنی عبد شمس بن عبد مناف۔
۱۱	الحارث بن ابی وجرہ	بنی عبد شمس، بعض مآخذ میں باپ کا نام ابی وجرہ بالحاء المہملہ ہے۔
۱۲	ابو العاص بن الربیع	بنی عبد شمس، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد اور آپ کی صاحبزادی حضرت زینب کے شوہر تھے، ان کا نام لقیط اور بعض روایتوں کے مطابق یاسر تھا۔ امانت و دیانت میں مشہور تھے، اس بنا پر قریش کے دولتمند اص کا مالِ تجارت لیکر شام آتے جاتے رہتے تھے اور الامین کہلاتے تھے، ان کا فدیہ حضرت زینب نے مکہ سے بھیجا جو اس ہار پر مشتمل تھا جو حضرت خدیجہ نے

۳۴	مطلب بن حنطب بن الحارث	قبیلہ بنو مخزوم بن یقظہ
۳۵	خالد بن الاعلم الخزاعی	قبیلہ بنی مخزوم بن یقظہ کا حلیف، کہتے ہیں غزوہ میں سب سے پہلے جس شخص نے فرار اختیار کیا وہ یہی تھا۔ حالانکہ اس کا شعر ہے: ولسنا علی الاعقاب تدمی کلومنا ولکن علی اقدامنا یقطر الدما "ہم وہ نہیں ہیں جن کی ایڑیاں زخم خوردہ ہو کر خون آلود ہوں، البتہ، ہاں ہمارے پنجوں پر خون ٹپکتا رہتا ہے۔"
۳۶	ولید بن ولید بن المغیرہ	قبیلہ بنی مخزوم، حضرت خالد بن الولید کا بھائی۔
۳۷	صیفی بن ابی رفاعہ بن عابد	"
۳۸	قیس بن السائب	"
۳۹	ابو وداعۃ بن ضبیرہ	قبیلہ بنو سہم بن عمرو بن ہصیص
۴۰	وفرۃ بن قیس بن عدی	"
۴۱	حنظلۃ بن قبیصۃ	"
۴۲	حجاج بن قیس بن عدی	"
۴۳	اسلم	" نبیہ الحجاج کا غلام
۴۴	عبداللہ بن ابی خلف	قبیلہ بنو جمح بن عمرو بن ہصیص
۴۵	ابو عزۃ عمرو بن عبد بن عثمان	"
۴	الفاکہتہ	" امیہ بن خلف کا غلام
۴	وہب بن عمیر	"
۴	ربیعہ بن دراج	"

۱۶	خالد بن اسید بن ابی العیص	بنی عبد شمس، حضرت عتاب بن اسید جن کو فتح مکہ کے بعد حضور نے وہاں کا امیر بنایا تھا، ان کے بھائی، فتح مکہ کے دن اسلام قبول کیا۔
۱۷	ابو العریض، یسار	بنی عبد شمس، العاص بن امیہ کا غلام۔
۱۸	عدی بن الخیار بن عدی بن نوفل	قبیلہ بنو نوفل بن عبد مناف
۱۹	عثمان بن شمس	بنو نوفل کا حلیف، بنو مازن بن منصور سے۔
۲۰	ابو ثور	”
۲۱	نبہان	بنو نوفل کا غلام
۲۲	ابو عزیز بن عمیر بن ہاشم	قبیلہ بنو عبد الدار بن قصی، حضرت مصعب بن عمیر کا بھائی۔
۲۳	اسود بن عامر	بنو عبد الدار کا حلیف
۲۴	عقیل، ایک یمنی باشندہ	”
۲۵	سائب بن ابی حبیش	قبیلہ بنو اسد بن عبد العزیٰ
۲۶	حویرث بن عباد	”
۲۷	سالم بن شماخ	حلیف بنو اسد بن عبد العزیٰ
۲۸	عبد اللہ بن حمید بن زہیر	قبیلہ بنو اسد بن عبد العزیٰ
۲۹	خالد بن ہشام بن المغیرہ	قبیلہ بنو مخزوم بن یقظہ
۳۰	امیہ بن ابی حذیفہ بن المغیرہ	”
۳۱	عثمان بن عبد اللہ بن المغیرہ	”
۳۲	ابو المنذر بن ابی رفاعہ	”
۳۳	ابو عطاء عبد اللہ بن السائب	”

نے ان کے مرثیہ میں کہا :

سألوا عن الجود والمعروف ما فعلا

فقلت انهما ماتا مع الحکم

"لوگوں نے سخاوت اور کرم کے متعلق پوچھا کہ ان کا کیا حال ہے ؟ تو میں نے کہا کہ حکم کے ساتھ یہ دونوں بھی مرگئے ہیں۔

۶۷	ابوالعاص بن نوفل بن عبدشمس	قبیلہ عبدشمس بن عبدمناف

نوٹ : اسیران بدر کی تعداد ستر بتائی جاتی ہے، لیکن تین کا مجھے پتہ نہیں لگا۔

اب ان تینوں فہرستوں کا جائزہ لیجئے تو معلوم ہوگا کہ دونوں فریق کے نقصانات میں کس درجہ عظیم اور زمین آسمان کا فرق ہے، مسلمانوں میں لے دیکے صرف چودہ جانوں کا نقصان ہوا ہے، گرفتار کوئی ایک بھی نہیں ہوا۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ جنگ کی شدت اور اُس کی ہیبت سے گھبرا کر ایک شخص نے بھی راہ فرار اختیار نہیں کی اور جو جانی نقصان ہوا بھی ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ ان میں ایک وہ مرد جانباز ہے جو جذبۂ شہادت کے جوش میں جنگی اسپلن کی پروا کئے بغیر تن تنہا فریق مخالف کی صفوں میں درانہ گھسا ہوا چلا گیا اور شہید ہوگیا، اس کے علاوہ تین وہ لڑکے ہیں جو نوخیز اور کمسن تھے۔ انھیں جنگ کا کوئی تجربہ نہیں تھا اور بس اپنی ضد اور شوق سے یہاں چلے آئے تھے، اللہ اکبر! یہ کارنامہ ان لوگوں کا ہے جن کو اس واقعہ کے کئی برس بعد مکہ میں دیکھ کر اہل مکہ نے بہ طور طعن و تمسخر کہا تھا: "اوھنتھم حمی یثرب" "یثرب کے بخار نے ان کو کمزور کر دیا ہے" جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حضرات کو طواف میں رمل یعنی سینہ تان کر چلنے کا حکم دیا تھا۔

اس کے برعکس دوسری جانب دیکھئے تو وہ تباہی آئی ہے کہ خدا کی پناہ! ایک قبیلہ بھی ایسا نہیں ہے جس کے لوگ قتل یا گرفتار نہ ہوئے ہوں۔ فہرستوں پر نگاہ ڈالئے

۴۹	عمرو بن ابی بن خلف	قبیلہ بنو جمح بن عمرو بن ھصیص
۵۰	ابو رہم بن عبد اللہ	حلیف قبیلہ
۵۱	ایک نامعلوم الاسم شخص	ابن اسحق اس شخص کا نام بھول گئے۔ مگر تھا یہ بھی قبیلہ بنو جمح بن عمرو بن ھصیص سے
۵۲	نسطاس	امیہ بن خلف کا غلام
۵۳	امیہ بن خلف کا ایک اور غلام	اس کا نام بھی معلوم نہیں ہوسکا۔
۵۴	ابو رافع	امیہ بن خلف کا لڑکا
۵۵	سہیل بن عمرو	قبیلہ بنو عامر بن لوئی
۵۶	عبد بن زمعہ بن قیس	"
۵۷	عبد الرحمٰن بن منشوٗ بن وقدان	"
۵۸	حبیب بن جابر	"
۵۹	سائب بن مالک	"
۶۰	طفیل بن ابی قنیع	قبیلہ بنو الحارث بن فہر
۶۱	عتبہ بن عمرو بن جحدم	"
۶۲	شافع	حلیف بنو الحارث بن فہر، یمن کا باشندہ
۶۳	شفیع	" "
۶۴	مالک بن عبید اللہ	حضرت طلحہ کا بھائی، بحالت اسارت ہی انتقال ہوا
۶۵	حذیفہ بن ابی حذیفہ بن المغیرہ	قبیلہ بنی مخزوم بن یقظہ
۶۶	حکم بن المطلب بن عبد اللہ بن المطلب	" مسلمان ہوگئے تھے، بے حد ... اور زاہد شخص تھے، جب انتقال ہوا تو ایک ...

مدینہ میں مسرت اور اطمینان کی لہر ایک طرف مکہ ماتم کدہ بنا ہوا تھا اور دوسری جانب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اعیان قریش کی لاشوں کو دفن کرانے کے بعد دو تیز رفتار قاصدوں[1] کے ہاتھ مژدۂ فتح مدینہ پہونچایا تو گھر گھر اطمینان ومسرت کی لہر دوڑ گئی، اگرچہ یہ عجیب اتفاق تھا کہ قاصد جب مدینہ میں داخل ہوئے ہیں تو انھوں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت رقیہ جو حضرت عثمان کی اہلیہ تھیں اور جن کی علالت کے باعث حضرت عثمان غزوۂ بدر میں بحکم نبوی شریک نہ ہو سکے تھے اُن کا انتقال ہو گیا ہے اور ان کا جنازہ تدفین کے لئے لایا جا رہا ہے، ان دو پیغام رسانوں میں ایک حضرت زید بن حارثہ بھی تھے، مدینہ میں یہود اور منافقین نے جنگ کے انجام کے بارہ میں نہایت بری اور مایوس کن افواہیں اس شدت سے پھیلا رکھی تھیں کہ جب یہ دونوں پیغام رساں پہونچے اور انھوں نے فتح وکامرانی کا اعلان عام کیا تو حضرت زید کے صاحبزادہ حضرت اسامہ نے رازدارانہ طور پر باپ سے پوچھا: ابا جان! جو کچھ فرما رہے ہیں کیا سچ مچ یہ واقعہ بھی ہے، ؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کے بعد تین دن مزید بدر میں قیام فرمایا۔ اس کے بعد جب آپ مع اپنے لشکر اور قیدیوں کے روانہ ہوئے ہیں تو حال یہ تھا کہ مختلف منزلوں پر مسلمانوں کے وفود ملتے رہے جنھوں نے آپ کا استقبال کیا اور فتح وکامرانی پر مبارک باد پیش کی۔

اسیران بدر کے ساتھ معاملہ قیدیوں میں سے دو شخص، نضر بن الحارث اور عقبہ بن ابی معیط جو اسلام کے نہایت سخت دشمن تھے اور جنھوں نے مکہ میں حضور کو اور مسلمانوں کو شدید ایذائیں پہونچائی تھیں قتل کر دیے گئے، باقی قیدیوں کے بارہ

---

[1] حضرت زید بن حارثہ اور حضرت عبداللہ بن رواحہ،

قریش کے بیس سے زیادہ نامور بہادر اور سردار سپرد تیغ ہوگئے۔ کتنے ہی ہیں جو اُن میں گرفتار ہوئے، بعض گھرانے تو وہ ہیں جن کا بالکل ہی صفایا ہوگیا، ہبار بن الاسود الاسدی کے تین بھائی تھے وہ سب جنگ میں کام آگئے، ہند بنت عتبہ پر یہ قیامت ٹوٹی کہ اس کا باپ عتبہ، اس کا چچا شیبہ، اس کا بھائی ولید، اس کا چچیرا بھائی علبیدہ بن سعید بن العاص بن امیہ اور اس کے شوہر کا لڑکا حنظلہ بن ابی سفیان بن حرب، یہ سب لوگ مارے گئے[1] پروفیسر واٹ منٹگمری لکھتے ہیں کہ "جس قابلیت اور تجربہ کے لوگ جنگ میں آگئے ان جیسے مشکل سے ایک درجن لوگ مکہ میں زندہ بچے ہوں گے" (ص ۱۴) اس بنا پر ہزیمت اور شکست سے چور یہ لشکر مکہ واپس پہونچا تو گھر گھر میں ماتم بپا ہوگیا، از راہ غیرت قریش نے تاکید کردی تھی کہ نالہ و شیون اور آہ و بکا کی آواز کسی گھر سے باہر نہ نکلے۔ مگر دل پر کیا جبر ہوسکتا ہے، عورتوں نے مرثیے پڑھے اور رجز خوانی کر کے مردوں کو لعن طعن کیا۔ چنانچہ حضرت زینب (بنت الرسول) کی مکہ سے روانگی کو قریش نے اپنے لئے ننگ و عار کی بات قرار دیا تو ہند بنت عتبہ نے جس کا ذکر آچکا ہے بہ طور طنز کہا:

افی السلم اعیارٌ، جفاءً و غِلْظَةً

وفی الحرب اشباہ النساء العوارک[2]

ترجمہ: "جب جنگ نہ ہو تو تم کو از راہ سنگدلی و درشتیٔ طبع بڑی غیرت آتی ہے، لیکن جنگ کا موقع ہو تو تم لڑاکا اور جھگڑالو عورتوں جیسے بن جاتے ہو"

۱۔ اور یہ لوگ بھی وہ تھے جو ابوسفیان، صفوان بن امیہ بن خلف الجمحی اور ابولہب کی طرح جنگ میں شریک ہی نہیں ہوئے تھے۔

۲۔ سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۳۱۰

عَرَضَ الدُّنْيَا، وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ، وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○

سروکار رکھے، تم دنیا کے مال و متاع کا ارادہ کرتے ہو حالانکہ اللہ آخرت کو مطلوب رکھتا ہے اور اللہ اپنے ارادوں میں غالب اور حکیم ہے۔

یہ واضح رہنا چاہیئے کہ ہم نے اپنی کتاب الرق فی الاسلام میں اس آیت پر اس درجہ بسط و تفصیل سے کلام کیا ہے کہ حضرت الاستاذ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے پڑھا تو نہایت مسرور ہوئے، دعائیں دیں اور فرمایا: "تم نے تحقیق کی انتہا کر دی ہے، کوئی شخص اس سے زیادہ کیا لکھ سکتا ہے۔" بہرحال مقام کی مناسبت سے اس سلسلہ میں مختصراً عرض یہ کرنا ہے کہ اس آیت کے سبب نزول سے متعلق حضرت عمر کی ایک روایت ہے جسے امام مسلم نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے، اس کے کچھ ٹکڑے ابوداؤد اور ترمذی میں بھی ہیں، واحدی نے "اسباب النزول" میں پوری طول طویل روایت نقل کر دی ہے، اس روایت کا حاصل یہ ہے کہ حضرت عمر فرماتے ہیں: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس روز حضرت ابوبکر اور مجھ سے مشاورت کے بعد اسیرانِ بدر سے متعلق فیصلہ کیا ہے، اس کے دوسرے دن میں خدمت اقدس میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضور اور حضرت ابوبکر دونوں گریہ کر رہے ہیں، میں نے دریافت کیا: یارسول اللہ! آپ مجھے بتایئے کہ رونے کی وجہ کیا ہے؟ ارشاد ہوا: تمہارے ساتھیوں نے قیدیوں کے بارہ میں فدیہ لینے کا جو مشورہ دیا تھا، میں اُس پر رو رہا ہوں، مجھ پر اس درخت سے بھی قریب ایک عذاب دکھایا گیا تھا، اور اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اس روایت کی روشنی میں اکثر علمائے تفسیر و روایت اور ان کے تتبع میں ارباب تاریخ و سیر نے مذکورۂ بالا آیت کا مطلب یہ قرار دیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قیدیوں کے بارہ میں حضرت عمر کا مشورہ رد کر کے حضرت ابوبکر کی رائے کے مطابق عمل کرنے کا جو فیصلہ کیا تھا، اس آیت میں اُس پر عتاب ظاہر کیا گیا ہے، یعنی خدا کا منشا یہ ہی تھا کہ حضرت عمر کی

میں حکم ہوا کہ ان کی بندشیں ڈھیلی کر دی جائیں اور انھیں کھانے پینے کی یا کوئی اور اذیت نہ دی جائے۔ جب حالات ٹھیک ہو گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام سے مشورہ کیا کہ قیدیوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟ حضرت عمرؓ نے رائے دی کہ قتل کر دیے جائیں اور وہ بھی اس طرح کہ ہر شخص اپنے عزیز قریب کے ہاتوں قتل ہو" اس کے برخلاف حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا: یارسول اللہ! یہ لوگ آپ کے ہی کنبہ قبیلہ کے ہیں، ان کو ہلاک نہ کیجیے، ممکن ہے کل یہ مسلمان ہوجائیں اور اللہ تعالیٰ ان کے سب گناہ معاف کر دے۔ آپ ان سے جو فدیہ لیں گے وہ ہماری تقویت کا باعث ہوگا۔[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کی رائے کو صائب قرار دیا لیکن ترجیح حضرت ابو بکرؓ کی رائے کو دی، چنانچہ بعض قیدی جو بے ضرر تھے یا غربت کے باعث زرِ فدیہ ادا نہیں کر سکتے تھے انھیں کسی معاوضہ کے بغیر رہا کر دیا گیا، باقی لوگوں کے لئے چار ہزار درہم فی کس کی رقم زرِ فدیہ مقرر کی گئی، حضور کو تعلیم اور ہتیار مہیا کرنے کا کس درجہ اہتمام تھا؟ اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ نوفل بن الحارث بن عبدالمطلب جو اسلحہ فروشی کا کاروبار کرتا تھا اُس سے زرِ فدیہ میں ایک ہزار نیزے طلب کئے گئے اور قیدیوں میں جو لوگ لکھے پڑھے تھے ان کا فدیہ یہ قرار دیا گیا کہ وہ دس دس بچوں کو نوشت وخواند کی تعلیم دیں۔[2]

ایک آیت کا مطلب قرآن مجید کی سورۃ الانفال میں ایک آیت ہے:

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ، تُرِيْدُوْنَ — کسی نبی کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ اس سے پہلے کہ زمین میں غلبہ حاصل کرے، قیدیوں سے

---

[1] مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ص۱ باب اساری بدر

[2] سیرت ابن ہشام، طبقات ابن سعد و مسند امام احمد بن حنبل

ارادہ کرتے ہو اور اللہ آخرت کا ارادہ کرتا ہے، ظاہر ہے عرض الدنیا کا مصداق مال غنیت ہو سکتا ہے نہ کہ قیدیوں کا زرفدیہ۔ کیونکہ زرفدیہ تقسیم نہیں ہوتا، بلکہ بیت المال (Treasury) میں جمع ہوتا ہے، پھر ارشاد ہوا: لولا کِتٰبٌ من اللہ سبق لمسّکم فیما اَخذتم عذابٌ عظیمٌ ۝ ترجمہ: تم نے جلد بازی میں جو کام کیا ہے اگر وہ پہلے سے اللہ کے ہاں منظور شدہ نہ ہوتا تو تم کو عذاب عظیم سے واسطہ پڑتا۔ یہ کام جسے جلد بازی میں یہ لوگ کر بیٹھے کیا ہے؟ اس کے فوراً بعد جو آیت ہے اُس سے اس کا جواب نکلتا ہے۔ ارشاد ہے:

فکُلُوا مِمّا غَنِمتُم حلٰلًا طیّبًا واتّقوا اللہ اِنّ اللہ غفورٌ رّحیمٌ ۝

تو ہاں اب تم کو جو مالِ غنیمت ملا ہے اور وہ حلال وطیب ہے اسے کھاؤ، اور اللہ سے ڈرو (پھر ایسی غلطی نہ کرنا) بیشک اللہ بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے (جو غلطی تم سے ہوگئی ہے وہ اسے معاف کر دے گا)

اب دونوں آیتوں کو ملا کر پڑھیے اور دیکھیے کہ ان سے مالِ غنیمت کا حکم کس طرح صاف صاف نکلتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہنی چاہیئے کہ قرآن جس حکم کو "لولا کِتٰبٌ مِن اللہ سَبَق" کہتا ہے وہ مال غنیمت کا حکم ہے یا قیدیوں کا؟ یقیناً وہ مال غنیمت کا حکم ہے کیونکہ اس میں اُن آیات کی طرف اشارہ ہے جن میں مال غنیمت کو حلال قرار دیا گیا ہے، مثلاً

واعلَموا اَنّما غَنِمتُم مِن شیءٍ فاَنّ للہِ خُمُسَہٗ الآیۃ

اور جان لو کہ جو کچھ تم کو مال غنیمت ملے گا اس کا ⅕ واں حصہ اللہ کے لئے ہوگا الآیۃ

قیدیوں کے بارہ میں اس طرح کا حکم کہیں کسی آیت میں نہیں ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں ترمذی میں جو روایت ہے اُس سے بعینہٖ وہی ثابت ہوتا ہے جو ہم نے لکھا ہے۔

اب سوال ہو سکتا ہے کہ اچھا! جب بات یہی ہے تو پھر آیت زیر بحث میں قیدیوں

رائے کے مطابق اسیرانِ بدر کو قتل کر دیا جاتا اور فدیہ دے کر انھیں رہا نہ کیا جاتا۔

لیکن اس آیت سے جو مطلب نکلتا ہے وہ یہی ہے کہ جب تک اثخان فی الارض حاصل نہ ہو جائے، قیدیوں سے سروکار نہ رکھنا چاہئے اور جب اثخان فی الارض حاصل ہو جائے تو اب پیغمبر کو اختیار ہے کہ قیدیوں کے ساتھ من کا معاملہ کرے یا فدا کا۔ اب سوال یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بدر میں جو عظیم الشان فتح حاصل ہوئی اس کو اثخان فی الارض (غیر مشکوک غلبہ) کہا جائے گا یا نہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے اور یقیناً اثبات میں ہے تو پھر اگر حضور قیدیوں کے ساتھ من اور فدا کا معاملہ اب اس وقت کر رہے ہیں تو اس میں عتاب کی کیا بات ہے؟ اس بنا پر حقیقت یہ ہے کہ آیت میں کہیں اس کا اشارہ بھی نہیں ہے کہ قیدیوں کے قتل نہ کرنے اور ان کے ساتھ من وفدا کا معاملہ کرنے پر اظہار ناپسندیدگی کیا گیا ہو۔

پھر یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ حضور نے قیدیوں کے ساتھ جو حسنِ سلوک کیا اُس سے اسلام کو کس درجہ اہم اور عظیم فائدہ پہونچا۔ حضرت عباس، حضرت عقیل، حضرت ابوالعاص بن ربیع کی طرح کتنے لوگ مسلمان ہو گئے اور انھوں نے اسلام کی قابل قدر خدمات انجام دیں، چار ہزار درہم فی کس زرِ فدیہ وصول کر کے بیت المال میں کتنا اضافہ ہوا۔ مسلمانوں کے کتنے بچے لکھنا پڑھنا سیکھ گئے، پس جب حضور کا عمل اتنے فوائد کا حامل ہو تو اس کو خدا کی نظر میں کیونکر ناپسندیدہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ آیت کا لہجہ عتاب کا ہے لیکن اول تو عتاب کا رُخ حضور کی طرف نہیں بلکہ اُن صحابہ کی طرف ہے جنھوں نے جنگ کے ختم ہونے کے فوراً بعد غنیمت میں اپنے حصہ کا سوال اٹھا دیا تھا اور پھر عتاب اس پر ہرگز نہیں ہے کہ قیدی قتل کیوں نہیں کئے گئے، بلکہ اس پر ہے کہ غنیمت کی اجازت ملنے سے پہلے ہی کیوں پیغمبر سے مال غنیمت کی تقسیم کا مطالبہ کیا گیا، چنانچہ آیت کے متن اور اس کے سیاق سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ آیت میں فرمایا گیا: تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ، تم دنیوی مال ومتاع کا

بحرالعلوم عبدالعلی محمد فرنگی محلی

(۲)

ڈاکٹر محمد اقبال انصاری صدر شعبہ اسلامیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

بحرالعلوم کا لقب اس بارے میں تذکرہ نگاروں کے درمیان اختلاف ہے کہ بحرالعلوم کے لقب سے آپ کو کس نے نوازا، رحمان علی[1]، سید سلیمان ندوی[2] اور یوسف کوکن[3] وغیرہ نے لکھا ہے کہ یہ خطاب نواب محمد علی والاجاہ کا دیا ہوا ہے۔ شیخ الطاف الرحمٰن نے لکھا ہے کہ "مولانا شاہ ولی اللہ قدس سرہ محدث دہلوی نے آپ کو بحرالعلوم کے لقب سے ملقب کیا تھا۔"[4] البتہ مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی (م ۱۹۴۱ء) کا خیال ہے کہ نواب محمد علی والاجاہ نے ملک العلماء کا خطاب دیا تھا اور شاہ عبدالعزیز نے بحرالعلوم کے لقب سے ملقب فرمایا، انھوں نے لکھا ہے کہ ملا حسن[5]

۱۔ رحمان علی: مصدر سابق، ص ۳۰۵

۲۔ سید سلیمان ندوی: مولانا بحرالعلوم اور ان کی ایک صدی کی سالگرہ، الندوہ (ماہنامہ، لکھنؤ) جلد ۴ شمارہ ۵ (جون ۱۹۰۷ء)، ص ۲۲۔

۳۔ کوکن: مصدر سابق، ص ۱۷

۴۔ الطاف الرحمٰن: احوال علمائے فرنگی محل (لکھنؤ، ب ت) ص ۶۵

۵۔ مولوی محمد حسن بن قاضی غلام مصطفیٰ المعروف بملا حسن (م ۱۲۰۹ھ) صاحب شرح سلم العلوم لمحب اللہ البہاری (م ۱۱۱۹ھ)

کا ذکر کیوں ہے ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہر کلام بلیغ کے جزو ہوتے ہیں (۱) ایک ماسیق لہٗ الکلام یعنی کلام کا اصل مقصد اور (۲) دوسرا غیر ماسیق لہ الکلام۔ جس کا ذکر ضمنی طور پر کسی مصلحت سے کردیا جاتا ہے، چنانچہ اس آیت میں بھی اصل ماسیق لہ الکلام مال غنیمت ہے اور قیدیوں کا ذکر، ان کا حکم بیان کرنے کی غرض سے ضمناً آگیا ہے، اور اب پوری آیت کا مفہوم ہمارے لفظوں میں یہ ہوگا کہ " اے مسلمانو! ذرا پیغمبر کے قدم جمنے اور حالات کو سدھرنے تو دو! تم ابھی سے مال غنیمت اور قیدیوں کا معاملہ کہاں لے کر بیٹھ گئے، تمہاری جلد بازی اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ تم دنیوی مال ومتاع کا ہی دھیان رکھتے ہو حالانکہ پیغمبر کو تو اللہ کی زمین پر فتح پانی ہے اور خدا پیغمبر کی اعانت اور جہاد میں اس کی رفاقت کا بدلہ تم کو آخرت میں دے گا، تمہاری اس جلدبازی کی وجہ سے تم پر عذاب عظیم نازل ہوتا، مگر خیر اس لئے ہو گئی کہ اگرچہ تم سے جلد بازی کا قصور ضرور ہوا لیکن جس معاملہ میں تم نے جلد بازی کی وہ پہلے سے ہی اللہ کے ہاں منظور شدہ اور تمہارے لئے حلال اور طیب تھا۔

ہے جیسا کہ واقعہ مذکورہ بالا سے معلوم ہوتا ہے پھر شاہ ولی اللہ کی وفات ۱۱۷۶ھ میں ہوئی اور ارکان اربعہ غالباً اس کے بعد کی تصنیف ہے ۔ البتہ اگر بحرالعلوم کو عوامی لقب اور ملک العلماء کو سرکاری خطاب قرار دیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا اس لئے کہ بحرالعلوم کا لقب تو آپ کی ذات ہی تک محدود رہا لیکن آپ کے انتقال کے بعد ملک العلماء کا خطاب آپ کے داماد ملا علاء الدین کو بھی ملا جو آپ کے جانشین ہوئے ۔

وفات اس حقیقی بحرالعلوم اور آسمان فضل و کمال نے ۱۲ رجب ۱۲۲۵ھ کو مدراس میں وفات پائی اور دوسرے دن مسجد والا جاہی کے صحن سے ملحق داہنی جانب کے احاطہ میں ان کو سپرد خاک کیا گیا ۔ مزار اب تک زیارت گاہ خلائق ہے اور وہاں کے لوگ اب تک مولانا کی عظمت و علمیت کو مانتے ہیں ۔ تذکرہ علمائے ہند مصنفہ رحمان علی[1] میں سن وفات ۱۲۳۵ھ (دوازدہ صد و سی پنج ہجری) تحریر ہے اور غالباً اسی پر زبید احمد[2] نے بھی اعتماد کیا ہے ۔ البتہ بروکلمان[3] نے دونوں سنین وفات کا ذکر کرکے اول الذکر ہی کو ترجیح دی ہے اور یہی صحیح ہے ان کی تائید ان عربی تذکروں سے ہوتی ہے جن میں سن وفات واضح طور لفظوں میں "توفی سنة خمس وعشرین بعد الالف والمائتین[4]" یا "سنة خمس وعشرین ومائتین والف[5]" تحریر ہے جس کی مزید تائید متعدد قطعات وفات سے بھی ہوتی ہے جن میں مولوی ارتضا علی خاں

۱۔ رحمان علی : تذکرہ علمائے ہند (لکھنؤ، ۱۹۱۴ء) ، ص ۱۲۳ نیز قادری مصدر سابق ، ص ۳۰۵

۲۔ Zubaid Ahmad : The Contribution of India to Arabic literature (Lahore 1968), PP. 306, 336, 339, 367, 388, 416 And 434

۳۔ Brockelmann : GAL S II (Leiden 1938) P. 624

۴۔ محمد قیام الدین عبدالباری : آثار الاول من علماء فرنگی محل (لکھنؤ، ب ت) ، ص ۲۵

۵۔ حسنی : مصدر سابق ، ص ۲۸۸

جب لکھنؤ سے ترک وطن فرماکر رامپور دہلی گئے اور کچھ مدت دہلی میں قیام فرمایا تو حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے شاگردوں کو خبر ہوئی وہ بھی ملا حسن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کسی مبحث علمی پر بحث کرنے لگے۔ ملا حسن نے جوابات معقولہ سے ان کی تشفی کردی وہ حضرت شاہ صاحب کے پاس واپس گئے اور ملا حسن کی تعریف کرنے لگے۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ ان معقولیوں کو حدیث و قرآن سے بالکل بے خبری ہوتی ہے۔ یہ بیچارے عمر بھر قال الشیخ وقال الرازی میں پڑے رہتے ہیں۔ ملا حسن اس عرصہ میں رامپور واپس ہوچکے تھے۔ کسی نے بحرالعلوم تک یہ واقعہ پہونچادیا، بحرالعلوم نے جواب میں 'ارکان اربعہ' لکھ کر شاہ صاحب کی خدمت میں بھیجی حضرت شاہ صاحب نے اس کے جواب میں جو خط بھیجا اس میں نہایت توصیف ومدح مولانا کی لکھی اور خط کے عنوان میں مولانا کو بحرالعلوم کے لقب سے ملقب فرمایا۔ خدا کی قدرت کہ حضرت شاہ صاحب کے قلم سے نکلا ہوا خطاب آج عالم میں شہرت پاگیا اور اب اہل علم کے حلقوں میں نام اور شاہی خطاب سے زائد حضرت شاہ صاحب کا عطیہ خطاب ہی مشہور ہے[1]۔" علامہ سید سلیمان ندوی (م ۱۹۵۲ء) نے بحرالعلوم اور ملک العلماء دونوں خطابوں کو "والا جاہی" بتلاکر اسے "عجیب حسن اتفاق کا کرشمہ" بتلایا ہے کہ "مدراس جہاں مولانا نے مدتوں قیام کیا زندگی ختم کی کوئی بحرالعلوم کو نہیں جانتا اور ادھر جہاں مولانا پیدا ہوئے، پرورش پائی، بڑھے کوئی ملک العلماء کو نہیں پہچانتا[2]"، لیکن شاید سید صاحب کو ارکان اربعہ کے سبب تالیف کی روایت نہیں پہونچی تھی ورنہ وہ 'حسن اتفاق' کی بجائے اسے قرین قیاس سمجھتے کہ جو جہاں کا خطاب تھا وہیں زیادہ مشہور ہوا۔

اس لئے زیادہ قرین قیاس یہی ہے کہ بحرالعلوم کا خطاب شاہ عبدالعزیزؒ کا عطا کردہ

۱۔ عنایت اللہ: مصدر سابق، ص ۱۴۰، ۱۴۱

۲۔ ندوی: مصدر سابق، ص ۲۲

ملا ولی بن قاضی غلام مصطفےٰ سے پڑھیں۔ ذہن رسا پایا تھا اسی لئے بہت جلد منقولات و معقولات پر عبور حاصل کر لیا لیکن تنگ حالی نے درس و تدریس کا موقعہ نہیں دیا اور جب کسب معاش کا کوئی ذریعہ نہ نکلا تو ناچار پدر بزرگوار کے پاس مدراس پہنچے مگر وہاں بھی کوئی صورت نہ نکلی تو پھر لکھنؤ چلے آئے اور ایک مدت تک یہیں قیام کیا جب زیادہ پریشان ہوئے تو نواب امیر خاں کے معسکر میں شرکت کی غرض سے روانہ ہوئے۔ ان دنوں ان حدود میں جنگ چھڑی ہوئی تھی اور راستہ کے تمام کنوؤں میں لوگوں نے زہر ڈال دیا تھا یہی زہریلا پانی مولانا کے لئے داعی اجل ثابت ہوا اور ۲۸ شعبان ۱۲۴۲ھ میں انتقال کیا[۲]۔

سب سے چھوٹے صاحبزادے ملا عبدالرب نے بچپن ہی سے بحرالعلوم کے سایۂ عاطفت میں تعلیم پائی تھی اور انھوں نے بھی اپنے اس لڑکے کی تعلیم و تربیت میں بڑی ہی محنت و جانفشانی کی تھی اور بڑے ہی لاڈ و پیار سے پالا پوسا تھا، شاہجہانپور، رامپور، بوہار اور مدراس ہر جگہ اپنے ساتھ رکھا مگر وہ صرف کوشش ہی کر سکتے تھے فطرت بدلنا ان کے اختیار میں نہ تھا۔ تحصیل علوم کے باوجود تدریس کی طرف طبیعت راغب نہ ہوئی اور سیر و سیاحت ہی کا شوق رہا کچھ دنوں مدراس میں قیام کے بعد شادی کی غرض سے وطن واپس ہوئے اور شیخ عزیز اللہ انصاری سہالوی کی دختر سے عقد کیا مگر سیر و سیاحت کا شوق بدستور قائم رہا۔ کئی مرتبہ مدراس گئے، ممالک دکن کی سیاحت کی اور کچھ دنوں کلکتہ میں بھی قیام رہا۔ بحرالعلوم کے انتقال کے بعد نواب مدراس نے ان کو سلطان العلماء کا خطاب دے کر مسند درس پر بٹھانا چاہا مگر ان کی طبیعت اس میں نہ لگی اور وطن چلے آئے جہاں بالآخر ۲۶ رمضان ۱۲۵۳ھ کو وفات پائی[۳]۔

۱۔ حالات کے لئے ملاحظہ ہو عنایت اللہ: مصدر سابق، ص ۱۴۳ و ۱۹۶

۲۔ عنایت اللہ: مصدر سابق، ص ۱۴۳-۱۴۴، نیز ندوی: مصدر سابق، ص ۲۵ و کوکن: مصدر سابق، ص ۴۲-۴۴

۳۔ عنایت اللہ: مصدر سابق، ص ۱۴۶، نیز ندوی: مصدر سابق ص ۲۵-۲۶ و کوکن: مصدر سابق، ص ۴۴-۵۵

صفوی خوشنود (م ۱۲۷۰ھ) کا حسب ذیل قطعہ[1] خاص طور پر قابل ذکر ہے :

چو رفت از جہاں فاضلِ نامور کہ بودہ است کالشمس بین النجوم
خرد یافت تاریخ سالِ وفات بزیرِ زمیں رفت گنجِ علوم

نیز "قدار تحمل مولانا ملک العلماء" سے بھی یہی سالِ وفات نکلتا ہے۔

اولاد مولانا کے تین بیٹے اور تین[3] ہی بیٹیاں تھیں :

بیٹوں میں سب سے بڑے مولوی عبد الاعلیٰ تھے۔ کتب درسیہ اپنے والد ماجد سے پڑھ کر ایک عرصہ تک سلسلہ درس و تدریس جاری رکھا مگر چونکہ کوئی صورت معاش نہ تھی اس لئے وطن سے چل کھڑے ہوئے اور کلکتہ پہونچے مگر وہاں بھی جب حصولِ مقصد کی کوئی سبیل نہ نکل سکی تو پھر چار و ناچار وطن واپس آئے۔ ابھی کچھ ہی دنوں قیام کیا تھا کہ خانہ جنگیوں سے گھبرا کر پھر کلکتہ چلے گئے مگر حصولِ معاش کی پھر بھی کوئی شکل پیدا نہ ہوئی تو والد ماجد کے پاس مدراس چلے گئے وہاں کچھ ہی دنوں سلسلہ درس و تدریس جاری رکھا تھا کہ بیمار پڑ گئے جب علالت نے زیادہ طول کھینچا تو والدِ ماجد سے باصرار اجازت لے کر وطن واپس ہو رہے تھے کہ مدراس سے چند منزل کے فاصلہ پر ۲۸ شعبان ۱۲۰۸ھ میں انتقال فرمایا۔[4]

منجھلے صاحبزادے مولوی عبد النافع تھے آپ نے بھی ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی اور کچھ کتب درسیہ خاندان کے دوسرے علماء بالخصوص مفتی محمد یعقوب بن ملا عبد العزیز[5] اور

۱۔ کوکن : مصدر سابق ، ص ۲۶

۲۔ ایضاً

۳۔ کوکن نے صرف ایک بیٹی کا ذکر کیا ہے، حوالہ بالا ، ص ۴۴

۴۔ عنایت اللہ : مصدر سابق ص ۱۴۲ ، نیز ندوی : مصدر سابق ص ۲۴-۲۵ و کوکن : مصدر سابق ص ۴۵

۵۔ حالات کے لئے ملاحظہ ہو عنایت اللہ : مصدر سابق ، ص ۱۴۳ و ۲۰۵

بہادر خرد بحرالعلوم کے شاگرد تھے[1]۔

تلامذہ

علم و فضل کے اس بحرِ بیکراں نے نہ معلوم کتنے ہی تشنگانِ علم کو سیراب کیا ہوگا لیکن بحرالعلوم کے تذکرہ نگاروں نے اُن کے تلامذہ کا خاص طور پر ذکر نہیں کیا ہے غالباً یہی وجہ رہی ہوگی کہ ان کا استقصا ممکن نہ تھا۔ ان کی کثرت کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نواب فیض اللہ خاں والی رامپور ان کی کفالت کا بار نہ اٹھا سکے[2]۔ البتہ بحرالعلوم کے تلامذۂ خاص میں حسب ذیل خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں:

۱۔ مولوی محمد غوث شرف الملک بہادر (۱۱۶۶ــ ۱۲۳۸ھ) جو مولوی ناصر الدین محمد (م ۱۲۰۶ھ) کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے اور ۷ رمضان ۱۱۶۶ھ میں آرکاٹ میں پیدا ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ وہاں انگریزوں اور فرانسیسیوں کی باہمی کشمکش کی وجہ سے بہت افراتفری و بے اطمینانی تھی، مولوی غوث کی تعلیم کا ابتدائی دور بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا پھر بھی انھوں نے اپنی تعلیم جاری رکھی البتہ ابتدا میں اُن کا حافظہ بے حد کمزور تھا اس لئے کہا جاتا ہے کہ اُن کے دادا قاضی نظام الدین احمد صغیر (۱۱۱۳ــ ۱۱۸۹ھ) نے اپنے کمال باطنی سے ان پر کامل توجہ فرمائی جس کے بعد "محمد غوث نے خواب میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا کہ وہ انھیں اپنے دست مبارک سے زمزم کا پانی پلا رہے ہیں، جب بیدار ہوئے تو ان کے اندر ایک انشراحی کیفیت پیدا ہو چکی تھی، انھوں نے اپنے دادا سے خواب بیان کیا تو انھوں نے ازدیادِ علم مراد لیا۔ اس کے بعد ان کا حافظہ اتنا مضبوط ہو گیا تھا کہ دوسرا کوئی شخص اُن کی برابری نہیں کرسکتا تھا[3]"

۱۔ کوکن: مصدر سابق، ص ۱۹

۲۔ سید سلیمان ندوی: بحرالعلوم، الندوہ (لکھنؤ، جون ۱۹۰۶ء) ج ۳ ش ۵ ص ۲۶۔ ۲۷

۳۔ محمد یوسف کوکن: خانوادۂ قاضی بدرالدولہ (مدراس، ۱۹۶۳) ج ۱، ص ۱۴۸

سب سے بڑی بیٹی کا عقد ملا ازہار الحق بن ملا احمد عبد الحق سے ہوا جن سے ایک صاحبزادی اور دو صاحبزادے مولوی ضیاء الحق وظہور الحق پیدا ہوئے جن میں اول الذکر عین جوانی میں دریا میں غرق ہو گئے۔ صاحبزادی کا عقد مولوی حیدر بن ملا مبین سے ہوا تھا مگر اب ان دونوں سے کوئی اولاد پسری باقی نہیں ہے[1]۔ منجھلی بیٹی کا عقد مولوی عزیز اللہ بن ملا ولی انصاری کے ساتھ ہوا جو لاولد فوت ہوئیں[2]۔ چھوٹی بیٹی کا عقد مولانا علاء الدین بن مولانا انوار الحق سے ہوا جنھوں نے بحر العلوم ہی سے تعلیم حاصل کی تھی اور تلاش معاش کے سلسلہ میں مدراس پہونچے تھے جہاں مدرسہ کلاں میں مدرس ہو گئے اور بحر العلوم کی وفات کے بعد انھیں صدر مدرس مقرر کیا گیا۔ در حقیقت یہی بحر العلوم کے ظاہری و باطنی جانشین ہوئے اور ملک العلماء کے خطاب سے بھی ملقب ہوئے، آپ کی وفات ۱۰ ارشوال ۱۲۴۲ھ میں ہوئی ان سے بفضل خدا اب تک اولاد موجود ہے[3]۔

اخلاق و عادات بحر العلوم کے اخلاق و عادات کی سب سے نمایاں صفت فیاضی اور دریا دلی تھی، جو کچھ آتا احباب و فقراء میں تقسیم کر دیتے اور اہل و عیال کی عسرت و تنگ حالی کی پروا نہ کرتے۔ کبھی کبھی نواب والاجاہ کو خبر ہو جاتی تو وہ براہ راست کچھ بھیجدیا کرتے تھے۔ مزاج میں ادعاء و تمکنت تھی کسی سے بھی دبتے نہ تھے۔ مناظرہ و مباحثہ کے بے حد شائق تھے، تصنیفات میں بھی انداز طبیعت کی جھلک نظر آتی ہے[4]۔ حلقۂ درس بے حد وسیع تھا جس میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی شریک ہوتے تھے۔ مشہور شاعر و منشی راجہ کلبن لعل

۱۔ عنایت اللہ: مصدر سابق، ص ۲۸۔۲۹ و ۱۴۱

۲۔ حوالہ بالا، ص ۸۰۔۸۱ و ۱۴۱

۳۔ حوالہ بالا، ص ۹۱ و ۱۴۱ نیز کوکن: مصدر سابق، ص ۳۴۔۳۵

۴۔ شبلی نعمانی: مصدر سابق، ص ۱۲۰۔۱۲۱

اپنے والد کی تاریخ وفات نکالی

مولانا محمد یوسف کوکن نے مولوی محمد غوث کی اکتیس ۳۱ عربی و فارسی تصانیف کا ذکر کیا ہے[1]
جن میں متعدد چھوٹے چھوٹے رسائل ہیں اور چند کے اب صرف نام ہی محفوظ رہ گئے ہیں، میں ان
میں سے صرف انیس ۱۹ کا مختصر تعارف کرانے پر اکتفا کروں گا جو دستبرد زمانہ سے محفوظ رہ گئی
ہیں اور کسی نہ کسی حیثیت سے کسی خصوصیت کی حامل ہیں، ان کے اسماء الفبائی ترتیب سے
درج ذیل ہیں :

۱۔ انہار المفاخر فی مناقب السید عبد القادر، یہ کتاب فارسی میں شیخ عبد القادر جیلانی
(۱۰۷۸ـ۱۱۶۶ء) کے حالات میں ہے اور ۲۸ شعبان ۱۲۰۹ھ کو مکمل ہوئی انہار المفاخر اس
کا تاریخی نام ہے۔ یہ کتاب بڑی تقطیع کے ۲۴۴ صفحات پر مشتمل ہے اور ۱۲۹۷ھ میں مطبع حیدری مدراس
سے شائع ہوئی تھی۔

۲۔ برہان الحکمۃ ترجمہ ہدایۃ الحکمۃ، ہدایۃ الحکمۃ منطق میں شیخ اثیر الدین مفضل بن عمر الابہری
(م ۱۲۶۱ء) کی مشہور کتاب ہے جو عربی مدارس کے نصاب میں شامل ہے اس کی متعدد شرحیں
لکھی گئی ہیں جن میں ملا حسین معین المیبذی (م ۱۴۶۶ء) اور صدر الدین محمد بن ابراہیم المعروف
بصدرائے شیرازی (م ۱۴۲۴ء) خاص طور پر متداول ہیں اور علی الترتیب میبذی اور صدرا
کے نام ہی سے مشہور و معروف ہیں، مولانا عبد الحق خیر آبادی (۹-۱۸۲۸ـ۱۸۹۹ء) نے بھی
شرح ہدایۃ الحکمۃ کے نام سے اس کی ایک شرح لکھی ہے جو بعض مدارس کے نصاب میں شامل
ہے۔ مولوی محمد غوث نے اس کا فارسی میں تشریحی ترجمہ کیا تھا جو مدراس میں چھپا تھا اور ایک
زمانہ تک وہاں کے مدارس عربیہ کے نصاب میں شامل رہا۔

۱۔ ایضاً، ص ۱۶۱-۱۷۷، تفصیلات ذیل بیشتر انھیں صفحات سے ماخوذ ہیں۔ کچھ مزید تصانیف
کا ذکر سید عبد الحی الحسنی نے بھی کیا ہے ملاحظہ ہو مصدر سابق، ص ۴۵۹-۴۶۰

مولوی محمد غوث نے ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے دادا ہی سے حاصل کی مگر ۱۱۸۹ء میں ان کے انتقال کے بعد مختلف مقامات کا علمی سفر کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مولوی امین الدین احمد خاں (م ۱۱۹۵ھ) اور مولوی ولی اللہ بن عبد العظیم البہاری (م ۱۲۰۵ھ) کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا اس کے بعد مدراس آکر نواب امیر الامراء کے ملازمین میں داخل ہو گئے جنھوں نے انھیں اپنے فرزند ارجمند کا اتالیق مقرر کیا جو ۱۲۱۶ھ میں نواب عظیم الدولہ کے لقب سے گدی نشین ہوئے ۔ نواب والاجاہ کی دعوت پر رجب ۲۲ر ذی الحجہ ۱۲۰۵ھ کو بحر العلوم مدراس پہونچے تو ان کے علم و فضل کی شہرت کے باعث لوگ جوق در جوق ان سے استفادہ کرنے کے لئے آنے لگے مگر نہ معلوم کیوں مولوی محمد غوث کو ان کے درس میں شریک ہونے میں تامل و تردد رہا بالاخر انھوں نے اپنے دادا ، قاضی نظام الدین احمد صغیر کے بتلائے طریقہ پر استخارہ کیا جس کے بعد شرمندگی کے باعث بجائے خود بحر العلوم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا خواب بیان کرنے کے ، انھوں نے چچیرے چچا غلام قادر کے نام خط لکھ کر گذارش کی کہ وہ انھیں کسی طرح بحر العلوم کی خدمت میں پہونچا دیں ۔ چنانچہ ان سے منطق ، فلسفہ اور علم کلام کی مختلف کتابیں پڑھیں اور اس طرح مختلف علوم و فنون میں دستگاہ تامہ حاصل کی اور بالاخر بحر العلوم کے سب سے نامور تلامذہ میں ان کا شمار ہونے لگا ۔

مولوی محمد غوث نہ صرف ایک زبردست عالم دین ہی تھے بلکہ ماہر طبیب بھی تھے اور جیسا کہ ان کی کتاب سواطع الانوار سے پتہ چلتا ہے انھیں فن ریاضی اور علم ہیئت میں بڑا درک حاصل تھا مزید برآں وہ ایک بہترین اتالیق ہونے کے علاوہ حکومتی امور میں بھی کافی دستگاہ رکھتے تھے ۔ انھوں نے ۱۱ر صفر ۱۲۳۸ء میں وفات پائی اور مسجد والاجاہی مدراس کے شمالی احاطہ میں مدفون ہوئے اور بہت سی عربی و فارسی تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں ، آپ کے تین لڑکے اور چار لڑکیاں تھیں جن میں مولوی عبد الوہاب مدار الامراء (۱۲۰۸ — ۱۲۸۵ھ) اور مولوی محمد صبغتہ اللہ قاضی بدر الدولہ (۱۲۱۱ — ۱۲۸۰ھ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ موخر الذکر نے رضوان اللہ علیہ سے

۱۲۳۸ھ

مدار الامراء (۱۲۰۸ – ۱۲۸۵ھ) نے ۲۷/ ذی قعدہ ۱۲۶۹ھ میں مکمل کیا جو ۱۲۷۱ھ میں مطبع شرفیہ مدراس میں چھپا جس کے ۲۱۵ صفحات ہیں۔

۷۔ خواص الحیوان : یہ درحقیقت ان کے دادا قاضی نظام الدین احمد کبیر (م ۱۱۰۰ھ) کے چند نوٹس تھے جن کو انھوں نے ہجی ترتیب کے لحاظ سے جمع کر دیا تھا یہ کتاب ۱۲/ صفر ۱۱۹۴ھ میں مکمل ہو گئی تھی اس کا ۱۲۳۷ھ کا لکھا ہوا ایک قلمی نسخہ امیر نواز جنگ کے کتب خانہ میں موجود ہے جو ۱۱۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

۸۔ رسالہ در رد خواجہ کمال الدین خاں : خواجہ کمال الدین خاں (م ۱۲۲۲ھ) اور مولوی محمد غوث کے استاد مولوی امین الدین احمد (م ۱۱۹۵ھ) میں کچھ معاصرانہ چشمک ہو گئی تھی چنانچہ موخر الذکر نے خواجہ صاحب کے سامنے تین فقہی مسئلے[1] رکھے کہ وہ ان کا جواب دیں خواجہ صاحب نے ان کا جو جواب دیا وہ زیادہ وزنی نہ تھا اور اصل اعتراضات بڑی حد تک باقی رہے پھر بھی لائق شاگرد نے اُن جوابات پر تعلیقات لکھ کر اپنے استاد کی تائید کی "یہ رسالہ علمی تگ وتاز کی ایک بہترین مثال[2] ہے" اس کا ایک قلمی نسخہ جو ۴۴ صفحات پر مشتمل ہے، مدرسہ محمدی مدراس کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

۹۔ رشحات الاعجاز فی تحقیق الحقیقتہ والمجاز : یہ فارسی میں حقیقت ومجاز کے متعلق تیس صفحات پر مشتمل ایک مختصر رسالہ ہے جو ۱۲۰۵ھ میں تحریر کیا گیا تھا اس میں آیات قرآنی کی مثالیں پیش کی گئی ہیں اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ مدرسہ محمدی دیوان صاحب باغ مدراس میں ہے۔

۱۰۔ زواجر الارشاد الی اہل دار الجہاد : یہ مقامات حریری کے انداز پر عربی میں لکھا ہوا ایک مختصر مقالہ ہے جس میں حازم بن الصدوق کو راوی اور ابوالیسر السراجی کو ہیرو بنایا گیا ہے

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کوکن : مصدر سابق ، ص ۱۷۵ - ۱۷۶
[2] کوکن : مصدر سابق ، ص ۱۷۶

۳۔ بسائم الازہار فی الصلوۃ علی سید الابرار : اس کتاب میں درود شریف سے متعلق مختلف مسائل کی فارسی میں تشریح کی ہے اور یہ ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ۱۲۷۰ھ میں مطبع منظہر العجائب مدراس سے شائع ہو چکی ہے۔

۴۔ بسط الیدین لاکرام الابوین : اس مختصر عربی رسالہ میں آیات قرآنی و احادیث کی روشنی میں والدین کے ساتھ اکرام و احترام سے پیش آنے کو ثابت کیا گیا ہے جس کا مبیضہ ۲۹ رمضان ۱۲۰۵ھ میں مکمل ہو گیا تھا مگر غالباً زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکا البتہ اس کا فارسی ترجمہ تنویر العینین علی بسط الیدین لاکرام الابوین کے نام سے ۳۶ صفحات پر مشتمل ۱۲۹۶ھ میں نظام المطابع مدراس سے شائع ہو چکا ہے جو مولوی محمد غوث[1] اعانت خاں کا کیا ہوا ہے جو مصنف کے پوتے اور ان کے صاحبزادہ قاضی بدر الدولہ کے فرزند تھے۔

۵۔ تعلیقات علی شرح قطر الندی ، قطر الندی وبل الصدی کے نام سے ابو عبداللہ بن ہشام النحوی (م ۷۶۰ ۱۲ ع) کی نحو میں ایک مشہور کتاب ہے اس کی شرح[2] پر مولوی محمد غوث نے مختلف تعلیقات لکھی تھیں جنھیں خود ان کے دوسرے پوتے مولوی محمد عبداللہ صدارت خاں نے جو قاضی بدر الدولہ کے فرزند تھے کتابی شکل میں جمع کر دیا ہے اس کا ایک قلمی نسخہ جو ۸۶ صفحات پر مشتمل ہے امیر نواز جنگ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

۶۔ خلاصۃ البیان شرح عقیدہ [عقائد] مولانا عبدالرحمٰن : مولانا عبدالرحمٰن جامی (۱۴۱۴ ــ ۱۴۹۲ ع) نے عقائد کے متعلق فارسی میں ایک منظوم رسالہ لکھا تھا جو بہت مقبول ہوا یہاں تک کہ طلبار کو حفظ کرایا جانے لگا۔ انھیں کے افادہ کی غرض سے مولوی محمد غوث نے اس کی شرح لکھنا شروع کی تھی جسے وہ مکمل نہ کر سکے اور پھر ان کے بڑے لڑکے عبدالوہاب

۱۔ کوکن : مصدر سابق ص ۱۶۵ پر مترجم کا نام حاجی محمد غوث تحریر ہے جو مدار الامرا کے نواسہ تھے۔

۲۔ قطر الندی کی متعدد شرحیں ہیں جن میں ایک خود ابن ہشام کی بھی ہے غالباً یہ اسی کے تعلیقات ہیں

میں یہ شرح لکھی تھی جو ۲۶۸ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ مدرسہ محمدی دیوان صاحب باغ مدراس میں بھی ہے۔ البتہ سید عبدالحی الحسنی نے اس کتاب کا نام الفوائد السبغعیۃ فی شرح الفرائض السراجیہ[1] تحریر کیا ہے۔

۱۴۔ کفایت المبتدی فی فقہ الشافعی: یہ ۱۱۸۲ھ کا عربی میں لکھا ہوا ۳۶ صفحوں کا ایک مختصر رسالہ ہے جس میں فقہ شافعی کے لحاظ سے آسان زبان میں اس کے ضروری مسائل کا بیان ہے اور اس کا ایک قلمی نسخہ امیر نواز جنگ کے کتب خانہ میں ہے۔

۱۵۔ مجموعہ مسائل فقہ شافعی: جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے یہ بھی فقہ شافعی کے مسائل پر عربی میں ایک مختصر رسالہ ہے جو ۶۲ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کا ایک نسخہ حاجی ابو احمد محمد عبداللہ مدراس کے کتب خانہ میں ہے۔

۱۶۔ نثر المرجان فی رسم نظم القرآن: یہ مصنف کی سب سے اہم اور معرکۃ الآرا تصنیف ہے جو انھوں نے اپنے استاد بحر العلوم کی ایما پر عربی میں تصنیف کی جو سات ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے اور علوم قرآنی میں بیش قیمت و گرانقدر اضافہ ہے۔ شروع میں ایک مقدمہ اور دو مقالے ہیں مقدمہ میں علم رسم الخط کے مبادیات پر بحث ہے اور اہم مصادر و مراجع کا ذکر ہے، پہلے مقالہ میں اصول سے بحث کی اور دوسرے مقالہ میں قرآن مجید کی آیات کے رسم الخط سے بحث ہے اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے جس کی پہلی جلد سورۂ نساء تک، دوسری جلد سورۂ توبہ تک، تیسری جلد سورۂ نحل تک، چوتھی جلد سورۂ فرقان تک، پانچویں جلد سورۂ یٰسین تک، چھٹی جلد سورۂ حجرات تک اور آخری جلد سورۂ ناس تک ہے، اس کی تصنیف بحر العلوم کی وفات کے ایک سال بعد یعنی ۱۲۲۶ھ میں مکمل ہوئی۔ یہ حیدرآباد سے شائع ہو چکی ہے۔

۱۷۔ النجم الوقاد فی شرح قصیدۃ بانت سعاد: یہ مشہور مخضرمی شاعر کعب بن زہیر (م ۶۶۲ء)

---

[1] حسنی: مصدر سابق، ص ۵۹۴

یہ صرف گیارہ صفحات پر مشتمل ہے اور ۱۲۱۴ھ کا تحریر کردہ ہے جبکہ مصنف کا قیام حیدرآباد میں تھا اس لئے اس میں وہاں کی معاشرت اور لوگوں کے اطوار و عادات پر طنز کیا ہے ۱۲۳۲ھ میں قاضی بدرالدولہ نے ۲۷ اصفحات پر مشتمل اپنے والد کے اس مقالہ کی عربی میں ایک شرح لکھی تھی جس کا نام مناہج الرشاد شرح زواجر الارشاد رکھا تھا۔ یہ مقالہ اور اس کی شرح دونوں امیر نواز جنگ (حیدرآباد) کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔

۱۱۔ سواطع الانوار فی معرفۃ اوقات الصلوۃ و الاسحار : یہ نوے صفحات پر مشتمل ایک عربی رسالہ ہے جو ۱۰ر شوال ۱۱۹۹ھ کو مکمل ہوا اس میں اوقات صلوٰۃ و سحر کی پہچان کے اصول و طریقے بیان کئے گئے ہیں۔ اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ امیر نواز جنگ (حیدرآباد) میں موجود ہے۔

۱۲۔ فتاویٰ ناصریہ : یہ تقریباً چھ سو صفحات پر مشتمل مختلف فتووں کے جوابات ہیں، درحقیقت مولوی ناصرالدین محمد م (۱۲۰۶ھ) جب آرکاٹ کے قاضی تھے تو فقہ حنفی کے مطابق فتاویٰ دیا کرتے تھے جنھیں ان کے لائق فرزند نے فقہی ابواب پر مرتب کرنے کی کوشش کی تھی مگر پایۂ تکمیل کو نہ پہونچ سکی اور اس کا جو قلمی نسخہ کتب خانہ امیر نواز جنگ میں پایا جاتا ہے اس میں بعض صفحات سادہ ہیں۔

۱۳۔ الفوائد الصبغیۃ شرح الفرائض الرجبیۃ : ابوعبداللہ محمد بن علی الرجبی المعروف بابن المتفننۃ (م ۱۱۰۴ — ۱۲۸۲) کی علم الفرائض میں ایک مشہور عربی نظم ہے جس کا نام بغیۃ الباحث مابغیۃ الباحث عن جمل الموارث ہے مگر یہ عام طور پر "الرجبیۃ" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی بہت سی شرحیں لکھی گئی ہیں جن میں سے صرف دو، ایک محمد بن محمد الدمشقی المعروف لسبط المار دینی (۱۴۲۳ — ۱۵۰۶) اور دوسری ابوبکر بن احمد السبتی کی شارح تک پہونچی تھیں جو ان کے خیال میں بہت مختصر اور طلبا کی ضروریات کے لئے ناکافی تھیں اس لئے انھوں نے اپنے دونوں لڑکوں عبدالوہاب (مدارالامراء) اور صبغۃ اللہ (قاضی بدر الدولہ) کے اصرار پر ۱۲۳۲

میں آپ کا مدراس میں انتقال ہوا اور وہیں بحر العلوم کے پہلو میں دفن ہوئے۔

آپ کی تصانیف میں مولوی علی اکبر الہ آبادی کی مشہور درسی تصنیف فصول اکبری کی مختصر شرح اور حاشیہ میر زاہد علی الرسالۃ القطبیۃ[1] کا ہی پتہ چلتا ہے۔ اگرچہ آپ کی تصانیف کی تعداد سابق شاگرد سے بہت کم ہے پھر بھی آپ درس و تدریس میں بے حد ممتاز تھے اور آپ کی علم نوازی کا جنوب ہند ہمیشہ رہین منت رہے گا

۳۔ بحر العلوم کے تیسرے نامور شاگرد مولانا عماد الدین اللبکنی[2] ہیں جو منطق و فلسفہ میں بڑی دستگاہ رکھتے تھے، آپ نے بحر العلوم کے حرمین شریفین جانے کے بعد ملا حسن (م ۱۲۰۹ھ) صاحب سلم العلوم و شرح مسلم الثبوت وغیرہ سے بقیہ شرح چغمنی[3] پڑھی اور تمام عمر درس و تدریس میں مشغول رہے اور ستر سال کی عمر میں وفات پائی۔

آپ کی تصانیف میں حسب ذیل قابل ذکر ہیں:

۱۔ حاشیۃ علی شرح التہذیب للیزدی، تہذیب المنطق والکلام سعد الدین التفتازانی (۱۳۲۲ — ۱۳۸۹ء) کی مشہور کتاب ہے جو مدارس عربیہ کے نصاب میں داخل ہے اس کی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں جن میں ایک عبد اللہ الیزدی کی بھی ہے۔ یہ اسی کتاب کا حاشیہ ہے۔

۱۔ اس کتاب کا ذکر عبد الباری، مصدر سابق ص ۱۸ و الطاف الرحمن، مصدر سابق ص ۲۷ نیز عنایت اللہ مصدر سابق ص ۹۱ پر ہے۔

۲۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: حسنی، مصدر سابق ص ۲۳۹ و قادری، مصدر سابق ص ۳۵۵ و زبید احمد، مصدر سابق ص ۳۳۹۔

۳۔ علم ہیئت میں محمد بن محمد الجغمینی (م ۱۳۴۴ء) کی الملخص فی الہیئۃ، کافی مشہور ہے اس کی ایک شرح موسیٰ بن محمود قاضی زادہ نے لکھی تھی جو شرح چغمینی کے نام سے مشہور ہے۔

کے اس قصیدہ کی شرح ہے جو خود اس نے ۶۳۰ھ میں مسجد نبوی میں پڑھا تھا، یہ ستاون ابیات پر مشتمل ہے چونکہ اس کا پہلا مصرعہ "بانت سعاد فقلبی الیوم متبول" ہے اس لئے یہ اُن کے ابتدائی دو الفاظ سے مشہور و معروف ہو گیا، اور چونکہ عربی مدارس کے نصاب میں بھی شامل رہا اس لئے طلبار کی ضروریات کے پیش نظر اس کی متعدد شروح لکھی گئیں، یہ شرح ۶۶ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کا ایک قلمی نسخہ حاجی ابو احمد محمد عبداللہ کے کتب خانہ میں مدراس میں ہے۔

۱۸۔ ہدایۃ النبوی علی المنہج السوی فی الطب النبوی: یہ درحقیقت شیخ جلال الدین السیوطی (۵۴۴۱-۱۵۰۵) کی طب نبوی میں مشہور کتاب المنہج السوی والمنہل الروی فی الطب النبوی کی فارسی شرح ہے جو ۱۱۸۹ھ میں مکمل ہوئی تھی، اس کا ایک قلمی نسخہ جو ۳۸۴ صفحات پر مشتمل ہے امیر نواز جنگ (حیدر آباد) کے کتب خانہ میں ہے۔

۱۹۔ الیواقیت المنثورہ فی الاذکار الماثورہ: یہ اوراد و اذکار کی معتبر کتابوں سے منتخب اذکار کا فارسی میں ترجمہ ہے جو ۳۴۲ صفحات پر مشتمل ہے اس کا ۱۲۲۷ھ کا لکھا ہوا ایک قلمی نسخہ امیر نواز جنگ (حیدر آباد) کے کتب خانہ میں ہے۔

۲۰۔ بحر العلوم کے دوسرے نامور شاگرد ملا علاء الدین[۱] بن انوار الحق لکھنوی تھے جو فرنگی محل میں پیدا ہوئے۔ کچھ درسیات ملا محمد مبین فرنگی محلی (م ۱۲۲۵ھ) شارح سلم العلوم و مسلم الثبوت سے پڑھیں اور کچھ اپنے چچا ملا ازہار الحق سے پڑھیں اس کے بعد انہیں کے ہمراہ بحر العلوم کے پاس بوہار چلے گئے اور فاتحۃ الفراغ پڑھ کر وطن واپس ہوئے پھر جب بحر العلوم مدراس پہونچے تو ان کی خدمت میں وہاں پہونچے اور تعلیم و تعلم میں مشغول رہے۔ بحر العلوم کے انتقال کے بعد نواب مدراس نے انھیں مدرسہ کلاں کا صدر مدرس مقرر کیا نیز ملک العلماء کے خطاب سے بھی سرفراز کیا۔ ۱۰ رشوال ۱۲۴۲ھ

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: حسنی: مصدر سابق، ص ۲۰۳، عبدالباری، مصدر سابق، ص ۱۸-۱۹، عنایت اللہ مصدر سابق، ص ۹۱-۹۲، قادری، مصدر سابق، ص ۳۲۰ و الطاف الرحمٰن، مصدر سابق، ص ۲۷-۲۸۔

ادبی مصادر میں آثار عمرؓ

آثار عمرؓ

(۴)

جناب ڈاکٹر ابوالنصر محمد خالدی صاحب پروفیسر شعبۂ تاریخ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

۲۲ اس اثر کا ترجمہ آگے فقرہ نشان ۴۳

۲۳ عمرؓ نے اپنے ہونے والے جانشین کو جو وصیت کی وہ یہ ہے :

میں تم کو اللہ سے تقویٰ (پرہیزگاری) اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں ۔ اللہ کا کوئی شریک (و سہیم و مددگار) نہیں ہے۔

میں تم کو مکہ سے مدینہ آنے میں پہل کرنے والوں سے اچھا برتاؤ کرنے کی وصیت کرتا ہوں۔

میں تم کو انصار سے اچھا سلوک کرنے کی وصیت کرتا ہوں۔ میں وصیت کرتا ہوں کہ ان میں سے جو نیک روش ہوں ان سے مہربانی کا سلوک کرو اور ان میں سے جن لوگوں سے لغزش ہو جائے ان سے درگزر کرو۔

میں تمھیں شہری باشندوں سے اچھا رویہ رکھنے کی وصیت کرتا ہوں۔ وہ دشمنوں کے خلاف تمھارے مددگار ہوں گے لگان و مالگزاری وصول کرتے ہیں وہ جو مال وصول کریں اس میں سے صرف اتنا ہی لو جو ان کے مقررہ حصہ سے زائد ہو۔

۲۔ حل المعاقد و توضیح المقاصد، یہ فلسفہ کے مسائل سے متعلق مختصر رسالہ ہے جو ۱۸۹۱ء میں ملتان میں چھپ چکا ہے۔

۳۔ رسالہ فی العقولات العشرہ، اس میں محقق طوسی کے ابیات کی شرح لکھی ہے۔

۴۔ العشرۃ الکاملۃ: اس میں علم معقولات کی ابحاث ہیں۔

۵۔ العقدۃ الوثیقۃ: یہ بھی علم معقولات کے چند مباحث پر مشتمل ہے۔

زبید احمد نے بحر العلوم کے اور شاگرد حافظ غلام محمد بن شیخ محی الدین بن شیخ عمر[1] کا بھی ذکر کیا ہے جو اسلمی مدراسی کہلاتے تھے اور جن کا نام محمد سعید اسلمی بھی بتلایا جاتا ہے مگر ان کے متعلق بجز اس کے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ یہ شاہ عبد العزیز دہلوی (۱۷۴۶ــ۱۸۲۴ء) کے معاصر تھے اور انھوں نے ۱۸۱۲ء میں شاہ صاحب کی کتاب تحفۂ اثنا عشریہ کا عربی ترجمہ الترجمۃ العبقریۃ والصولۃ الحیدریۃ کے نام سے کیا تھا جس کے قلمی نسخے کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد اور خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ میں موجود ہیں۔

(باقی)

۱۔ زبید احمد: مصدر سابق، ص ۳۸۹ـ۳۹۰

گذارش

خریداری برہان یا ندوۃ المصنفین کی ممبری کے سلسلہ میں خط و کتابت کرتے وقت یا منی آرڈر کوپن پر برہان کی چٹ نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولیں تاکہ تعمیل ارشاد میں تاخیر نہ ہو۔ اس وقت بے حد دشواری ہوتی ہے جب ایسے موقعہ پر آپ صرف نام لکھنے پر اکتفا کر لیتے ہیں۔

(منیجر)

اپنے یہاں سب لوگوں سے یکساں برتاؤ کرو۔ اس کا خیال مت کرو کہ کس پر کتنی ذمہ داری عائد ہوتی ہے (کس کا دائرہ اختیار و اقتدار کتنا وسیع ہے) حقوق اللہ کے بارے میں کسی ملامت گر کی پرواہ نہ کرو۔

اللہ نے مومنوں کو خراج و مالگذاری سے جو کچھ عطا فرمایا ہے تم کو اس کا والی بنایا ہے۔ خبردار! اس کے باٹنے یا دینے دلانے میں ایسا نہ ہو کہ کسی کو اپنی ذاتی پسند کی بنا پر ترجیح دے دو یا کسی کی شخصی طور پر جانب داری کر بیٹھو۔ اگر ایسا کرو گے تو جفا کاری و ستم گری کا ارتکاب کرو گے۔ اس کی وجہ سے اپنے نفس کو ان مباح و جائز چیزوں سے محروم کر دو گے جن میں اللہ نے تم کو کشادگی بخشی ہے۔

خلیفہ ہو کر تم دنیا و آخرت کی منزلوں سے ایک منزل پر پہنچ گئے ہو۔ اگر تم نے اپنی دنیا کے لئے ان امور میں توازن و پاکیزگی اختیار کی جن میں اللہ نے تمھارے لئے کشادگی رکھی ہے تو تم اس ذریعہ سے اللہ پر یقین کامل اور اس کی رضا حاصل کرو گے۔ اگر اس معاملہ میں چاہت غالب اور خواہش مسلط ہو تو پھر تم نے اللہ کی ناراضی اور اس کی نافرمانی مول لی۔

میں تمھیں وصیت کرتا ہوں کہ جن غیر مسلموں کی جان و مال وغیرہ کی تم نے ذمہ داری لی ہے ان پر زیادتی کرنے میں اپنے نفس کو دراز ہونے دو اور نہ کسی دوسرے کے نفس کو۔

مجھے تم کو جو وصیت کرنی تھی وہ کر دی۔ تم کو خیر پر آمادہ کر دیا اور تمھاری خیرخواہی کی۔ اس پر عمل کر کے اس کے ذریعہ اللہ کی خوشنودی حاصل کرو۔ آخرت کو اپنا ٹھکانا بناؤ۔

میں نے جس طرح تمھاری راہ نمائی کی ہے ویسی ہی اپنی ذات اور اپنی اولاد کے لئے بھی کی ہے۔ اگر تم ان باتوں پر عمل کرو جن کی طرف میں نے راہ نمائی کی ہے اور وہاں

میں تمھیں دیہی باشندوں سے نیک رَوِی کی وصیت کرتا ہوں۔ وہ اہل علم کی جڑبنیاد اور اسلام کا مال ومواد ہیں۔ تم ان کے تونگروں سے ان کے اموال کا کم حیثیت حصہ وصول کرو۔ اس مال کو بھی بے نواؤں میں بانٹ دو۔

میں تمھیں ان لوگوں کی بخوبی نگہداشت کرنے کی وصیت کرتا ہوں جو تمھاری امان میں آگئے۔ تم دشمن کا مقابلہ ان کو اپنے پیچھے رکھ کر کرو۔ ان پر ان کی برداشت کی قوت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالو۔ ایسا عمل درآمد اس وقت تک برابر ہوتا رہے جب تک کہ وہ موبولا کو اپنی مرضی سے یا بکراہت صرف ادا کرتے رہیں جو ان پر عائد کیا گیا ہے۔

میں تمھیں اللہ ہی سے امید وبیم رکھنے اور اس کی ناپسندیدگی سے خبردار رہنے کی وصیت کرتا ہوں وہ تمھارے نہایت معمولی شک وشبہ سے بھی باخبر رہتا ہے۔ میں تمھیں وصیت کرتا ہوں کہ لوگوں سے معاملہ کرنے میں اللہ سے ڈرو اور اس کے احکام جاری ونافذ کرنے میں ہرگز نہ ڈرو۔ تمھیں چاہیئے کہ اپنے زیر فرمان رہنے والوں سے انصاف کرنے اور ان کی ضرورتیں پوری کرنے اور ان کی ناگہانی حاجتیں روا کرنے کے لئے اپنا وقت اور اپنی توانائی فارغ رکھا کریں۔ ان کے بے مایوں پر ان کے تونگروں کو ترجیح نہ دو۔ یہ عمل ـــ اللہ چاہے تو ـــ ان کے دلوں کو مضبوط رکھنے اور ان کا بوجھ کم کرنے اور تمھارے انجام کار کے لئے خیر ہوگا تا آنکہ یہ خبر اس تک پہنچ جائے گی جو تمھارے بھیدوں کو جاننے والا اور تمھارے دل کے درمیان حائل رہتا ہے۔

میں تمھیں ہدایت کرتا ہوں کہ تم اللہ کے احکام نافذ کرنے میں اس کی قائم کردہ حدوں کو باقی رکھنے میں اور اس کی نافرمانی کرنے والوں کو سزا دینے میں شدت اختیار کرو۔ ایسے لوگ (جو سزا کے مستحق ہیں) باعتبار مقام ومنزلت تم سے نزدیک ہوں یا دور۔ ایسا نہ ہو کہ کسی فرد پر سزا نافذ کرنے میں تمھاری رحم دلی آڑے آئے تا آں کہ جس طرح اس نے اللہ کی حرمتوں کی ہتک کی ہے تم بھی اس کی ویسی ہی ہتک کر ڈالو۔ سزا بقدر جرم ہونی چاہیئے۔

سلامتی کی دعا کرتا ہوں ۔

البیان والتبیین ۔ج ۲ ص ۴۶ ہم جاری

۳۴ عمرؓ کا ہدایت نامہ جو آپ نے عدل گستری کی بابت ابوموسیٰ عبداللہ ابن قیس اشعری (م ۴۲ ؟ ۵۲ ؟) کو لکھا ۔

بقول جاحظ یہ ہدایت نامہ ابو محمد سفیان ہلالی م ۱۹۸ ، ابوبکر عبداللہ ہذلی م ۱۶۷ اور سلمہ فہری تینوں نے قتادہ سدوسی م ۱۱۷ سے نقل کیا ہے ۔ اس کی روایت ابو یوسف یعقوب زہری م ۲۰۸ نے عبیداللہ بن ابی حمید ہذلی سے اور انھوں نے ابوملیح اسامہ ہذلی سے بھی کی ہے ۔

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت مہربان اور رحمت والا ہے ۔ حمد و صلات وسلام کے بعد : اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فصل خصومات ایسا فریضہ ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں رہا ۔ یہ ایسا عمل درآمد ہے جس کی سب ہی نے پیروی کی ہے ۔ اچھی طرح جان لو کہ اگر کسی نے اپنا دعویٰ پیش کیا اور تم پر اس کی صحت واضح کر دی تو اس کو صرف حق بجانب کہہ دینا سودمند نہیں ہوگا جب تک کہ تمھارا فیصلہ نافذ نہ ہو جائے ۔

ایوان عدالت میں اپنے روبرو ہر ایک سے ایسا تسلی آمیز وہمت افزا سلوک کرو کہ ہر فریق ایک دوسرے کے مقابل ہم درجہ وہم رتبہ رہے تاکہ ذی حیثیت کو تمھاری ناانصافی کی طمع ہو (کہ تم اسی کی جانب داری کروگے) اور نہ بے حیثیت کو تمھاری زیادتی کا اندیشہ (کہ اس کی نہیں سنی گئی)

اپنا حق ثابت کرنے کے لئے مدّعی پر دلیل پیش کرنا اور دعوی کا انکار کرنے والے (مدعی علیہ) پر قسم کھانا واجب ہے ۔ مسلموں کے درمیان باہمی صلح جائز ہے لیکن ایسی صلح جائز نہیں جو حلال کو حرام یا حرام کو حلال کر دے ۔

اگر کل تم نے کوئی فیصلہ کر دیا تھا مگر بعد کو اس میں غلطی پر تنبہ ہوا اور اس کی اصلاح

تک پہنچ جاؤ جہاں تک پہنچنے کی میں نے تم کو ہدایت کی ہے تو تمھیں اپنا ذخیرہ پورا اور اپنا حصہ وافر ملے گا۔ اور اگر تم نے اس کو قبول نہیں کیا اور اس پہ پوری توجہ نہیں کی اور اہمیت کے حامل بڑے کام اس شخص کے لئے نہیں چھوڑے جن کی وجہ سے اللہ تم سے راضی ہو تو اس ترک کی وجہ سے تمھارا استحقاق بہت کم ہو جائے گا۔ اس کے بارے میں تمھاری رائے خراب ہو جائے گی کیونکہ خواہشیں مختلف ہوتی ہیں (ایک شخص کو جو اختیار و اقتدار تفویض کیا گیا ہے اس کے اختیار و اقتدار میں دخل اندازی نہ ہونی چاہیئے)

یہ ابلیس ہی ہے جو تمام خطاؤں کی ابتداء کراتا اور تباہیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ تم سے پہلے گزری ہوئی بہت سی پیڑھیوں کو گم راہ کر کے وہ انھیں آگ میں ڈھکیل چکا ہے۔ اللہ کے دشمن سے موافقت کرنے اور اس کی نا فرمانی کا میلان رکھنے پر جس کسی کو جو کچھ ملا وہ اس موافقت و میلان کا نہایت برا بدل ہوگا۔

اب تم حق کو ساتھ لے کر جس بھنور میں چاہو کود پڑو۔ اپنے نفس کے لئے واعظ بنو۔ میں تمھیں اللہ کے نام پر قسم دے کر کہتا ہوں کہ تم مسلموں کی جماعت سے رحم آمیز سلوک کرتے رہو اس طرح کہ ان کے بزرگوں کی بڑائی کرو۔ ان کے چھوٹوں پر مہربانی کرو۔ ان کے عالموں کو باوقار بناؤ۔ انھیں مارومت کہ وہ خوار ہو جائیں مال کی تقسیم میں ان پر کسی کو ترجیح نہ دو کہ تم سے بغض رکھنے لگیں۔ ان کے عطیے وقت پر باقاعدہ ادا کر دیا کرو۔ ورنہ وہ تاخیر کی وجہ سے حاجت مند ہو جائیں گے۔

جب مسلموں کو جنگ پر بھیجو تو اتنی مدت تک میدان جنگ میں نہ رہنے دو کہ ان کی نسل منقطع ہو جائے اور نہ ان کی دولت انھیں کے دولت مندوں میں گردش کرتی رہے۔ مسلموں کے لئے اپنا دروازہ بند نہ کرو (کہ شاکی کی شکایت تم تک پہنچ نہ سکے) اور ان کا زور آور ان کے کمزور کو نگل جائے۔

میری یہ وصیت خاص تمھارے لئے ہے۔ اب میں اللہ کو تم پر گواہ بناتا اور تمھاری

انصاف کرتے وقت (فریقوں کے بیانوں سے اکتا کر) بے چین، بیزار، بے قرار یا کبیدہ خاطر نہ ہونا چاہیئے۔ اس کا خصوصی خیال رکھو۔ اگر اہلِ مقدمہ سے کسی شخص نے تم کو ایذا دی تھی تو تم اس کے خلاف تنگ دلی مت کرو۔

(فریق مقدمہ کے) کسی ایسے شخص سے نفرت نہ کرو جس نے تم سے (کسی نہ کسی وجہ سے) جھگڑا کیا تھا۔

ایسے ایوانِ عدالت (جہاں مذکورہ صفات کے قاضی ہوں) وہ مقام ہیں جن کے ذریعہ اللہ جزائے خیر واجب کر دیتا اور ان کے وسیلہ سے نیک عمل کے ذخیروں کو بہتر بناتا ہے۔

جس کسی کی نیت اس کے اور اللہ کے درمیان خالص ہو (دکھاوا نہ ہو) تو اللہ اس کے اور لوگوں کے درمیان جو کچھ ہوا ہے اس کے لئے کافی ہو جاتا ہے خواہ اس کی یہ خالص نیت اپنی ذات ہی کو (اللہ کی عقوبت سے) بچانے کے لئے کیوں نہ ہو (اللہ اس کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا) لیکن جو شخص لوگوں کی خاطر اپنے کو کسی بات سے خوش نما بناتا ہے، اور اللہ جانتا ہے کہ وہ فی الواقع ایسا نہیں ہے تو اللہ اس کو بے آبرو کر دیتا (اس کی بدباطنی ظاہر کر دیتا) اور اس کے فعل کا اخلاص سے خالی ہونا آشکارا کر دیتا ہے۔

اب بتاؤ اللہ کے یہاں اس کے فوری دین اور اس کے خزانوں کی بابت (جو تمہاری آخرت کے لئے ہیں) تمہارا کیا گمان ہے؟ اللہ تم کو سلامت رکھے۔

البیان والتبیین ج ۲ ص ۴۸ جاری + رسائل ج ۲ ص ۳۱

۲۵ عمرؓ نے عمرو بن معدیکرب سے والی عراق سعد بن ابی وقاص بن اہیب زہری م ۵۵ھ کے متعلق پوچھا تو ابن معدیکرب نے کہا: بہت خوب امیر ہے۔ سادہ لباس میں نبطی، ہماری دار چادر میں عرب، گوہی میں ببر، جھگڑے چکانے میں عدل گستر، مال تقسیم کرتا ہے سب کو برابر دیتا ہے۔ رات میں لشکر روانہ کرتا ہے تو خود بھی ساتھ رہتا ہے۔ ہمیں ہمارا

کی طرف راہ نمائی ہوگئی تو پھر حق و صواب کی طرف رجوع ہونے میں کوئی امر مانع نہیں ہونا چاہئے (غلطی کی نظیر نہیں ہوسکتی) کیونکہ حق قابل تقدیم و ترجیح ہے۔ حق کی طرف پلٹنا باطل میں پڑے رہنے سے بہر طور بہتر ہے۔ اس وقت بہت سوچو بہت غور کرو جب کسی ایسے مقدمہ میں تمہارے دل میں خلجان پیدا ہو جس کا حکم اللہ کی کتاب میں ملے اور نہ رسول اللہ صلعم کے عمل میں ایسی صورت میں زیر دوران مقدمہ کی جیسی مثالوں اور اس سے مشابہ مقدموں پر غور کر کے ان پر قیاس کرو پھر اجتہاد کر کے وہ فیصلہ اختیار کرو جو اللہ کو سب سے زیادہ پسندیدہ اور حق سے قریب ترین معلوم ہو۔

مدعی کے گواہ برسر اجلاس موجود نہ ہوں یا وہ اپنے دلائل بروقت ظاہر نہ کرسکے اور وہ مہلت چاہے تو اس کو گواہوں کے حاضر ہونے یا (اظہار و) بیان دینے کے لئے مہلت دو۔ جب وہ دلائل و شواہد پیش کر دے تو اس کو اس کا حق دلا دو۔ ورنہ مہلت ختم ہونے پر اس کے خلاف فیصلہ صادر کر دو۔ ایسا کرنے سے تمہاری غیر جانب داری میں کسی کو شک نہیں ہوگا۔ جو مذبذب تھے ان کے لئے بات واضح ہو جائے گی اور انصاف رسانی میں بقدر استطاعت تمہاری کوشش پوری ہو جائے گی۔

سب مسلم آپس میں ایک دوسرے کے لئے راست باز ہوتے ہیں (ایک دوسرے کے معاملے میں سچی گواہی دیں گے) البتہ اس شخص کی گواہی نہیں قبول کی جائے گی جس کو (گناہ کبیرہ کے ارتکاب پر) بطور سزا کے کوڑے لگائے گئے ہوں یا جس کے جھوٹے گواہ ہونے کا تجربہ ہو چکا ہو یا جو اپنے آقا یا قرابت کی نسبت میں ملزم گردانا گیا ہو۔ (یعنی جس نے اپنی غلامی کی نسبت اپنے حقیقی آقا کی طرف نہیں کی بلکہ اپنے آپ کو دوسرے فرضی آقا کی طرف منسوب کیا۔ قرابت داری کی غلط نسبت دینے کا بھی یہی حکم ہے)

تمہاری پوشیدہ بداعمالیوں کی سزا دینے نہ دینے کا اختیار اللہ ہی کو ہے۔ وہی تمہاری خطاؤں پر دلائل و شواہد اور شبہوں کے ذریعہ تمہیں سزاؤں سے بچاتا ہے۔

آسان تر ہے۔

البیان والتبیّن ج ۲ ص ۸۱ + البخلاء ج ۲ ص ۱۴۴

۳۸ عمرؓ نے فرمایا عمامے عربوں کے تاج ہیں۔

البیان والتبین ج ۲ ص ۸۸ و ۲۸۷ + ج ۳ ص ۱۰۰

توضیح: افسر = تاج = دیہیم، شملہ = صافہ = مکٹ = منڈاسا۔ جس طرح تاج ایرانیوں کے لئے باعث زینت و شرف ہے اسی طرح عمامہ عربوں کے لئے ہے۔

۳۹ ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ ظاہر کیا تو عمرؓ نے اس سے پوچھا: کیوں؟ طلاق دینے کی کیا وجہ ہے؟ اس نے کہا: مجھے اس سے محبت نہیں ہے۔ آپؓ نے فرمایا: کیا سب خاندان محبت ہی کی بناء پر آباد ہیں؟ (اگر ایسا ہوتا تو پھر) پاس داری، حرمتِ رشتہ، سرپرستی یا کفالت کہاں گئی؟

البیان والتبیّن ج ۲ ص ۸۹

توضیح: زن وشو کو باہمی تعلقات میں صرف محبت ہی نہیں بلکہ دوسرے امور جیسے مثلاً رشتہ داری وغیرہ کا بھی خیال رکھنا چاہیئے۔ ایک دوسرے میں سب خوبیوں کی توقع رکھنا ناواجبی ہے۔

۴۰ عمرؓ نے ایک دیہاتی عرب کو یہ کہتے سنا: یا اللہ ام عونی کے گناہوں کو معاف فرما۔ آپؓ نے پوچھا: یہ ام عونی کون ہے؟ بدوی نے کہا: میری عورت! بے وقوف ہے۔ شوہر سے جھگڑتی رہتی ہے۔ کھاتی اتنا زیادہ ہے کہ کچھ نہیں چھوڑتی۔ سڑی گلی کی بھی پرواہ نہیں کرتی۔ ان قباحتوں کے باوصف حسین و دلآرام ہونے کے سوا کئی بچوں کی ماں بھی ہے۔ اس کو چھوڑنا میرے بس سے باہر ہے۔

البیان والتبیّن۔ ج ۲ ص ۹۵

۴۱ عمرؓ نے فرمایا: عربوں کا بہترین فن (ان کی ہنرمندی) ابیاتِ شعر ہیں وہ انھیں

حق اس طرح پہنچاتا ہے جس طرح چیونٹیاں پہنچاتی ہیں۔

عمرؓ نے کہا: واہ واہ! تم نے توستائش کا حق ادا کر دیا۔

البیان والتبیّن ۔ ج ۲ ص ۶۸

تنبیہ : اصل عربی عبارت میں جو لطف ہے وہ اردو میں راقم الحروف برائے نام بھی منتقل نہیں کر سکا۔

۳۶ عمرؓ نے فرمایا : قرآن پڑھو۔ اس کی وجہ سے معروف و ممتاز ہو جاؤ گے۔ اس پر پر عمل کرو۔ اس کے مصداق بن جاؤ گے۔

حق دار کو اس کا حق ہرگز نہیں ملے گا اگر اس نے اللہ کے احکام سے روگردانی میں کسی اور کی فرماں برداری کی۔ اگر کوئی اپنا حق طلب کرنے کھڑا ہوا یا کوئی بڑی (خطرناک) بات (بطور تنبیہ) یاد دلائے تو اس کا وقت ہرگز قریب نہیں آ لگے گا اور نہ کسی صورت اس کو ملنے والی شئے اس سے دور ہو جائے گی۔

البیان والتبیّن ج ۲ ص ۷۰

توضیح : حق طلب کرنے میں صاحبِ اقتدار سے نہیں ڈرنا چاہئے۔ اور صاحب اقتدار کو اللہ کا خوف دلانے میں پس وپیش کرنا مناسب نہیں۔ البتہ آدابِ نصیحت کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔

۳۷ عمرؓ سے بیان کیا گیا کہ قریش کے نوجوان اپنا مال بکثرت خرچ کرتے ہیں تو آپؓ نے فرمایا: اس طرح ان کا محتاج ہو جانا مجھے ناپسند ہے مگر ان کے محتاج ہو جانے سے زیادہ مجھے یہ بات زیادہ گراں گزرے گی کہ وہ اپنے سرمایہ کو مشغول نہ کریں۔

دوسری روایت کے اعتبار سے عمرؓ نے قریش کے نوجوانوں کا ذکر کرتے ہوئے مال خرچ کرنے میں ان کی بے اندازہ زیادتی اور دولت لٹانے میں ان کے ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی کوشش پر کہا: محتاج کو مال دار بنانا بگڑے کو بنانے سے

سمجھوتہ کرانے کی ممکنہ کوشش کرو۔

البیان والتبیین ۔ ج ۲ ص ۱۵۰

توضیح: پردیسی سے اُنس برتنے کا مطلب، حسب رواجِ وقت، مقدمہ کا فیصلہ ہونے تک مدعی کے لابدی ضروریات ۔ طعام وقیام وغیرہ کی ذمہ داری محکمہ عدالت پر رہتی ہے ۔ ذرائع آمدو رفت کی قلت اور مقدمہ میں فیصلہ کی طوالت کی وجہ سے پردیسی پر اہل وعیال کی فرقت شاق گزرتی ہے ۔ عدالت ہر ہر قصبہ میں قائم کرنا ممکن بھی نہیں تھا ۔

اس مراسلہ کے مضمون سے ملتا جلتا وہ خط بھی ہے جو عمرؓ نے معاویہ کو لکھا تھا۔ جاحظ نے یہ اپنی ایک مختصر کتاب میں نقل کیا ہے ۔ اس کا ترجمہ یہ ہے :

حمد و صلوٰۃ کے بعد۔ میں نے اس خط میں اپنی اور تمہاری خیر خواہی کرنے کی انتہائی کوشش کی ہے۔ اچھی طرح خیال رکھو کہ اپنے اور عام لوگوں کے درمیان کوئی روک نہ ہونی چاہیئے۔ کم زور کو اپنے یہاں آنے کی اجازت دینے میں دیر نہ کرو۔ اس کو اپنے سے قریب جگہ دو تاکہ اس کی زبان کھلے ، اس کا دل جری ہو۔ پردیسی سے اِلف و اُنس برتو اگر اس کو (اجازت یا فیصلہ کے انتظار میں) زیادہ وقت لگے اور اجازت ملنے میں تنگی محسوس ہو تو وہ اپنے حق سے دست بردار ہو جائے گا ، اور اس کی دل شکنی ہوگی ۔ ایسے شخص کا حق دراصل اس نے مارا جس نے اس کے مقدمہ کا فیصلہ کرنے میں اسے روکے رکھا۔

جب کبھی تم کسی مقدمہ میں مناسب وموزوں فیصلہ تک نہ پہنچ سکو تو لوگوں کو آپس میں سمجھوتہ کرنے پر اکساؤ (اس کے فائدے دل نشین کراؤ) اگر جھگڑنے والے دونوں فریق تمہارے آگے پیش ہوں ، راست بازانہ دلائل وغیرہ ظاہر کردیں اور صاف صاف قسمیں کھالیں تو پھر اپنا فیصلہ صادر وجاری کردو۔

تم پر سلامتی ہو۔

کتاب الحجاب رسائل ج ۲ ص ۳۱

اپنی حاجت مندی رفع کرنے کے موقع پر پیش کرسکتا ہے ان کے ذریعہ وہ سخی کو اپنی طرف مائل اور بخیل کو اپنے اوپر مہربان بنا سکتا ہے۔

البیان والتبیین ج ۲ ص ۱۰۱ و ۳۲۰

۴۲ عمرؓ نے فرمایا: اگر تم میں سے کوئی کسی کے پاس تین مرتبہ جائے مگر تمھیں اس سے کوئی بھلائی نہ پہنچے تو پھر اس کے یہاں جانا چھوڑ دو۔

البیان والتبیین ج ۲ ص ۱۰۱

۴۳ حفص بن صالح ازدی اپنے شیخ عامر بن عبد اللہ شعبی م ۱۰۳ھ سے روایت کرتے ہیں کہ: عمرؓ نے معاویہ کو لکھا: حمد و ثنا کے بعد۔ میں نے فصلِ خصومات کی بابت تمھیں ایسا خط لکھا ہے جس میں میں نے تمھاری اور خود اپنی خیر خواہی کی امکانی کوشش کی ہے۔

انصاف رسانی میں پانچ قاعدوں پر عمل پیرا رہو تمھارا دین سلامت رہے گا اور اس میں تمھیں بہترین حصہ ملے گا۔

۱۔ جب کسی مقدمہ میں دو فریق تمھارے سامنے آئیں تو لازمی ہے کہ تم مدعی سے ٹھیک ٹھیک بیان از قسم دلائل و گواہ وغیرہ اور مدعی علیہ سے واضح قسم کا مطالبہ کرو۔

۲۔ کم زور کو اپنے قریب آنے دو تاکہ اس کا دل مضبوط ہو اور اس کی زبان کھل سکے۔

۳۔ پردیسی سے اِلف و اُنس برتو کیونکہ اگر اجنبیت و بیگانگی برتوگے تو وہ اپنے حق سے دست بردار ہوکر اپنے اہل و عیال کی طرف (بحالت مایوسی) واپس لوٹ جائے گا۔ ایسے پردیسی کا حق اس نے تلف کیا جس نے پردیسی کی رفاقت نہیں کی۔

۴۔ فریقین پر اپنی نظریں اس طرح ڈالو کہ وہ دونوں اپنے آپ کو ایک دوسرے کا مماثل سمجھیں (تم پر جانب داری کا شبہ نہ ہونے پائے)

۵۔ جب کبھی تم کسی مقدمہ میں مناسب و موزوں فیصلہ تک نہ پہنچ سکو تو پھر لوگوں میں باہمی

پوری کرنے کو پسند نہیں فرمایا۔

۴۷ عمرؓ نے فرمایا: تم میں سے کسی کو کیا پڑی ہے کہ وہ کسی ایسی عورت کے سامنے اپنے بستر پر اترائے جس کا شوہر جنگ پر گیا ہوا ہے اور وہ اپنے گھر میں تنہا ہے۔ عورت تو بوچڑ کے کندے پر کا گوشت ہے اِلّا یہ کہ کوئی اس کو بوچڑ کی کاٹ سے بچائے رکھے۔

البیان والتبیین۔ ج ۲ ص ۱۹۱

شرح: اپنے بستر پر اترانے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ یہ ظاہر کرے کہ میری بیوی تو میرے پہلو میں رہتی ہے۔ مجھے اس سے سکون ملتا ہے۔ اس طرح اترانے والا گویا عورت کو جنسی ترغیب دینے یا اس کو اپنے شوہر کی مفارقت پر بے چین کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ ایسا قول وفعل اسلامی ادب کے خلاف ہے جو محاذ جنگ پر جانے والوں کی بیویوں کے جذبات کو کسی طرح برانگیختہ کئے جائیں۔

۴۸ حصین بن ابی حر مالک علاقۂ میسان میں عمرؓ کے عامل تھے۔ ایک مرتبہ حصین نے عمرؓ کے یہاں ایک مراسلہ روانہ کیا۔ اس کی تحریر میں زبان کی غلطی تھی۔ عمرؓ نے حصین کو لکھا: تم اپنے کاتب کو کوڑے لگاؤ۔ (کہ آئندہ ایسی غلطی نہ کرے)

البیان والتبیین۔ ج ۲ ص ۲۱۶ جاری

۴۹ عمرؓ نے فرمایا: جس طرح تم اللہ کے احکام اور اس کے رسول صلعم اور اس کی سنتوں کا علم حاصل کرتے ہو اسی طرح نحو کا علم بھی سیکھو (تاکہ صحیح عربی بول اور لکھ سکو اور ما فی الضمیر کے اظہار میں غلطی نہ ہونے پائے)

البیان والتبیین۔ ج ۲ ص ۲۱۹

(باقی)

٤٤ ابو یوسف (یعقوب بن ابراہیم امام ؟) اپنے شیخ عبدالرحمان محمد بن عبداللہ عرزمی م ١۵۵ھ سے روایت کرتے ہیں اور وہ اس راوی سے جس نے ابو اُمیہ شریح بن حارث م ٧٢ھ سے روایت کی ہے۔

عمرؓ نے معاویہ بن ابی سفیان صخر کو لکھا:

مجلس عدالت میں کسی فریق سے سودا کرو نہ جھگڑا اور نہ حق دار سے حق چھینو (نہ کسی کو نقصان پہنچاؤ) کسی کو کچھ بیچو اور نہ کسی کو کچھ بیچنے دو (کسی کو کچھ دینے دلانے یا خود کچھ لینے سے اجتناب کرو) اگر تم غصہ کی حالت میں ہو تو فریقین کا ہرگز فیصلہ مت کرو۔

البیان والتبیین۔ ج ٢ ص ١۵٠

تنبیہ: یہ خط غالباً کسی طویل مراسلہ کا ایک جزء ہے۔

٤۵ عمرؓ نے احنف بن قیس سے فرمایا: جو زیادہ ہنستا ہے اس کا رعب کم ہو جاتا ہے۔ جو شخص جو بات یا جو کام بکثرت کرتا ہے اس کا حسن وقبح اس کی نیت سے جانا جاتا ہے۔ جو زیادہ ٹٹول کرتا ہے اس سے خطائیں (غلطیاں) بھی زیادہ سرزد ہوتی ہیں۔ جس سے غلطیاں زیادہ ہوتی ہیں اس سے پرہیزگاری کم ہو جاتی ہے۔ جس میں پرہیزگاری کی قلت پائی جاتی ہے اس کی شرم وحیا جاتی رہی۔ اور جس میں حیا باقی نہیں رہی سمجھو کہ اس کا دل ہی مر گیا۔ (جس کا دل ہی مر گیا سمجھو کہ اس کی زندگی اکارت گئی)

البیان والتبیین ج ٢ ص ١٨٨

٤٦ عمرؓ نے فرمایا: عورتوں کو اکثر "نا" کہا کرو کیونکہ "ہاں" ان کو مانگنے کی ترغیب دیتا ہے۔

البیان والتبیین۔ ج ٢ ص ١٩٠ نیز ج ٣ ص ١۵۵

اس پر جاحظ کا تبصرہ ہے: ہر کسی کی مانگ پر "نا" کہنا درست نہیں معلوم ہوتا (حاجت برآری کی کوشش کرنی چاہیئے) عمرؓ نے عورتوں کی طبعی کمزوری کے پیش نظر ان کی ہر خواہش

پہلے یہ مسجد "جامع ام الطبول" کے نام سے مشہور تھی، تعمیر جدید کے بعد اس کا نام "جامع الشہداء" ہوگیا۔
جامع الشہدار کا یہ ڈنر ہر لحاظ سے شاندار رہا محفل کی چہل پہل بڑی ہی دل آویز تھی، دور دور سے آئے ہوئے نمایندے کھلے دل سے باتیں کر رہے تھے، مذاکروں کا رنگ ادبی بھی تھا اور علمی بھی، یہ پُر رونق اجتماع کم وبیش دو گھنٹے رہا، شیخ نافع قاسم اور ڈاکٹر عبدالستار مجلس کی نوک پلک درست کرنے میں ہمہ تن مشغول رہے۔

جمعہ ۱۴ ار فروری کی صبح کو سامرّا جانے کا پروگرام تھا، قرار داد کے مطابق تمام وفود پہلے "قاعۃ النعمان" میں جمع ہوئے اور ۱۰ بجے کے قریب بسیں اس تاریخی شہر کے اجڑے ہوئے نشانات دیکھنے کے لیے روانہ ہوگئیں، سامرّا کی قدیم تاریخ کے بہت سے نقوش ذہن میں تھے اس لیے قدرتی طور پر عباسیوں کے اس دوسرے فنی شاہکار کے کھنڈر دیکھنے کا شوق تھا۔ "برہان" کے تلخیص وترجمہ کے تحت جولائی ۱۹۳۹ء میں کیپٹن کرسیول پروفیسر جامعہ فواد اول مصر کا ایک محققانہ مضمون شایع ہوا تھا، مقالے کے مترجم "ندوۃ المصنفین" کے رفیق مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھی تھے جو اِن دنوں دارالعلوم الاسلامیہ نیو ٹاؤن کراچی میں استاذ ہیں، پروگرام میں سامرّار کا نام دیکھا تو ۳۶ سال قبل کے شائع شدہ مضمون کی یاد تازہ ہوگئی، یہ مضمون "برہان" کے چار نمبروں میں شائع ہوا تھا اور بہت پسند کیا گیا تھا۔ مورخ "یعقوبی" نے سامرا (سُرّمن رائی) کی تاسیس کے متعلق لکھا ہے "سُرّمن رائی خلفائے بنو ہاشم کا دوسرا فنی شاہکار ہے، یہ آٹھ عباسی خلفار کا مرکزِ حکومت رہا ہے جن کے نام یہ ہیں: معتصم ابن ہارون الرشید، واثق ہارون بن معتصم، متوکل جعفر بن معتصم، منتصر محمد بن متوکل، مستعین احمد بن محمد بن معتصم، معتز ابو عبداللہ بن متوکل، مہدی محمد بن واثق، معتمد احمد بن متوکل، سرمن رائی (جس نے دیکھا مسرور وشاداں ہوا) سامرّا (Samarra) کا اصل تلفظ یہی ہے" اور سامرا اسی کا اختصار ہے، یہ بغداد اور تکریت کے درمیان دجلہ کے مشرقی ساحل پر بغداد سے ۹۰ میل (تقریباً ۱۵۰ کیلومیٹر) ہے اسی شہر میں وہ مشہور سرنگ ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ امام مہدی یہیں سے نکلیں گے، کہتے ہیں اس شہر کو سب سے پہلے سام بن نوح نے آباد کیا تھا اور یہ اسی کی طرف منسوب ہے، فارسی میں اس کا تلفظ

عالمی اسلامی کانفرنس

عراق میں نو روز

(۲)

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی

ہندوستان کے نمائندے کو نائب رئیس اول بنانے پر مجھے تعجب سا ہوا، کیونکہ بہت کچھ ہونے کے باوجود ہندوستان اصطلاحی طور پر "مسلم مملکت" نہیں ہے، اس پر بھی ہمارے ملک کو یہ امتیاز بخشا گیا، اس چیز کو موتمر میں شریک ہونے والے تمام ہی نمائندوں نے مسرت آمیز انداز میں محسوس کیا اور مجھے مبارکباد دی، عہدہ داروں کے انتخاب کے بعد چند کمیٹیاں بنائی گئیں، خاص طور پر موتمر میں پیش ہونے والی تجویزیں مرتب کرنے کے لئے ایک کمیٹی کی تشکیل ہوئی۔۔۔ اور پہلی نشست کی کارروائی اس مرحلے پر ختم ہوگئی۔ رات کے کھانے کا انتظام ڈاکٹر احمد عبدالستار جواری وزیر دولت اور رئیس لجنۃ التحضیۃ مؤتمر علماء المسلمین کی طرف سے اُمّ الطبول کی "جامع الشہداء" میں تھا، "جامع الشہداء" بغداد کی تاریخی اور نہایت شاندار مسجد ہے، اس کی وسیع جدید عمارت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، اجتماع کی پہلی نشست سے فارغ ہو کر پروگرام کے مطابق تمام نمائندے "جامع الشہداء" پہونچ گئے اور عشاء کی نماز باجماعت میں شریک ہوئے، مسجد کے ساتھ بڑے بڑے ہال بنے ہوئے ہیں، کھانے کا انتظام یہیں تھا، رات زیادہ ہوگئی تھی ورنہ اس خوبصورت مسجد اور اس کے کتبوں اور تحریروں کا اطمینان سے مطالعہ کیا جاتا، کھانے کے بعد واپسی میں اس کے دروازوں پر سرسری نظر ڈالی اور قیام گاہ لوٹ آئے،

کی طرف آتی تھیں، ہر سڑک پر ہر قسم کے تجارتی سامان کی بڑی بڑی فرمیں اور صنعت وحرفت کے کارخانے موجود تھے، ہر ایک سڑک کی چوڑائی کم سے کم سوہات تھی تاکہ جب خلیفہ اپنے خدم وحشم کے ساتھ مسجد میں آئے تو راستے میں تنگی اور دشواری نہ ہو۔ قلتِ وقت اور بندھے ہوئے پروگراموں کی وجہ سے نہ توہم اس قدیم دار السلطنت کے محلوں، بازاروں اور حویلیوں کے پُر ہیبت کھنڈر دیکھ سکے، نہ اس کی جدید آبادی ہی میں گھوم پھر سکے بلکہ اس کے ٹوٹے اور مٹے ہوئے نقش ونگار اور شکستہ دیواروں کو چشمِ تصور سے دیکھ کر آگے بڑھ گئے، اور زبانِ حال سے "تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ" کے غیر فانی اصول کی معجز نمائیوں کا وِرد کرتے رہے۔

جامع متوکل باللہ کی یہ تھوڑی سی تفصیل اس لیے بھی دی گئی کہ اس کی زیارت ہمارے پروگرام کا اہم ترجزو تھی، نیز یہ کہ پڑھنے والوں کے ذہن میں ہزاروں سال پہلے کی اس مسجد کا ہلکا سا اجمالی نقشہ آجائے، مؤتمر کے کارپردازوں نے خوب کیا کہ نمازِ جمعہ کا پروگرام زمانۂ قدیم کے اس لاجواب تاریخی شہر کی جامع مسجد میں رکھا، پروگرام میں گنجائش ہوتی تو شہر کے دوسرے بے شمار نشانوں اور کھنڈروں کو بھی دیکھتے اور عبرت حاصل کرتے لیکن واپسی ہر روزہ تھی اس لیے مسجد سے سیدھے حکومت کے قائم کیے ہوئے دواسازی کے مرکز "الشرکۃ العامۃ لصناعات الادویہ" کی سیر کے لیے روانہ ہوگئے گویا قدیم کھنڈروں کی دنیا سے ایک جدید اور متمدن دنیا میں آگئے، ہمیں بتایا گیا کہ دواسازی کا یہ کارخانہ نہ صرف عراق بلکہ پوری مشرق وسطیٰ میں سب سے بڑا کارخانہ ہے، قاعدے میں اس عظیم الشان کارخانے کو دیکھنے کے لئے کئی گھنٹوں کی ضرورت تھی مگر ہم اس کا سرسری ہی معائنہ کرسکے ایک دوا مرحلہ بہ مرحلہ کس طرح تیار ہوتی ہے، بے شمار عرقوں، سفوفوں، گولیوں اور کیپسولوں کی تیاری کے لیے کتنی مشینوں کی ضرورت ہوتی ہے، رواروی میں ہم نے اس کا جائزہ لیا، بعض باتیں دریافت بھی کیں یہ دیکھ کر بہرحال مسرت ہوئی کہ اب ہماری مسلم مملکتیں بھی سائنس اور ٹیکنالوجی کی کارفرمائیوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ میری کمزوری اور اضمحلال کو دیکھ کر ایک عراقی نوجوان محمد علی نے خوب سہارا دیا، ان کے سہارے سے کارخانے کی کئی منزلیں دیکھ سکا،

سامرّاہ (سام کا راستہ) ہے، مشہور ہے کہ اس مقام کے متعلق برکت کی روایتیں سن کر سفاح نے بھی یہاں شہر آباد کرنا چاہا تھا اور پھر منصور اور ہارون الرشید نے بھی، بالآخر قرعۂ فال ہارون الرشید کے بیٹے معتصم کے نام نکلا اور اس نے ۲۲۱ھ میں اس کو آباد کیا" (معجم البلدان ج ۵ ص ۳۸) پروگرام کے مطابق سب سے پہلے ہمارا قافلہ جامع متوکل باللہ العباسی کے لق ودق میدان میں پہونچا، اسی میدان میں جمعہ کی نماز کا انتظام کیا گیا تھا، جامع متوکل کا اس وقت کا نقشہ یہ ہے کہ ایک بہت وسیع میدان اونچی اونچی دیواروں سے گھرا ہوا ہے، یہ دیواریں بھی کافی قدیم معلوم ہو رہی تھیں، جمعہ کی نماز دیواروں سے گھرے ہوئے اسی میدان میں ہوئی، وفودِ موتمر کے علاوہ مقامی آبادی کا بھی ایک طبقہ نماز میں شریک ہوا، نماز جامعہ ازہر کے وکیل عام مولانا شیخ عبدالرحمٰن بیسار نے پڑھائی، شیخ کا خطبۂ جمعہ بھی زوردار اور اثر انگیز تھا، سنتوں سے فراغت کے بعد دیر تک ہم سب اس اجڑی ہوئی مسجد کے طول وعرض کو دیکھتے رہے، مولانا مفتی ضیاء الدین بابا خاں سے میں نے کہا "مولانا اب یہاں متوکل کے دور کی زمین کے علاوہ کوئی چیز باقی نہیں ہے"، مفتی صاحب نے عربی میں برجستہ جواب دیا "نہیں آسمان بھی اسی عہد کا ہے"، مفتی ضیاء الدین صاحب فارسی اور عربی کے علاوہ دوسری کوئی زبان نہیں سمجھتے، اردو بولنے والے صرف تین وفدوں کے ارکان تھے، ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش، افغانی ڈیلیگیشن کے رئیس الوفد مولانا عنایت اللہ ابلاغ بھی تھوڑی تھوڑی اردو بول لیتے تھے، کہتے تھے ایک زمانے میں اردو کی مشق تھی اب چھوٹ گئی ہے، باقی تمام ملکوں کے نمایندے صرف عربی میں گفتگو کرتے تھے، ۔ متوکل باللہ کے دور کی یہ مسجد جس کے زمین اور آسمان کی بات ہو رہی تھی، کبھی اپنی وسعت اور مضبوطی میں بے مثال سمجھی جاتی تھی "سرمن رائی" کی تعمیرات کے ساتھ اس مسجد کی تعمیر کی بھی تفصیل ملتی ہے عام تاریخوں میں ہے کہ حیرہ کے شروع ہی میں آبادی سے دور اور جاگیروں اور بازاروں سے الگ تھلگ ایک بہت بڑی عالیشان مسجد تعمیر کرائی گئی، جعفر متوکل نے یہ مسجد غایت درجہ مضبوط، مستحکم اور وسیع بنائی تھی، اس میں ایک پانی کا فوارہ تھا جس کا پانی کبھی بند نہ ہوتا تھا، وادیِ ابراہیم بن ریاح سے جو سڑک نکلتی تھی اس پر تین نہایت کشادہ اور بڑی بڑی سڑکیں تین جانب سے اس مسجد

مسجد اور مزار کاظمیہ کے قریب بلکہ ایک دوسرے سے لگے ہوئے ہیں، ہم لوگ پہلے قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد کے دفتر میں پہونچے منتظم صاحب نے ہمارا پرتپاک خیر مقدم کیا اور دیر تک باتیں کرتے رہے، متعدد اہم کتابیں بھی ہدیے میں دیں، وقت کی تنگی کا عذر کر کے ان سے اجازت چاہی اور مسجد و مزار کی زیارت کرانے کے لئے رہبر ساتھ لے لیا، ان دنوں مسجد اور اس سے ملحقہ عمارتوں کی توسیع و تجدید ہو رہی تھی، ہم نے مسجد کے ایک گوشے میں تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں پڑھیں اور مزار پر حاضر ہو گئے۔ بنگلہ دیش کا ڈیلیگیشن بھی ساتھ تھا، مرقدِ مبارک کی پائینتی دیر تک فاتحہ پڑھتے رہے، عجب طرح کا سکون محسوس ہوا پوری فضا نور سے بھری ہوئی معلوم ہوتی تھی، ان لمحات میں قدرتی طور پر امامِ والا مقام کے عظمت کے نقوش قلب پر مرتسم ہو گئے اور امامِ اعظم کے سایۂ عاطفت میں رہ کر انھوں نے امتِ مرحومہ کی جو لازوال خدمت کی ہے اس کی پرچھائیاں آنکھوں کے سامنے آنے لگیں، دیگر بے شمار کمالات کے علاوہ حضرت قاضی صاحب کی یہ خصوصیت بھی غیر معمولی ہے کہ آئمۂ جرح و تعدیل اور اساطین حدیث نے ان کو حُفاظِ حدیث میں شمار کیا ہے، امام ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے سب سے بڑے شاگرد اور فقہ حنفی کے اس مینارۂ نور کو محدثین کرام اس مرتبۂ عظمیٰ سے نوازدیں، یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے، اس ماحول میں وہ وصیت نامہ بھی یاد آ گیا جو خلیفہ ہارون الرشید کی حکومت کے چیف جسٹس، (قاضی القضاۃ) نے خلیفہ کی فرمائش پر تحریر فرمایا تھا، اس وصیت نامے اور تاریخی مکتوب کو پڑھ کر امام عالی مرتبت کی قدر و منزلت اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ ان کی وصیت و نصیحت کا انداز کس قدر بے لوث اور جرأت مندانہ ہے، موقع ملتا تو یہاں اس مکتوب اور وصیت نامے کے جستہ جستہ حصے تحریر کیے جاتے، مگر مجھے تو آگے بڑھنا ہے۔ امام دارالہجرۃ مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ کا وہ مکتوب بھی تاریخ کے سینے پر ثبت ہے جو امام عالی مقام نے ہارون الرشید کے نام تحریر فرمایا تھا اور جس میں عقیدہ و عمل کی تمام ہی بنیادیں اپنی زبردست اثر انگیزیوں کے ساتھ موجود ہیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ امام دارالہجرۃ حکومت کے رکن نہیں تھے، ان کے ارشادات اور نصائح کا رنگ ان کی شان کے مطابق ہونا ہی چاہیئے تھا،

خیال کرتا رہا ضعیفی بھی کیا نعمت ہے کہ نوجوانوں کو بوڑھوں کی خدمت پر آمادہ کرتی ہے، تیزگامی
کے باوجود وقت اندازے سے زیادہ لگ گیا اور اس وسیع وعریض کارخانے کے بہت سے
حصے دیکھنے سے رہ گئے، دوپہر کے کھانے کا انتظام محافظ بغداد کی طرف سے سامرّا ہی میں تھا
کارخانے کے معائنے کو ادھورا چھوڑ کر تمام مہمان بسوں سے طعام گاہ تک پہونچا دیے گئے، دعوت کا
انتظام ایک وسیع ہال میں کیا گیا تھا، کھانے سے پہلے نشستوں کا نظم بھی اعلیٰ درجے کا تھا،
نفیس قسم کے صوفا سیٹ بچھا دیے گئے تھے اور مشروبات طیبہ کا اہتمام بھی خوب تھا، لنچ اور اس
کے لوازمات سے چار بجے کے قریب فراغت ہوئی اور فوراً ہی بغداد کے لیے روانہ ہو گئے،
بسیں آرام دہ اور تیز رفتار تھیں، ۵½ بجے سے قبل ہی بغداد پہونچ گئے، قیام گاہ آکر معلوم ہوا
کہ ہندوستانی وفد کے ایک اور ممبر حیدر آباد کے مولانا سید محمد جلیب عمر حسینی بھی تشریف لے آئے ہیں،
مولانا اپنے کسی عزیز کی تلاش میں جو بغداد میں مقیم ہیں چلے گئے تھے، تھوڑی دیر کے بعد واپس آگئے"
مولانا سید جلیب، مرحوم مولانا سید بادشاہ حسینی کے صاحبزادے ہیں، مولانا سید بادشاہ حسینی کا شمار
مشائخ حیدر آباد میں ہوتا تھا، وعظ بھی خوب کہتے تھے، اور ان کی ارشاد وتلقین کی محفل بھی وسیع اور
بارونق تھی، مولانا سید جلیب ان کے نیک دل صاحبزادے ہیں اور اپنا حلقۂ اثر رکھتے ہیں،
"آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت" کے مقاصد اور پروگراموں میں بھی دلچسپی لیتے ہیں، ان کے آجانے
سے ایک شریف اور سادہ دل رفیق میسر آگیا اور ڈیلیگیشن کی ترکیب بھی ٹھیک ہو گئی، علاحدہ
کمرے کے بجائے مولانا کا قیام میرے ہی کمرے میں ہوا، موصوف سفر حج سے بمبئی واپس پہونچے
تو ان کو معلوم ہوا کہ بغداد کی علماء کانفرنس میں مدعو ہیں، کانفرنس شروع ہو چکی تھی اور وقت میں
گنجائش نہیں تھی اس لیے حیدر آباد کے بجائے سیدھے دہلی آگئے اور دہلی سے بغداد
پہونچ گئے۔

شنبہ کی صبح کا پروگرام یہ بنایا گیا کہ کانفرنس کے اجتماع سے قبل امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ کی
مسجد اور مزار پر ہو آئیں، اور کاظمین کی زیارت سے بھی فارغ ہو جائیں، قاضی ابو یوسف کی

التقریظ والانتقاد

چودھری رحم علی ہاشمی صاحب

تہذیب کی جدید تشکیل مصنف: مولانا محمد تقی امینی ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ
ناشر: ندوۃ المصنفین دہلی، سائز ۲۶ × ۲۰/۸، صفحات ۳۲۹، قیمت سولہ روپے

مولانا محمد تقی کی تحقیقی تخلیقات سے علمی دنیا کافی مانوس ہو چکی ہے اس لئے زیر نظر کتاب کے متعلق یہی کہنا کافی ہے کہ یہ مولانا کی جدید ترین تخلیق ہے جس میں حسب معمول دورِ حاضر کے مسائل کا تجزیہ کر کے قانون الٰہی کی روشنی میں ان کا موثر علاج تجویز کیا گیا ہے۔ اس وقت ساری دنیا جن پریشانیوں اور چپقلشوں اور اخلاقی، سماجی، معاشی دشواریوں میں مبتلا ہے اس کا ہر صاحب فہم کو اعتراف ہے لیکن بدقسمتی سے اس کا جو علاج تجویز کیا جاتا ہے وہ مرض کے ازالہ کے بجائے دوسرے زیادہ سنگین امراض پیدا کر دیتا ہے اس لئے کہ علاج کی بنیاد وہی معاشرہ ہے جو ان خرابیوں کا ذمہ دار ہے اور ربانی ہدایت اور قوانین الٰہی سے محروم ہونے کی وجہ سے معاشرہ کی خامیوں کا موثر علاج کرنے سے قاصر ہے۔ مولانا امینی نے یہ نظریہ قائم کر کے "موجودہ تہذیب یونان و روما کی دین" ہے اس کی تدریجی نشوونما پر نظر ڈالی ہے اور مشرقی اور مغربی مفکرین و محققین کے خیالات و افکار کی روشنی میں اس کا جائزہ لے کر یہ ثابت کیا ہے کہ موجودہ تہذیب ناقص ہونے کی وجہ سے اس پر جو تعمیر کی جاتی ہے وہ ناقص رہتی ہے اور صحیح حل دریافت کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ مولانا نے ہندوستان اور یورپ وغیرہ کے مفکرین کے نظریات کا محققانہ جائزہ

قاضی صاحب حکومت کے رکنِ رکین تھے اور حکومت بھی ایک مطلق العنان بادشاہ کی تھی لیکن وصیت نامے کے ایک ایک فقرے میں علم و تقویٰ، احقاقِ حق اور جرأت و بے خوفی کی شان جس طرح جھلک رہی ہے اس کا حقیقی اندازہ پورا وصیت نامہ پڑھ کر ہی ہوسکتا ہے، مجھے اس تاریخی وصیت نامے کے بہت سے حصے یاد ہیں یا ان کا خلاصہ ذہن میں ہے مگر یہ موقع امام صاحب کے سوانح حیات تحریر کرنے کا نہیں ہے، اس وقت جہاں اور بہت سی باتیں یاد آئیں امام صاحب کی عدیم النظیر اور مایۂ ناز تالیف "کتاب الخراج" کی خصوصیات خاص طور پر زیادہ یاد آئیں اور حضرت الاستاذ قدس سرہٗ کا یہ ارشاد بھی دماغ میں ابھرا کہ امالیِ ابی یوسف کی چالیس جلدیں جرمنی میں محفوظ ہیں۔

کانفرنس کا وقت قریب آرہا تھا اور ہمیں بغداد کے مشہور ترین مقام کاظمین کی زیارت سے بھی ابھی فارغ ہونا تھا، کاظمین جس کا دوسرا نام کاظمیہ ہے اپنے رنگ کی نہایت نفیس عمارت ہے، عمارت کی بُرجیاں، چوگوشے، گنبد، سب ہی شاندار ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سونے کا محل کھڑا ہے، یہ امام موسیٰ کاظم اور ان کے نامور پوتے محمد تقی الجواد کا مدفن و مرقد ہے، ان دونوں حضرات کا شمار اثنا عشری اماموں میں ہوتا ہے، یہ مقام خاص طور پر شیعہ حضرات کا مرکزِ عقیدت ہے، اس کے وسیع دالانوں میں ہر وقت سیکڑوں زائرین موجود رہتے ہیں اور سیکڑوں آتے جاتے رہتے ہیں، منّتیں مانگتے ہیں اور اپنے اپنے طریقے سے عبادت کرتے اور عقیدت و ارادت کا اظہار کرتے ہیں، ہم نے ان مزارات پر فاتحہ پڑھی اور چند منٹ تعمیر کی خوش نمائی، مضبوطی اور صنعت کاری کا جائزہ لیتے رہے، کلسوں، برجیوں، محرابوں اور گنبد کا بڑا حصہ زرِ خالص سے مطلّیٰ اور مرصّع ہے، آبِ طلا سے نہیں، سونے کی چادروں اور چوکوں سے، عمارت کا پورا ماحول اور در و بست آنکھوں کو خوب خوب دعوتِ نظارہ دیتا ہے، وقت بالکل نہیں رہا تھا ورنہ یہاں کے منتظمین سے ملاقات کرتے اور ضروری تاریخی معلومات حاصل کرتے۔

(باقی)

درجہ اوسط میں قوم کی ضروریات پوری ہوں اور دوسرے وہ کہ جس کے ذریعہ سے معاشی لحاظ سے قوم خودکفیل ہو اور پھر احادیث و روایات کے حوالہ سے اُن تدابیر کی تشریح کی ہے جن سے یہ مقاصد حاصل کئے گئے اور اب کس طرح حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ بحث کا یہ حصہ خاص طور پر اہم ہے جس کے لئے اصل کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ مختصر یہ کہ تنظیم مفید تر ہو اور نفع و نقصان کا مدار اخلاقی ہو جس کی بنیاد قرآن حکیم نے عدل و احسان پر رکھی ہے۔

اس کے بعد مولانا نے ذرائع پیداوار کی تقسیم کے مسئلہ کو لیا ہے اور اس سلسلہ میں اشتراکی اور سرمایہ داری نظام کی خامیوں کو واضح کرکے صحیح اور متوازن نظام کی تفصیلات اس طرح بتائی ہیں کہ بعض ذرائع پیداوار پر اجتماعی ملکیت ہوگی یعنی ان کا انتظام براہ راست حکومت کے ہاتھ میں ہوگا اور بعض پر بتدریج اجتماعی ملکیت ہوگی اور بعض پر خالص انفرادی ملکیت ہوگی۔ پہلی ضمن میں جن حرفتوں کو شامل کیا ہے ان میں فولاد اور مشین کی صنعتیں، اسلحہ جات، برقی پلانٹ، ایٹمی طاقت، کوئلہ کی کان، تارکول پٹرول اور گیس، جواہرات، سونا چاندی وغیرہ، ہوائی بحری اور ریلوے ٹرانسپورٹ، ٹیلی فون، ٹیلی گراف اور وائرلیس، کپڑوں کے مل اور بڑے کارخانے شامل ہیں۔ دوسری ضمن میں المونیم اور ٹین کی حرفت، چھوٹے اوزاروں کے کارخانے، کوئلہ کے کاربن بنانے کے کارخانے، رنگ سازی و پلاسٹک کی چیزیں، انگریزی دوائیں اور جراثیم کش دوائیں، روڈ ٹرانسپورٹ، سمنٹ، کاغذ اور چار کے باغات وغیرہ شامل کئے ہیں اور تیسری ضمن میں چھوٹے پیمانہ کی حرفتیں اور گھریلو حرفتیں رکھی ہیں جن کا انتظام نجی یا عوامی کمیٹیوں یا ضوابط کے ماتحت انفرادی اہتمام میں ہوگا۔ لیکن ہر صورت میں ملکیت کے صحیح تصور پر عمل ہوگا جس کے لیے تعلیم و تربیت پر زور دینا ضروری ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے اخلاقی فضا اور قانون و اخلاق میں ربط پیدا ہو ورنہ ایسے نفسیاتی و اجتماعی مسائل پیدا ہوں گے جن پر قابو پانا سخت مشکل ہو جائے گا۔

معاشی تنظیم کے بعد مولانا نے سیاسی تنظیم کے مسئلہ کو لیا ہے اور اس سلسلہ میں تمام مروجہ

لے کر ان کی خامیوں کی گرفت کی ہے اور ایک صحیح معاشرہ کی بنیاد کی رہنمائی کی ہے اور دکھایا ہے کہ
کہ انسانی فکر یا فلسفہ میں صحیح رہنمائی کی صلاحیت نہیں ہے اور انسان کی فلاح صرف مذہب کی
روحانی اور الہامی ہدایت سے ہوسکتی ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا نے تمام دنیا کی گذشتہ اور
موجودہ اصلاحی تحریکوں کی خامیاں دکھا کر ایک ایسے معاشرہ کا خاکہ پیش کیا ہے جو ان نقائص
سے پاک ہے اور جس میں موثر رہنمائی کی صلاحیت ہے۔ اس رہنمائی کی بنیادیں صرف اسلامی
نظام حیات میں مل سکتی ہیں اور مولانا نے تفصیل کے ساتھ اس نظام حیات کے مختلف شعبوں
کی تشریح کی ہے اور انسانی زندگی کے تمام مراحل پر ان کے موثر عمل کو دکھایا ہے سیکیولرزم
جمہوریت، بین الاقوامیت، انفرادیت، اجتماعیت اور مرکزیت کی اسلامی نقطہ نظر سے وضاحت
کی ہے اور اسلامی عدل و توازن کے قیام کی تدبیریں بتائی ہیں۔

جدید تہذیب کے بہت سے مسائل اور الجھنیں ہیں اور چونکہ مولانا نے حتی الامکان ان
سب پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے اس لئے کتاب میں بہت سے عنوانات ہو گئے ہیں،
ان سب پر تبصرہ کرنا تبصرہ کے حجم کو اصل کتاب کے حجم سے بھی زیادہ کر دے گا اس لئے صرف چند
مخصوص اہم عنوانات کی مختصراً تشریح کی جاتی ہے۔ چونکہ سب سے اہم مسئلہ حکومت اور محکوم کی
ذمہ داریوں کا ہے اس لیے مولانا نے اس پر سیر حاصل بحث کی ہے اور حکومت کی روٹی، کپڑے
مکان، علاج، تعلیم اور اہل و عیال کی کفالت کی ذمہ داری بتا کر دکھایا ہے کہ خلافت راشدہ اور
تابعین کی حکومت میں ان ذمہ داریوں کو کس طرح پورا کیا گیا تھا اور اسی سلسلہ میں حضرت عمر
رضی اللہ عنہ کا ایک قول نقل کر کے یہ دکھایا ہے کہ جب تک لوگ بقدر ضرورت اپنی ضروریات خود
پوری کرنے کے قابل نہ ہو جائیں اس وقت تک ان ضروریات کو پورا کرنا حکومت کے ذمہ
ہے تا آنکہ لوگ اپنے گھروں میں سیر ہو کر کھائیں پئیں۔ اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کبھی
کبھی لوگوں پر تنگی کرنے کی بھی ضرورت ہوگی تاکہ ضروری احتیاج کی چیزوں میں سب برابر ہو جائیں
چنانچہ جدید معاشی نظام میں حکومت کی دو قسم کی ذمہ داریاں بتائی ہیں ایک تو وہ جن سے

کبھی کبھی عمل کیا ہے۔ اس فرق کو واضح کرنے کی ضرورت تھی اگرچہ اور معاملات میں مولانا نے کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔ غرضکہ یہ کتاب مولانا کی دیگر تصنیفات کی طرح ایک گراں قدر تحقیقی کارنامہ ہے اور امید ہے کہ علمی اور عوامی حلقوں میں کافی مقبول ہوگی، خصوصاً اس لحاظ سے کہ مولانا نے انسانی زندگی کے تمام مسائل پر اسلامی نقطۂ نظر سے آج کل کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر روشنی ڈالی ہے اور مروجہ سماجی، معاشی، سیاسی اور دیگر نظریات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

سیاسی نظریات پر سیر حاصل بحث کر کے ان کی خامیاں دکھائی ہیں اور اشتراکیت وجمہوریت کی صحیح تصویر پیش کی ہے جس میں اقتدار اعلیٰ عوام کا نہیں بلکہ اللہ کا ہوگا اور اس کے لئے حکومت کی نوعیت میں جن تبدیلیوں کی ضرورت ہے ان کی وضاحت کی ہے اور روحانی اخلاقی اور جمالیاتی اقدار کی قرآن واحادیث کی روشنی میں تشریح کی اور معقولات ومنقولات سے ان کی اہمیت اور مناسبت کا تعین کیا ہے اور اس سلسلہ میں قانون کی دو قسمیں اصلی اور ذیلی بتائی ہیں اور ان کے نفاذ کی ضرورت اور موقعہ محل کی وضاحت کی ہے اور شہریت کے حقوق وفرائض بتائے ہیں اور یہ دکھایا ہے کہ ہر شخص کو جان ومال اور عزت وناموس کی حفاظت کا حق ہے اور ہر انسان واجب الاحترام ہے جس سے کسی کو دوسرے کی جان لینے کا حق نہیں ہے اور قرآن کے اسی فرمان کی توضیح کی ہے کہ جو کوئی ایک انسان کی جان لیتا ہے وہ ساری انسانیت کو قتل کرتا ہے اور جو کوئی ایک انسان کی جان بچاتا ہے وہ ساری انسانیت کو بچاتا ہے۔ تہذیب جدید کی تشکیل کے لئے کن انفرادی اور اجتماعی صفات کی ضرورت ہے ان پر مولانا نے سیر حاصل بحث کی ہے اور معقولات ومنقولات سے مستند دلائل پیش کئے ہیں۔ معاشرتی معاشی اور سیاسی نظام کیسا ہونا چاہئے اس پر بھی فلسفیانہ اصولی اور اسلامی روایات سے روشنی ڈالی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہر جگہ زمانہ حال کی ضروریات اور مقتضیات کا لحاظ رکھا ہے جو عام طور علماء کے مباحث میں کم ہوتا ہے اور وہی شخص ایسا کر سکتا ہے جسے مذہب کی روح اور فلسفیوں کے نظریات اور موجودہ زمانہ کے افکار وخیالات کی پوری بصیرت ہو۔

کتاب کے مضامین اور ابواب کی ترتیب وتقسیم میں ذرا زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی اور موجودہ جمہوریت اور اسلامی جمہوریت میں ایک بنیادی فرق ہے جس پر بظاہر مولانا کی نظر نہیں گئی۔ موجودہ جمہوریت میں اکثریت کی رائے خواہ اچھی ہو یا بری وہی قبول کی جاتی ہے مگر اسلامی جمہوریت کے کچھ اصول وقوانین ہیں اور اگر اقلیت کی رائے ان اصول وقوانین کے زیادہ مطابق ہو تو اسے اکثریت کی رائے پر ترجیح دی جاتی ہے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

عام فہم ہے، پھر اسی پر بس نہیں، بلکہ ہر صفحہ پر کثرت سے حواشی ہیں جو اگرچہ مختصر ہیں، حلِ لغات اور تشریح تلمیحات کے لئے کافی ووافی ہیں، شروع میں ایک مقدمہ ہے جو مستقل افادیت کا حامل ہے، اس میں مولانا روم کے حالات وسوانح، علمی اور عملی کمالات واوصاف کا تذکرہ کرنے کے بعد مثنوی کی خصوصیات اور اس میں علم کلام، فلسفہ اور تصوف کے جو بعض نہایت اہم مسائل، مثلاً وحدت الوجود، جبر وقدر اور وجود وعدم وغیرہ زیر بحث آ گئے ہیں ان کی بعض اور مصطلحاتِ تصوف کی مختصر مگر دلپذیر تشریح کی گئی ہے، تصوف کی عام کتابوں کی طرح مثنوی میں بھی صحیح غیر صحیح ہر قسم کی حدیثیں درج ہیں، مقدمہ میں اس طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے، البتہ شمس تبریز کی شخصیت اور ان کے خاندان کی نسبت جو کچھ لکھا ہے اُس کی حیثیت بازاری گپ سے زیادہ نہیں ہے، یورپ اور ایران میں اس پر بہت کچھ دادِ تحقیق دی جا چکی ہے، بہر حال کتاب بہت مفید، دلچسپ اور سبق آموز ہے، اس کا مطالعہ ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق ہوگا۔ فاضل مترجم لائق مبارکباد ہیں کہ مثنوی مولانا روم کا غلغلہ ہمارے معاشرہ میں مدھم ہو گیا تھا، اب ان کی کوشش سے اس نغمہ کی صدا پھر تیز ہو گئی ہے۔

دستور الافاضل تالیف حاجب خیرات دہلوی۔ تحقیق و ترتیب از پروفیسر نذیر احمد صاحب صدر شعبۂ فارسی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، تقطیع کلاں، ضخامت ۲۶۰ صفحات طباعت وٹائپ اور کاغذ سب اعلیٰ۔ مطبوعۂ انتشارات بنیاد فرہنگ ایران۔

یہ کتاب جس کا پورا نام "دستور الافاضل فی لغات الفضائل" ہے فارسی زبان کی قدیم ترین لغت ہے جو محمد بن تغلق شاہ کے عہد حکومت میں ۷۴۳ھ میں تمام ہوئی تھی، یہ اگرچہ مختصر ہے لیکن ایک تو اس کی بڑی اہمیت یہ ہے کہ فارسی زبان کے قدیم ترین جو چار کتب لغت ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی ہے اور دوسرے یہ کہ فارسی الفاظ میں مرورِ زمانہ سے جو تصحیف اور تغیر کا عمل ہوا ہے اس کتاب سے ان کی نشاندہی ہوتی ہے، اس لغت کا ساری دنیا

تبصرے

رسالہ برہان میں تبصرے کے لئے دینے والی ہر کتاب کے دو نسخے ارسال کریں کیونکہ کتاب کا ایک نسخہ ادارے کے فائل میں رکھا جاتا ہے۔

مثنوی مولانا روم (مترجم دفتر اول) از مولانا قاضی سجاد حسین صاحب صدر مدرس مدرسہ عالیہ فتحپوری، دہلی، تقطیع متوسط، ضخامت ۴۰۸ صفحات، کتابت و طباعت اور کاغذ سب اعلیٰ، گٹ اپ خوبصورت، قیمت مجلد -/۲۵ پتہ: سب رنگ کتاب گھر، دہلی - ۶

مولانا سجاد حسین صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں، علمی اور تعلیمی حلقوں میں فارسی کی امہات کتب کے کامیاب مترجم کی حیثیت سے اب وہ ایسے ہی مشہور ہیں جیسے ایک زمانہ میں انگریزی کتابوں کے معتبر و مستند مترجم کی حیثیت سے مولوی محمد عنایت اللہ مرحوم تھے، زیر تبصرہ کتاب مثنوی مولانا روم کے دفتر اول کا اردو ترجمہ ہے اور اس میں شک نہیں کہ اپنی چند در چند خصوصیات کے باعث فاضل مترجم کے سابقہ تراجم سے بہت آگے نکل گیا ہے اول تو مثنوی کا مطلب سمجھنا اور اس کی حقیقت کو پہونچنا آسان نہیں کیونکہ اس میں دنیا بھر کی تلمیحات، تشبیہات واستعارات اور اشارات وکنایات ہیں جن پر عبور حاصل کرنے کے لئے نہایت وسیع اور ہمہ گیر مطالعہ درکار ہے اور چونکہ مثنوی "ہست قرآں در زبانِ پہلوی" کے مصداق فارسی میں فصاحت وبلاغتِ بیان کا عجیب وغریب شاہکار ہے اس بنا پر سمجھنے کے بعد اس کو ترجمہ کے قالب میں ڈھال دینا سخت صبر آزما اور محنت طلب کام ہے، خوشی کی بات ہے کہ مولانا اس پورے مرحلے سے کامیاب وکامران گذرے ہیں، ترجمہ ٹو دی پوائنٹ، شگفتہ وسلیس اور

بن ماء السماء ہے جو حیرہ کا والی تھا۔ کتاب میں (ص ۲۵۳) النعمان المنذر لکھا ہوا ہے جو صحیح نہیں۔ ص ۲۷۸ پر شاعر کا نام مُبَرَّد نہیں، بلکہ مُبَرِّد بکسر الراء ہے، اگرچہ عام تلفظ بفتح الراء ہی ہے لیکن عربی زبان و ادب کے محققین جدید بکسر الراء بولتے ہیں۔

اسلامی ادبیات پر ایران کا اثر از عبدالستار صاحب فاروقی، تقطیع خورد، ضخامت ۱۸۴ صفحات، طباعت و کتابت معمولی، قیمت -/15
پتہ: شفاعت بکڈپو، حافظ مینشن مولوی گنج، لکھنؤ۔

عربوں پر ایک قدیم اور عام اعتراض ہے کہ سنٹرل ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا میں جب انھوں نے اپنا اقتدار قائم کیا تو ساسانی اور ایرانی تہذیب، تمدن اور ان کی تاریخ کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا، آتشکدے برباد کر دیے اور آتش پرستوں کو مجبور کیا کہ ترکِ وطن کر کے گجرات اور مہاراشٹر وغیرہ میں آباد ہوں، مولانا شبلی اس اعتراض کا محققانہ جواب دے چکے ہیں، لیکن بڑی خوشی کی بات ہے کہ روس کے مشہور مستشرق پروفیسر اسٹرانزو نے "اسلامی ادبیات پر ایران کا اثر" کے عنوان سے جو ایک کتاب لکھی ہے اور جو اگرچہ مختصر ہے مگر ٹھوس اور نہایت محققانہ ہے اُس سے عربوں پر اس الزام کی بڑی مدلل اور واضح تردید ہو جاتی ہے، اس کتاب میں تاریخی شواہد و دلائل کی روشنی میں ثابت کیا گیا ہے کہ عربوں نے ساسانیوں کے علمی اور ثقافتی آثار کو نہ صرف یہ کہ مٹایا نہیں بلکہ ان کی حفاظت کی، اس دور کی زبان پہلوی میں لکھی ہوئی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرایا، اس مقصد کے لئے دارالترجمہ قائم کیا گیا اور ایرانی نژاد مترجموں کو بیش قرار تنخواہوں پر مقرر کیا گیا۔ اس طرح یہ سب کتابیں اسلامی معاشرہ میں پھیل گئیں، عرب مصنفین نے ان کا تذکرہ کیا ہے اور ان کے ادبی، اخلاقی اور تہذیبی و تمدنی اثرات اس عہد کے عربی لٹریچر میں صاف

میں صرف ایک ہی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال (کلکتہ) میں محفوظ تھا ،
پروفیسر نذیر احمد صاحب جو علم و تحقیق کے مشہور اور مسلم کوہکن ہیں انھوں نے
اس نسخہ کا پتہ چلایا اپنے معمول کے مطابق اسے اڈٹ کر کے ایران سے
شائع کیا ہے ، کتاب کے ہر صفحہ پر کثرت سے حواشی ہیں جن میں
دستور الافاضل میں کسی لفظ کے تلفظ یا اس کے بیان کردہ معنی اور اس کی
تشریح کا مقابلہ و موازنہ فارسی کی دوسری فرہنگوں سے کیا گیا ہے ، یا اس
میں کوئی غلطی ہے تو اس کی نشاندہی کی گئی ہے ، شروع میں نہایت
فاضلانہ اور محققانہ مقدمہ ہے جس میں حاجب خیرات دہلوی مصنف
کتاب کے حالات و سوانح پر داخلی اور خارجی شواہد کی روشنی میں کلام
کرنے کے بعد کتاب کی اہمیت ، کتب لغت قدیم میں اس کا مرتبہ و مقام
اور اس کی خصوصیات اور ساتھ ہی اس کے بعض نقائص پر مبسوط و مفصل
گفتگو کی گئی ہے جس کی قدر و منزلت کا اندازہ اس کے دیکھنے کے بعد
ہی ہو سکتا ہے ، موصوف کی یہ کاوش و کوشش فارسی ادبیات کے
ہر محقق اور عالم کے شکریہ کی مستحق ہے ، مگر بعض الفاظ کے معنی میں ہمیں
شک ہے ۔ مثلاً یل کے معنی مرد غازی لکھے ہیں ، حالانکہ غازی ایک خاص
اصطلاح ہے ، اس کے معنی مرد شجاع یا پہلوان ہونا چاہئے ، اسی
طرح یثرب کو زمین مکہ کہنا درست نہیں ، یہ مدینہ کا قدیم نام ہے ،
حدیث میں ہے "او ھنتھم حمی یثرب" اسی طرح یحموم عربی کا لفظ ہے
قرآن مجید کی سورۃ الواقعہ میں یہ لفظ آیا ہے ، اس کے معنی دود سیاہ
ہیں ۔ جیسا کہ حاشیہ میں ہے ، معلوم نہیں "بانگ اسپ" کیسے لکھدیا ،
اس کے لئے لفظ صہیل آتا ہے ، پھر نعمان کا صحیح نام نعمان بن منذر

۱۹۵۴ء — حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ العلم والعلماء۔ اسلام کا نظام عفت و عصمت۔
تاریخ صقلیہ، تاریخ ملت جلد نہم

۱۹۵۵ء — اسلام کا زرعی نظام، تاریخ ادبیات ایران، تاریخ علم فقہ، تاریخ ملت حصہ دہم سلاطین ہند اول
تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی

۱۹۵۶ء — ترجمان السنہ جلد ثالث۔ اسلام کا نظام حکومت (طبع جدید) مع ترتیب جدید بین الاقوامی
سیاسی معلومات جلد دوم۔ خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات

۱۹۵۷ء — لغات القرآن جلد پنجم۔ صدیق اکبرؓ۔ تاریخ ملت حصہ یازدہم سلاطین ہند۔ [illegible] بعد

۱۹۵۸ء — لغات القرآن جلد ششم۔ [illegible] تاریخ [illegible] سیاسی معلومات جلد سوم

۱۹۵۹ء — حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط۔ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء۔ بصائر و عبر و کونین۔

۱۹۶۰ء — تفسیر مظہری اردو پارہ ۲۹-۳۰۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سرکاری خطوط
امام رازی کا فلسفۂ مذہب و اخلاق۔ عروج و زوال کا الٰہی نظام۔

۱۹۶۱ء — تفسیر مظہری اردو جلد اول۔ مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط۔ اسلامی کتب خانے عرب دنیا۔
تاریخ سندھ عربی دور

۱۹۶۲ء — تفسیر مظہری اردو جلد دوم۔ اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں معارف الآثار۔
نیل سے فرات تک

۱۹۶۳ء — تفسیر مظہری اردو جلد سوم۔ تاریخ ردہ میرکشی ضلع بجنور۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی اول

۱۹۶۴ء — تفسیر مظہری اردو جلد چہارم حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط عرب و ہند عہد رسالت میں۔
ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں۔

۱۹۶۵ء — ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اول۔ تاریخی مقالات
لاندہبی دور کا تاریخی پس منظر۔ ایشیا میں آخری نوآبادیات

۱۹۶۶ء — تفسیر مظہری اردو جلد پنجم۔ رموز عشق۔ خواجہ بندہ نواز کا تصوف و سلوک۔
ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں۔

۱۹۶۷ء — ترجمان السنہ جلد چہارم تفسیر مظہری اردو جلد ششم حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کی فقہ

۱۹۶۸ء — تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم تین تذکرے شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات
اسلامی ہند کی عظمت رفتہ۔

۱۹۶۹ء — تفسیر مظہری اردو جلد ہشتم۔ تاریخ الفخری۔ حیات ذاکر حسین۔ دین الٰہی اور اس کا پس منظر

۱۹۷۰ء — حیات عبدالحئی۔ تفسیر مظہری اردو جلد نہم۔ مآثر و معارف۔ احکام شرعیہ میں حالات زمانہ کی رعایت۔

۱۹۷۱ء — تفسیر مظہری اردو جلد دہم بیماری اور اس کا روحانی علاج۔ خلافت راشدہ اور ہندوستان

۱۹۷۲ء — فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر۔ انتخاب الترغیب والترہیب۔ اخبار التنزیل
عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان

نظر آتے ہیں، روسی مستشرق کی یہ کتاب روسی زبان میں تھی، اس کا ترجمہ انگریزی زبان میں مع ایک مقدمہ اور ضمیمہ جات کے مشہور پارسی فاضل مسٹر جی کے نریمان نے کیا اور انگریزی سے اس کتاب کا ترجمہ اردو میں مع ایک مقدمہ اور تعلیقات کے عبدالستار صاحب فاروقی نے کیا، یہ ترجمہ سلیس اور شگفتہ و رواں ہے۔ اگرچہ بعض جگہ مترجم الفاظ کھا گئے ہیں، مقدمہ خاصا طویل اور موضوع بحث سے متعلق مفید معلومات پر مشتمل ہے۔ امید ہے ارباب ذوق اس کے مطالعہ سے شادکام ہوں گے۔